

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مرآة الغالب شرح دیوان غالب

حضرت غالب کے اردو دیوان کی مکمل شرح



از: جناب سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim Awan

الحمد لله

مرآة العالَم

حضرت غائب علیہ الرحمۃ کے اردو دیوان کی مکمل

تفصیل و تہذیب
شرح و تفسیر

فہرست آغا محمد طاہر فرحت آزاد
ملک زاد بک پور کوچیلان

(مطبوعہ نجوایہ لطیف دہلی)

قیمت مجلد چھلانے

قیمت غیر مجلد

تھوڑا لچیل

دیر پا چہ

جب زمانے نے حضرت ذوق و سوسن سے مسند سخن کو غالی پایا اور نظم کا چراغ گل ہونے لگا تو آسمانی برکتوں کو آخر بار بعد التجا بدیا اور عروس سخن کو باسوار کر فارسی کے ملک الشعراء مرزا نوشہ کے سامنے لا بیٹھایا۔ خدا کی قدرت ہے کل تک جس کا کلام "گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل" تھا، آج اُس کے سامنے زبان بھی سرخوں ہے۔ محاورہ بھی ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ وہ ایچ بیج کی خیر فوس تکیں بھی ابھی ابھی کچھ کر سیکھ گئی ہیں جس کیلئے خود اپنا اُردو کلام باعث تنگ تھا آج باعث فخر ہے۔

حقیقت بھی یوں ہے کہ دہلی کا وہ زمانہ جس میں یہ حضرات جلوہ افروز ہوئے اب تھے نظم کی دنیا میں بہترین زمانہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ تیر و سوزا نے جو پیوند لگائے تھے اُن پودوں میں اب پھل آرہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص بذات خود ایک انجمن و مشاعرہ تھا۔ ہر ایک کی زبان فرنگ آصفیہ کی کان تھی۔ دہلی کی آخری ادبی بہار کے افسانہ میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جن کا نظیر ہم اب تک پیدا نہیں کر سکے، نہ اُمید ہے کہ نظم کی کان سے ایسے لعل بے بہا دوبارہ پیدا ہوں گے۔

اللہ اکبر۔ دہلی نے ایک وہ وقت دیکھا ہے جبکہ تاج ملک اشعرائی حضرت

ذوق کے سر پر چمکتا تھا اور زبان کی صفائی اور محاورہ کی پستی انتہا کو پہنچائی جا رہی تھی۔
 وافر حسن آفرینی کی اقلیم پر سکیم مومن خاں صاحب مومن کی حکومت تھی جن کی
 نازک مزاجیاں شیشے سے پتھر کو توڑ رہی تھیں۔ عروس سخن کے دولہا حضرت طنز
 تھے کہ ہر آئین سخن آرائی پر ایک نیا رنگ اور حاشیہ چڑھا رہے تھے۔

مرزا اسد اللہ خان صاحب غالب اگرچہ فارسی میں ظہوری اور نظیری سے
 اونچے اُڑتے تھے اور ریختہ اُن کی آنکھوں میں گرو سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا
 مگر اساتذہ کی بلند پروازیاں۔ احباب کی فرمائشیں۔ زمانے کی رفتار۔ ان کو بھی
 اس انجمن میں لئے چلی آتی تھی۔ ان کے علاوہ تھنی صدر الدین خان صاحب زردہ
 حکیم آغا جان غیش۔ غلام علی خان صاحب وحشت۔ نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفہ
 نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب نیر۔ حافظ غلام رسول ویران۔ حافظ غلام رسول
 صاحب شوق۔ حضرت حلیمہ حضرت انور۔ حضرت مجروح۔ حضرت زین الدین صاحب
 عارف۔ حضرت معین۔ حضرت بشیر۔ حضرت ذائع۔ حضرت سالک۔ مولوی عبد الرحیم
 صاحب سوز۔ مرزا قادر بخش صاحب صابر۔ میاں خورشید۔ میاں تشد تھے
 اور ان کے بعد سا۔ اشہد ایک برات تھی جو رات دن اُردو نظم کے بیاہ بچاتی تھی۔
 اور نئے سے نیا گل کھلاؤ تھی اور زبان بجائے ریختہ اور ریختی کے زبان اُردو کھلانے لگی تھی۔
 انوس جب اُن میں سے بہت سے چراغ بج گئے تو اُردو بے سر پرست کے رگبی
 قدرت کی نظر انتخاب اُس شخص پر پڑی جس کو اس زبان میں شعر کہتے اور پڑھتے بھی
 عار تھا۔ مگر آفرین ہے اس ایسٹو سخن پر جس وقت یہ وجہ اُس کی گردن پر رکھا گیا تو اس طرح
 سنبھال گیا اُن کا اپنا تھا۔ اُن کی ذاتی دولت تھی جو واپس آگئی۔ اس تغیر کو اگر
 معجزہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اگر مرزا کے کلام کو تقسیم کیا جائے اور اندر سے کچھ دنوں
 پہلے کا کلام الگ کر لیا جائے تو اُس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا اُردو میں شعر کہتے

ہیں یا فارسی میں۔ آج جو ہم ان کے محضر شعر ار کے طعن آمیز اشعار مرزا کی نسبت منکر چونک اٹھتے ہیں اُس کی حقیقت اُس وقت معلوم ہو۔ مگر جب اُردو کی ملک الشعرائی اور سرپرستی خود اُنہی کے سر پر رکھی گئی تو آنکھیں کھل گئیں۔ اُس وقت زبان میں تغیر پیدا ہوا۔ تیردزدوں کی زبان اشعار میں نظر آنے لگی یعنی آفرین جو مومن خان صاحب کے قابو سے بھی نکل جایا کرتی تھی اب صاف محاورہ میں کہپ گئی اور شاعرانہ فلسفہ اُردو میں تکمیل کو پہنچا۔

غدر کے کچھ دنوں بعد جب مرزا کی شاعری نے اپنا پورا اسکند لوگوں کے دلوں پر بٹھالیا اور شیرینی زبان لطف سخن نے ہر طرف مرزا کا ڈنکا بجایا اور مرزا کے اُردو کلام کی بھی مانگ شروع ہوئی تو مرزا کے احباب نے اُردو دیوان چھپوانے کا قصد کیا۔ مگر سارا دیوان چھپواتا بہت خطرناک تھا۔ لہذا انتخاب کیا گیا اور یہ سترہ سو اشعار کا انتخابی گلدستہ کٹ چھٹ کر سرور سہی بنکر نکلا اور سارے ہندوستان میں سپردیدگی سے دیکھا گیا۔

مگر وہ زمانہ ایسا انقلاب خیز تھا کہ اچھے اچھے نفقش مٹ گئے۔ فارسی جس نے ہندوستان میں آکر سب پر پُرزے درست کئے تھے مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ تناہو گئی۔ اُردو بچہ زبان۔ بازاری زبان۔ اس میں فلسفہ حکمت۔ اخلاق عشق کے انتہائی جذبات کہاں۔ کیونکہ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے عام لوگ جن میں یہ باتیں مفقود۔ تو مرزا کا دیوان اپنی خصوصیات کی وجہ سے نہیں بلکہ شیرینی زبان اور اندازِ بیاں کی وجہ سے پھیلا اور زندہ رہا۔

اس زمانہ میں دو قسم کے لوگ مرزا کے اُردو دیوان کو پڑھتے تھے۔ اول وہ طبقہ جو مرزا کی فارسی شان سے آشنا تھا اور ہر طرح مرزا کی باتوں اور نکتوں کا عاشق تھا۔ دوسرے عام اُردو غزلخواں حضرات جو مرزا کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر۔ شکل پسند

شاعر۔ غزل گو شاعر مہر نے کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ آخر پہلا طبقہ تھا ہو گیا۔ دوسرے طبقہ نے زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلائے اور پڑھنے کے ساتھ سمجھنے کی بھی کوشش کی۔ جس کے لئے عام طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ جو مرزا کے کلام کا شائق ہوتا وہ پتہ لگاتا کہ اس وقت مرزا کے کلام کا مفسر کون ہے اس سے پڑھتا اور دوسروں کو بھی پڑھاتا۔ مگر جب تعلیم کے چرچے عام ہوئے اور ان چیزوں کی طرف ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ بڑھنے لگے تو اُس وقت بعض حضرات نے شرح کی ضرورت سمجھی اور لکھی بھی گئیں جنہیں سے مشہور جناب ذاب حیدر یا رنگ طباطبائی کی ہے۔ وہ ہماری خوش قسمتی کی وجہ سے ہم میں موجود ہیں۔ ورنہ وہ تو طبقہ اعلیٰ کے انسان ہیں۔ لہذا نئی روشنی کے خیالات کا انہوں نے بہت کم خیال رکھا، اور اکثر اجتہاد سے کام لیا۔ دوسری جناب شوکت میرٹھی نے شرح لکھی۔ مگر وہ شاید دو صدی پیچھے کے شاعر تھے خدا جانے کیا کیا لکھ گئے۔ اُن کی شرح خود اپنی ایک شرح چاہتی ہے۔

مولانا حالی نے یادگار میں اکثر اشعار کو اس طرح بیان کیا جس طرح حق تھا۔ مگر کئی شرح نہیں ہے۔ شاعری پر ریوڑ کرتے کرتے لکھ دیے ہیں۔ بعد میں منتِ نوت کی شان سے جناب نظامی بدایونی حضرت حسرت موہانی حضرت مسلمان نے شرحیں نکالیں جنہوں نے بہت کچھ آسانی اور سہولت ہم پہنچائی اور اشتیاق کے جذبہ میں آگ لگائی اور ہر طرف غالب ہی غالب آوازیں آنے لگیں۔

گزشتہ سال مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو ایک جگہ حضرت غالب کا ذکر ہوا تھا اور اشعار پر بحث تھی۔ احباب اُس کے مختلف معنی بیان کر رہے تھے۔ بعض جگہ دہلی کے خاص محاورے پر تذکرہ تھا۔ اکثر مردِ شہر سے مندرساتے تھے۔ ایک صاحب جناب بخود صاحب کی طرف اپنے منوں کو منسوب کرتے تھے جو قرنِ قیاس اوتھیں تھے۔ اُس دن سے مجھے خیال آیا کہ مرزا غالب دہلی کی جان۔ اُنہوں کی جان

پھر اب تک کسی دہلی والے نے شرح نہیں لکھی۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہر رہبر و رہبریت پیدا ہو جائیگی۔ اس کا تذکرہ کئی جگہ کیا گیا۔ اکثر اصحاب نے جناب حاجی سید جلیل الدین صاحب بیجو و جانشین حضرت داغ کا نام تجویز کیا اور کہا کہ اس وقت مرزا کے دیوان کے مفسر ہیں۔ شاید ان کے بعد دہلی میں ایسا آدمی میسر نہ آئے۔

اس خیال کے آتے ہی میں آغا حیدر حسن صاحب قلم شاگرد رشید جناب بیجو و صاحب کو ساتھ لیکر پہنچا اور اپنا اشارہ ظاہر کیا۔ حضرت بیجو و کی حالت یہ ہے کہ دلی انگریزی حکومت کی ناز آفرینیوں کی جولانگاہ ہے۔ مگر اردو کے حق میں صحرا ہو گئی ہے تو اسی اُجڑی بستی میں حضرت بیجو و سجادہ ادب بچاؤ و نجات کے گوشہ میں درس و تدریس کے سلسلے سے قیام رکھتے ہیں۔ ہاتھوں میں قلم و رخشہ ہے کہ اپنا نام دونوں ہاتھوں سے قلم تمام کر مشکل تحریر فراتے ہیں۔ انہوں نے ہر چند ان باتوں کا عذر فرمایا مگر میں نے اور اُن کے حلقہ تلامذہ نے اُن کو منالیا۔ اور ایک کاتب ملازم رکھ کر یہ شرح لکھنی شروع کر دی۔

اس شرح کی اشاعت کے لئے سب سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ دوسرا حضرت بیجو و صاحب کا شکریہ۔ مگر وہ میں کیا ادا کر سکتا ہوں اہل زبان۔ اہل ملک ادا کریں۔ میں تو خود ہمیشہ فخر کیا کروں گا کہ میری ناچیز کوشش سے یہ گرانمایا چیز تیار ہو گئی۔ اس کے ابتدا میں حضرت بیجو و صاحب کا وعدہ تھا کہ مرزا باکی اُردو شاعری پر ایک مقدمہ لکھوں گا مگر شاعرانہ نازک مزاجی نے اُردو دانوں کو اس سے محروم کر دیا۔ شاید آئندہ کرم کی نگاہ ہو جائے تو تحریر فرمادیں۔

مرزا کے اُردو کلام پر مقدمہ لکھنا میرا کام نہیں۔ نہ شاعرانہ حیثیت۔ نہ فلسفیانہ شان سے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں بہت بڑی ہیں۔ حضرت بیجو و نے شرح کو عام فہم بنانے کی جس قدر کوشش کی ہے، اگر مقدمہ بھی ساتھ لکھتا ہوں

فرادیتے تو است کچھ امداد ملتی۔

حضرت شیخ و صاحب کی شرح زاد و تراجمی خیال سے چھپوائی گئی ہے کہ
شاعرانہ ترانہ ہیں۔ زبان کے نکتے۔ دلی دالوں کا خاص طرزِ ادا عشقیہ جذبات
سب عام انہم ہو جائیں۔ اور کوئی بات سوائے یورپین فلسفہ کے باقی نہ رہے
سو وہ مریدان ابھی بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن مرحوم نے بھی ابتدا کی
ہے۔ ضابطہ سے ایک میں ایسے ہونا پیدا کرے کہ اس کی فلسفیانہ شریں لکھیں
اور اس پورے سے دیوان کو آسمانِ ادب پر پہنچا دیں۔

یہ شریں انشا۔ اللہ ہر مجدار اور فری جس انسان کو اس کے تخیل میں بند پڑ جائے
کرنا سکھائے گی۔ درغالب کے سمجھنے کے علاوہ وہ اپنے آپ کو بھی سمجھنے کے قابل
ہو جائے گا۔ انشا اللہ +

دُعا کا محتاج

طاہر نبیرہ حضرت آزاد

۱۲ رجب ۱۳۹۲ھ

بہارِ کنزِ السرائر کنزِ السرائر

نفس

نفس فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیر میں ہر پیکر تصویر کا مطلب یہ ہے کہ ہستی موجبِ ملال و آزار ہے بہ سببِ ناپائیدار اور فانی ہونے کے بشرطِ یہ ہے کہ نفسِ عالم یعنی موجوداتِ عالم فریادی ہے تقاضِ ازل کی شوخی تحریر کا (فریادی کا لباسِ قدیم دستورِ ایران کے موافق کاغذ کا ہوا کرتا تھا جس طرح ہندوستان میں فریاد کرنے والے دن کو مشعل جلا کر لاتے تھے یا عرب میں مقتول کا لباس پر چھپے پر کھڑکھڑا صلیب لٹکے جاتے تھے) شوخی کے معنی ہیں قیام پذیر نہ ہونا ثابت ہے تصویر کے کاغذی پیر میں ہونے سے یعنی عام دستور یہی ہے کہ تصویر کاغذ پر کھینچی جاتی ہے اور کاغذ جلد بگڑ جاتے والی چیز ہے۔ ہر پیکر تصویر سے مراد جملہ حیوانات و جمادات نباتات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فانی ہونے والی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ پھول دن بھر میں گھٹا جاتا ہے۔ انسان کی موت کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ لکڑی۔ پتھر۔ دھات کی بنی ہوئی اشیاء بھی انجام کار بیکار اور تسکستہ ہو جاتی ہیں۔ جب موجوداتِ عالم کا یہ حال ہو تو نفسِ ہستی کا اپنی ناپائیداری اور بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیلِ بلند اور غیر معمولی قدرت کا ثبوتِ قائل ہے۔ میری رائے میں شعر معنی خیز اور خیال ایک چھوٹا خیال ہے۔ اس شعر کو بے معنی کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

کاؤ کاؤ سخت جاں نہاں تہ نہاں نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا کاؤ کاؤ کے معنی کاؤش اور کاہش کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں فریاد کے واسطے حسبِ ہر شے شیریں جوئے شیر کا لانا اس قدر دشوار و مشکل نہ تھا جس قدر ایک عاشق و مل طلبِ نصیب کیلئے شبِ فراق کا سحر کرنا اور وہ بھی سخت جانی کی حالت میں یعنی سخت جانی نے مرثیہ کی امید بھی قطع کر دی ہے۔ فریاد کے واسطے کوہِ بے ستوں کا گانا ایک مشکل تہائی تھا۔ ناشتہ کو تہائی کی رات کا گانا ایک عمدہ خیال گسل ہے۔

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
 دم شمشیر آبداری شمشیر کو کہتے ہیں اور آب ہمیشہ بارش کے باہر کے حصہ پر جو اُترتی ہے، عاشق
 اب شمشیر کا سینہ شمشیر سے باہر ہونا اپنے جذبہ بے اختیار شوق کی دلیل بتاتا ہے اور دعویٰ
 متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ شعر کے آثار ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

آگنی دم شمعین چاہے کھائے مدعا غما ہے اپنے عالم تقریر کا
 آگنی کے معنی اطلاع یا بی اور خبر داری کے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ سانس کی اشارت فنی کا شوق
 صیاد بن کر جس قدر چاہے قریب کے جال بچھائے مگر یہ ہے اشار کا مطلب ظاہر غما صفت
 ہے جو کسی کے زام قریب میں چھپتا ہوا معلوم نہیں ہوتا یعنی میرا کلام سراسر سرائیکی ہے
 عام فہم نہیں ہے جو ہر کس و نا کس سمجھ سکے۔ چنانچہ مرزا صاحب اُردو کے ایک خط میں تحریر
 فرماتے ہیں "شعر گوئی مضمون نگاری کا نام ہے قافیہ پیمائی کو شعر گوئی نہیں کہتے۔"

بسکہ ہوش غالب ہیری میں بھی آتش بربا موئے آتش دیدہ ہے حلقہ عمری بخیر کا
 آتش زیدہ یا بقیار اور مضطرب ہونے کا استعارہ ہے حلقہ زنجیر کا گرمی وحشت سے موئے آتش دیدہ
 بن جانا جارا ہے کہ آئے بخیر زنجیر نہیں رہی ہے یعنی مجھ کو قید کرنے کیلئے زنجیر کا فی نہیں ہے۔
 قاعدہ ہے۔ بال کہ جب آگ پر رکھا جاتا ہے تو وہ آگ کی گرمی سے مڑ جاتا حلقہ کی شکل پیدا
 کر لیتا ہے۔ اور بودا ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں حلقہ زنجیر میری گرمی وحشت کے
 مقابلہ میں موئے مجاہد سے زیادہ ناپائدار ہے۔ زنجیر کی کڑیوں کو موئے آتش دیدہ شکستہ
 دینی نئی طرح کی جدت ہے۔

جز قیس کوئی نہ آیا مجھے کا۔ صحرا مگر یہ سنگی چشم سو دھتا
 فرماتے ہیں قیس کے سوا مرد میدان عشق زمانہ میں پیدا نہ ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ
 صحرا چشم جامد کی طرح تنگ تھا جس میں گنجائش ہی کسی دوسرے عاشق کی نہ تھی مطلب
 شعر کا یہ ہے قبیلہ عامر میں سے پھر کوئی قیس جیسا عاشق کامل پیدا نہ ہوا جو دشت نجد کو آباد کرتا۔

آشفگی نے نقش سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سہریہ دودھ تھا

آشفگی پریشاں حالی اور پریشاں خیالی سویدا سودا کی تصخیر دل پر ایک کالا دھبہ ہوا کرتا ہے
مرزا صاحب فرماتے ہیں میرے دل پر جو نقش سویدا ہے وہ میری آشفۃ حالی کا پیدا کیا ہوا ہے
یعنی میں نے جو پریشاں حالی میں فٹائے رائے کے خوف سے دھواں دھارا آپس بڑھشت کی برائے
سے میرے دل پر یہ داغ پڑ گیا ہے چنانچہ دھوئیں سے یہ داغ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اس
سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ داغ کی پوچھی دھواں بھی

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی زیاں تھانہ دودھ تھا

مطلب یہ ہے جن آلام ہجر، صدمات، رشک، خوابشات و صل میں عہد شباب گزرا ہے۔ اور
جو صل اور ملاقاتوں کے مزے ٹوٹے ہیں وہ سب دلوں اور جوش کا زمانہ گزر جانے کے بعد
ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی انسان یہ سب باتیں خواب میں دیکھتا ہوا اور آنکھ کھل جانے پر
ان باتوں کے اثر و فائدہ اور نقائص فوراً طبیعت سے زائل ہو جائیں۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق منور لیکن ہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مکتب غم دل بالکل نیا اور اچھوتا استعارہ ہے۔ فرماتے ہیں دل کھوئے ہوئے مجھ کو ایک زمانہ
گزر چکا ہے۔ مگر ابھی غم دل کے مکتب میں ہی سبق لے رہا ہوں کہ رفت گیا اور بود تھا۔
یعنی دل کے جانے کا بھی افسوس ہے اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ دل کبھی میرے پہلو میں بھی تھا مگر یہ یاد
نہیں آتا کہ دل کب کھو یا اور کیونکر کھو یا۔ بے فیزیعی عشق کی تصویر اس سے بہتر لفظوں میں نہیں
کھینچ سکتی اس پر طرہ بخودی کی آمیزش۔

دھانپا کفن نے داغ عیوب پر ہسلی میں نہ ہر لباس میں تنگ بود تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں جیسا میں صل میں تھا اور جیسا مجھ کو ہونا چاہیے تھا ایسا کسی لباس میں بھی
ظاہر نہ ہو سکا۔ انجام کار کفن نے میرا داغ عیوب پر ہسلی چھپا لیا اور نہ میں ہر لباس میں معنی صلیت
کو دھبہ لگانے والا قرار پاتا رہا۔ ہر لباس سے مراد یہاں مختلف زمانے اور مختلف اوضاع سے ہے

یعنی میں وہی نوہوں جس کو ملائکہ نے سجدہ کیا تھا، دنیا میں آنے کے بعد میری وہ وقعت - وہ عزت میرے اعمال و افعال کی وجہ سے باقی نہ رہی۔ لڑکپن کی بے تمیزیاں جوانی کی بے اعتدالیاں نفس پرستیاں پیری کی ہونٹ کیاں میرے جائزہ تحقیق کو دھتہ ہی لگاتی رہیں البتہ مرتبانے کے بعد کفن نے ان داغوں کو چھپایا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہن، سدا سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا
فراتے ہیں بغیر تیشہ کے کوہن شیریں کے عشق میں جان نہ دے سکا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ محبت کا نشہ اُس حد تک نہ پہنچا تھا کہ فریاد بغیر سبب قتل کے قتل ہو جاتا، جی شیریں کا مرنا سن کر ایک ہلکینہی ارجحان سے گزر جاتا۔ مگر یہ نہ کر سکا۔ اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ رسوم و قیود کا پائہ تھا۔ اس کو یوں بیان کیا ہے کہ ”سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا، خمار نشہ کے آثار کی حالت کو کہتے ہیں اور قیود قید کی جمع ہے۔ یہاں قید یعنی پابندی رسم استعمال ہوا ہے۔

کہتے ہونے دینگے ہم - دل گر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
مستحق کا یہ کٹ سن کر کہ تھار دل جو گم ہو گیا ہے اگر ہم کو کہیں گرا پڑا مل گیا تو ہم تم کو دیا
نہ دینگے مرزا صاحب جو ب میں فراتے ہیں - دل ہا سے اس ہے کہاں جو ہم کھوئینگے - اس یہ بات سن کر ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے ہیں۔ یعنی ہمارا دل آپ ہی نے چڑایا ہے۔ اب الزام سے بری ہونے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہمیں مل گیا تو ہم نہ دینگے۔

عشق سے طبیعت نے ریت کا مڑا پایا درو کی دوا پائی درو لا دوا پایا
فراتے ہیں۔ زندگی کا لطف طبیعت نے عشق سے پایا ہے یعنی بے عشق زندگی گزارنا ایک درو لا دوا تھی۔ اس کی دوا مل گئی مگر درو عشق لا دوا ہے۔ اس کی دوا دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے ”درو کی دوا پائی درو لا دوا پایا“ یہ اسلوب بیاں مرزا صاحب کے سوا مبدع، فیاض سے کس کو عطا ہوا ہے۔

دوستدار دشمن ہے عہدا دول معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ مار سا پایا

دوستدار دشمن یعنی دشمن کا دوست۔ دشمن سے مراد یہاں مشوق سے ہے۔ فرماتے ہیں وہ ہمارا دشمن ہے اور دل اُس کا دوست ہے اب ہم دل پر خاک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں۔ آہ و نالہ میں اثر نہیں۔ اثر کیونکر ہو دل سے نالہ کیا جائے تو تاثیر بخشتے افسوس اس بات کا ہے نہ آہ اثر کرتی ہے نہ نالہ رسا ہوتا ہے۔ دل کی دشمنی کا خوب ثبوت دیا ہے۔

ساوگی و پرکاری بخودی و بشاری حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
اس بیان کے قربان جائیے۔ کیسے پیچیدہ خیال کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے یادگی بھولاپن۔ پرکاری۔ چالاکی۔ بخودی غفلت۔ بشاری خبرداری۔ فرماتے ہیں مشوق کو تغافل یعنی غفلت میں جرأت آزما پایا مطلب یہ ہے عشاق کا دل دیکھنے کیلئے مشوقوں کا بھولاپن ہوا کرتا ہے۔ حقیقت یہ بھولاپن خاص بشاری اور عین چالاکی ہے بنشست الفاظ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

غنیہ پھر گنا کھلنے آج ہم نے اپنا دل خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
مطلب یہ ہے۔ ہمارا دل جو خون ہو کر آنکھوں کی راہ سے زمین پر ٹپک گیا تھا اور پہلوں میں کہیں اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ آج ہم نے اُسی دل کو دیکھ لیا اور پایا یعنی یہ غنیہ گل جو فصل بیماراں میں پھر دوبارہ کھلا ہے ہمارا دل ہی تو ہے جو خزاں کے زمانہ میں خون ہو گیا تھا بدل کو اکثر غنیہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر عیسیٰ ہم نے بار بار ڈھونڈا تم نے بار بار پایا
فرماتے ہیں۔ دل کی حقیقت حال سے ہم واقف و خبردار نہیں ہیں کہ کب گیا اور کیونکر گیا یعنی عشق ایک بے اختیار شے ہے جو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس وقت پیدا ہو گیا۔ اور کس طرح پیدا ہو گیا لیکن اس قدر ہم جانتے ہیں کہ ہم نے دل کو ہزاروں بار ڈھونڈا ہے اور تم نے اس کو ہزاروں بار پایا ہے۔

شور پذیر تاصح نے زخم پر نمک چھڑکا آپ کوئی پوچھے تم نے کیا فرمایا
فرماتے ہیں۔ تاصح کی نصیحت بجا ہے زخم پر نمک چھڑک دیا جس کا مزد کچھ دل ہی

لے رہے آپ سے یہی حضرت ناصح سے تو کوئی پوچھے کہ آپ کو کیا لطف حاصل ہوا۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محالِ اجل گیا آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

غزل

فرماتے ہیں یہ اول سوزِ نہاں سے بے خوں ہو کر جل گیا اور اس کے جلنے کی صورت یہ تھی کہ آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا۔ آتش خاموش وہ آگ جو چپکے چپکے سٹکا کرتی ہے۔ اور جس میں شعلہ نہیں اٹھتا۔ سوزِ نہاں کے مقابلے میں آتش خاموش کا لفظ مصرعِ ثانی میں استعمال کرنا، انتہائے بلاغت ہے۔ مرزا صاحب کے بیان کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کہ بغیر ارادہ اور تلامش کے اکثر لفظی رعایتیں واقع ہو جاتی ہیں جن کو صنعت الفاظ میں شمار کیا گیا ہے۔

دل میں ذوقِ ہل و یادِ یار تک باقی نہیں آگس گھر میں بھی ایسی جو تھل گیا

مطلب یہ ہے عشق میں یاسِ ناامیدی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ لبِ دل میں ذوقِ ہل و یادِ یار تک باقی نہیں ہے۔ اس کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ خانہٴ دل میں ایسی آگ لگی کہ جو کچھ سرمایہ تھا وہ سب جل گیا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ قاعدہ ہے ناامیدی جب حد سے گزر جاتی ہے تو توقعِ خود بخود دمٹ جایا کرتی ہے۔ جیسے ہجومِ یاس نے ایسا کیا ہے دل کہ حشر کو ترے آنے کی اب امید باقی ہے نہ خواہش ہے۔

میں علم سے بھی پیسے ہوں نہ غافلِ بارِ میری آہِ آتشیں سے بالِ غماجل گیا

فرماتے ہیں میں علم سے بھی پیسے ہوں نہ غافلِ بارِ میری آہِ آتشیں سے بالِ غماجل گیا۔ البتہ جب اس منزل کو طے کر رہا تھا تو بارِ میری آہِ آتشیں سے غما کے بازو میں آگ لگ گئی تھی مطلب یہ ہے۔ میں نے ابتداءً تعلیمِ قیام میں شہرتِ غما کو مشا دیا تھا جس کو معدوم ہونے کی ایک سب سے زیادہ دلیل سمجھا جاتا ہے۔ غافل سے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو ترقیاتِ انسانی کو سمجھ نہیں سکتے۔

عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرِ اجل گیا

فرماتے ہیں۔ میں اپنے پر سوز مضامین کی گرمی کا بیان کہاں جا کر کروں میں نے سوچا تھا
شہر کو چھوڑ کر جنگل میں بیان کروں گا۔ رسیدگی کا خیال آتے ہی جنگل میں آگ لگ گئی۔ مرزا
صاحب کا مدعا اس بیان سے یہ ہے کہ انہم کی کثرت دیکھ کر جیسا پر سوز شعر لکھنے کو میرا
جی چاہتا ہے لکھ نہیں سکتا اور اپنے تخیل کی پوری پوری بلند پروازیاں دکھانا نہیں سکتا۔ یعنی
ماہموں کے سامنے اظہارِ کمال سے بچنا پڑتا ہوں۔ جو ہر اندیشہ سے جو ہر فکر مراد ہے۔

دل نہیں تھکو دکھا تاؤں داغوں کی بہا۔ اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما بل گیا
معتوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ یہ جو تو میرے سینے کے داغوں کو سیر اور روشنی دیکھ کر
تعجب کر رہا ہے اور حیرت میں مبتلا ہے میرے دل کے مقابلہ میں ان کی کچھ حقیقت نہ تھی
اگر میرا دل میرے پہلو میں ہوتا اور تو اس کا تماشا دیکھتا تو حقیقتِ حال سے واقف ہوتا۔
مگر کیا کروں وہ کار فرما ہی سٹ گیا۔ البتہ یہ اُس کا پر تو اور اثر باقی رہ گیا ہے جس کو
تو دیکھ کر حیرت و تعجب کر رہا ہے۔

میں نے دوسروں کی آرزو غالب کی دیکھ کر طرزِ تپاک اہل دنیا جل گیا
فرماتے ہیں شگفتگی خاطر جو روزِ بزم میں خصوصیت کے ساتھ مجھ کو ملی تھی جسکی بدولت میں
زمانہ بھر میں لطیفہ گو اور بدلتہ سیخ مشہور ہو گیا تھا اب اس کے مقابلہ میں افسردہ خاطر کی کتنائی
اور آرزو مند ہوں اور اس خواہش کا اسی سبب طرزِ تپاک اہل دنیا ہے۔ یعنی یہ لوگ
مجھ سے منافقانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

شوق ہر رنگِ قیاسِ مساآت نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عیاں نکلا

قیس کا لقب مجنون ہے۔ مجنون دیوانہ کو کہتے ہیں۔ دیوانہ اکثر ترکیبِ لباس کر دیتا ہے
شوق کے معنی بیاں عشق کے لئے گئے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں عشق دنیا کے سر و سامان کا دشمن
نکلا۔ سامان دنیا میں لباس جی داخل ہے۔ مطلب یہ ہے رنگِ عشق ایسا پختہ واقع ہوا تھا
کہ قیس کو تصویر کے لباس میں بھی اُس نے عیاں ہی رکھا۔ رنگِ تصویر جیسے دستی تصویر کی پینچی

جاتی ہے وہ بھی قیس کی عریانی کا پردہ نہ بن سکا۔ اب ہر رنگ کے معنی ملا حفظہ ہوں یعنی عشق میں جنون میں۔ عریانی میں۔ تصویر کے رنگ میں۔ الغرض ہر رنگ میں عشق دشمن ننگ ناموس ہی رہا۔ ظاہر ہے کہ قیس عاشق تھا۔ جنگل میں۔ ہاتھ ترکب باس کیا۔ دیوانہ لقب پایا۔ مرزا صاحب کے کماں کو دیکھئے کہ انہوں نے پردہ تصویر میں بھی اُس کو عریاں ہی دکھایا۔

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب تیر بھی سینہ بسمل سے پراقتلا نکلا
تنگوں و رنگ چشتی کا استعمال رشک و حسد کے موقع پر ہوتا ہے اور یہاں تنگہ دل سے شک کے عربی معنی مقصود ہیں جس کو عربی میں غبطہ کہتے ہیں اور غبطہ کے معنی جس پر رشک کیا جائے اسکے صفات حاصل کرنے کے ہیں۔ پراقتلا ذن کے معنی اہل ایران کے قادریہ میں ترک تعین کرنا کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زخم نے غبطہ دل کی داد نہ دی یارب جس کے سب سے تیر بھی ترک تعلق کر کے سینہ بسمل سے نکل گیا۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ رشک دل نے تیر کی خلعت سے سینہ کو بچا دیا، ورنہ اس طرح کہ دل نے سینہ کے رشک سے جس میں یار کا تیر چوک کر بالنگا تھا جان دے دی۔ اب تیر یا۔ نے دیکھا کہ دل عاشق بغیر زخم کے مرگیا میری ضرورت باقی نہ رہی، ترک تعین کر کے سینہ سے نکل گیا۔

بڑے گل مالہ دل و دود خراغ محفل جو تیری بزم نے کلا سویشاں نکلا
پھول کی خوشبو۔ دل کی فریاد۔ چراغ کا دھواں۔ سب چیزیں جو اسکے ساتھ پھیلنے والی ہو بکھر جانے والی ہیں۔ شاعران پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی پریشانی کا باعث ہوا نہیں ہے بلکہ یہ بھی تجھ پر عاشق ہو کر تیری بزم سے نکلتی ہیں اس لئے پریشان ہیں۔ مگر یہ سب کہ تجھے دیکھ کر اور تجھ سے مل کر یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی پریشان نہ ہو۔ یعنی تجھ پر عیب تن نہ ہو جیسے۔

دلِ حشر تھا، اندہ لذت درد کا صبار و کرب و زاری نکلا
اندہ کے کنکنا، دست۔ یا کھانا نصیحت۔ نہ دے کے جس مرزا صاحب نے اس منہ

پر دسترخوان کے معنی لئے ہیں۔ فرماتے ہیں میرا دل حسرت زدہ لذت درد کا دسترخوان تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ یاروں کو اُن کی قابلیت و ذوق کے موافق حصہ میرے دسترخوان پر سے ملا۔ یہاں کچھ کمی نہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی اپنی قابلیت کے موافق لوگ مجھ سے مستفیض ہوئے۔

جے نو آموز قناہمت دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی سانا نکلا

فرماتے ہیں میری ہمت اور میرا حوصلہ اس قدر دشوار پسند واقع ہوا ہے کہ فنا کی تعلیم اُس کے واسطے ایک معمولی سا کام سمجھا جائے۔ جیسے کسی مولوی کو۔ الف۔ ب۔ ت۔ پڑھائی جائے۔ کیا مشکل کی بات ہے جس کام کو ایک زمانہ دشوار اور مشکل سمجھا ہے وہ بھی میرے واسطے آسان نکلا اک اور جگہ پر بھی مرزا صاحب نے اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں۔ قناہ تعلیم وہ جس جو ذی ہوش اُس نے سے کہ محض لام الف لکھتا تھا دیوار و بستاں پہ دل میں بھر گریہ نے اک شو اٹھایا تھا۔ آہ جو قطرہ نہ نکل تھا سو قطرہ فاس نکلا

چہرہ کا نشانہ اس مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ گریہ میں دربارہ شور و غل پیدا ہوا۔ شور و غل پانی کی وہ آواز جو دریا یا سمندر میں جوش کے دشت پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں پہلی بار تو میں نے اُس جوش کو اس قدر ضبط کیا تھا کہ دریائے گریہ کا ایک قطرہ ہی آنکھ سے نہ نکلنے دیا۔ انہوں نے۔ اب وہ دریا ٹکڑ ٹکڑ اور طوفان کی صورت اس نے پیدا کر لی شہر کا خلاصہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ عشق نے خاطر ہو جانے کا سامان پیدا کر لیا۔

دھمکی میں مر گیا چونہ باب نہر دھمکا عشق نہر دہ پیشہ طلب گار ہر دم تھا

فرماتے ہیں۔ وہ شخص دھمکانے سے گبا جو میدان جنگ میں پہنچے کبھی نہ اُترتا (یہ اشارہ ہے نزدیکی طرف) عشق نہر دہ پیشہ وہ سیاہی جو ہمیشہ روتا رہتا ہے۔ رہنے مفت نہ میں ایک بادرسپاہی کو بل رہا ہے اور وہ بادرسپاہی ہم ہیں۔ ہم نے فریاد کی طرح عشق کی دھمکی میں رعب نہ ہوئی دی۔ بلکہ مردانگی کے ساتھ عشق و رسد ب عشق کا منتظر رہنے لگی

بھر کرتے رہا۔

تو زندگی میں موت کا ٹھٹکا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر بھی مرانگت دیتا
ڈباتے ہیں مجھے زندگی میں بھی موت یاد تھی اس لئے میں نے اپنے کو فنا ہونے سے پیشتر
فنا کر دیا تھا۔ اس بیان کا لطف کچھ بل تصوف ہی اٹھا سکتے ہیں۔ جو موت تو قبل از موت
کے راز سے آشنا ہیں۔ دوسرے مصرعے میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے
"اُڑنے سے پیشتر بھی مرانگ زرد تھا" یعنی موت کی مرونی جھجھانے سے پہلے میرے منہ
پر موت کی مرونی چھلی ہوئی تھی۔ اس زمین میں ایسا بلند شعر کہتا مرزا ہی جیسے ماہرین
اور ہم بشوت استاد کا کام تھا۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعہ خیال بھی فرود تھا
فرماتے ہیں بدائے عشق میں اس وقت جبکہ میں وقاداری کے متعلق نسخوں کی تالیف
کر رہا تھا اور ادویہ وفا کی ایک ایک خواص و مزاج قائم کر رہا تھا اور وہ اب وفات
تھا کہ میرا خیال وفا کی ایک ایک خوبی کو علیحدہ علیحدہ جا بجا کر رہا تھا۔ مجھے پستہ کا آخانہ ہو گیا
اور میری دنیا کے نسخے نامکمل اور نامرہ گئے۔

دل تاجگر کہ سال دینے توں کے اب اس بگڑ میں جلوہ گل آگے گرد تھی
شعر کا مطلب یہ ہے۔ ہم جی خوشی اور فارغ ابالی کے زمانہ میں ان شگفتہ اور حسن ظہین
رکھتے تھے۔ ہر وقت وہ جہاں میں پیشتر منت رہتی تھیں جن کے سامنے جلوہ گل جی گرد موبنا
تھی مگر زمانہ بگڑ گیا اب تشراب ہو گیا ہے کہ اب دل سے جگر تک ایک دروئے حور کے
سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جب دس شگفتہ رکھتے تھے اب باخاطر پیشاں زندگی کے
دن بکاٹ رہے ہیں۔ نقشب زبانی کی کس قدر سچی اور پورا تصویر کھینچی ہے۔

باقی بے کوئی کشمکش اندویش کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درود
فرماتے ہیں عشق پر یا بوجانے کے بعد یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ آدمی اس سے

نجات پاسکے اپنی جیب تک دل پہلو میں تھا اس وقت تک زندہ و عشق نے دوسرا رنگ
دوسرا پہلو اختیار کر رکھا تھا جب سے دل جاتا رہا دل کے جانے کا درد و غم اسی طرح پہلو میں
رہا۔ مطلب یہ ہے جان بچنے کا کوئی پہلو نہ دل کی موجودگی میں تھا نہ دل کے
جانے کے بعد نظر آتا ہے۔

احباب چارہ سازی وحشت کر کے زنداں میں بھی خیال بیا بیاں دیتا تھا
قاعدہ ہے کہ دیوانہ آدمی کو پاگل خانہ میں مقید رکھتا اس کے جنون کا علاج کیا کرتے
میں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ دوست آشنا میری وحشت کا کچھ علاج ہی نہ کر سکے۔
وحشت اور دیوانگی سے باز رکھنے کے لئے مجھ کو قید کیا تھا مگر قید خانہ میں بھی میرا خیال اسی طرح
بیا بیاں نور و اجاس طرح میں خود قید ہونے سے پیشتر وحشت کے عالم میں جنگل جنگل پڑا
پھرتا تھا۔

یہ غرض ہے کفر اسد خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
فرماتے ہیں۔ اسد خستہ جاں جب تک زندہ رہا آزادی کے عالم میں باقیہ عنائق سے
بالکل آزاد تھا مرنے کے بعد اٹش کی لاش کا بے کفن ہونا بتا رہا ہے کہ وہ اب بھی گورد کفن کی
قید سے آزاد ہے حق مغفرت کرے اس حبلہ دغا ئیہ نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔
شمار سجدہ مرغوب بہت مشکل پسند آیا تماشا ہے بیک کف مہجون مدد پسند آیا
یہ ساری غزل اس زمانہ کی ہے جب مرزا صاحب پر فارسی کا رنگ نہ لب لباق
ردیف کے سوا پورے پورے مصرعے فارسی میں ہیں یہاں تک کہ مطلع کے مصرعہ اولیٰ
میں ردیف کا پہلو بھی فارسی ہے یعنی اہل ایران کے ہاں مرغوب آمد محاورہ ہے۔ مگر
معنی کے اعتبار سے یہ ایک سیالچھوٹا سخنوں ہے جس کو آج تک کسی شاعر کے خیال نے مس نہیں
کیا فرماتے ہیں شمار سجدہ میر بہت مشکل پسند کو بہت ہی پسند آیا ہے نہ اس لئے کہ وہ بھی تیسرے پر
پڑنا چاہتا تھا بلکہ اس واسطے کہ ایک جھپٹے میں سودلوں پر قبضہ حاصل کر لینے کی ترکیب

مرزا صاحب کا پہلو دار بیان اس مقطع میں دو معنی پیدا کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ میرا غمخوار جو دوست کو سمجھانے اور مجھ سے ملاقات پر آمادہ کرنے کے لئے گیا تھا وہ وہاں سے تختہ میں زخم ہیرے کی کنی۔ رابع جگر لیکر واپس آیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ خود عاشق ہو گیا۔ دوسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ حضرت عشق یہ سامان خرابی لیکر جناب اسد اللہ خان صاحب غالب کی ملاقات کو تشریف لائے ہیں۔

دہر میں نقش و فواجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
 فرماتے ہیں دنیا میں جو لوگ دنیا داری سے کسی کے دل پر نقش و فواجہ کر دیتے ہیں وہ گویا ایک بیکار کام میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اس لئے نقش و فواجہ اہل و عاقل کے لئے موجب تسلی خاطر اور سبب اطمینان طبیعت نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اہل دنیا دستور دنیا کے موافق وفاق کے صلے میں جفا و ستم کے مستحق قرار دئے جاتے ہیں مرزا صاحب اپنی تسلی خاطر ان لفظوں سے فرماتے ہیں۔ وقاوہ لفظ ہے جس کے کچھ معنی ہی نہیں ہیں گویا وفاداری دنیا میں بیکاریاں ہے۔

سبزہ خط سے تنے کا کل سرکش دہلی یہ زمر دہی حریف دم افنی نہ ہوا
 مشہور ہے کہ زمر سے سانپ اندھا ہو جایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں میرے سبزہ خط سے زلف کا افنی سرکش اندھا نہ ہوا مطلب یہ ہے کہ خط نکل آنے پر بھی زلفوں کی دلفریبی اور سرکشی میں کچھ فرق نہ آیا۔ سبزہ خط کو زمر سے اور کا کل کو سانپ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فواجہ ہو
 وہ شکر مرے مرنے پہ بھی ارضی نہ ہوا
 فرماتے ہیں مرتبانے کے بعد فکر و فواجہ چھٹکا رہا ہو جاتا لیکن وہ شکر میرے مرنے پر رضا مند نہ ہوا۔ نزاکت خیال اس شعر میں یہ پدائی گئی ہے کہ موت جو ایک بے اختیاری اور ناگزیر امر ہے اس کو اختیاری اور دوست کی مرضی کا تابع ظاہر کیا گیا ہے مگر دوست شکر ہے وہ عاشق کے

میرے پر رضا مند نہیں ہوتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی موت میری بدنامی کا باعث قرار پائیگی۔ غلام
 ازبک میرے شعل ستم میں ذوق آجائیگا۔ ورنہ سب زیادہ یہ خیال مانے ہے کہ ایسا وفادار و دوست
 جسکو کہاں ملے گا۔ لفظی اور معنوی خوبیوں کی اس شہر میں کوئی انتہا نہیں رہی ہے۔

دل گزرگاہ خیال سے وساعزی تھی گر غفلت جاوہ سمنزل تقویٰ نہ ہو
 فرماتے ہیں۔ اگر سانس راہ سمنزل پیر ہیزکاری نہ بن سکا تو کچھ غم نہیں میزول گزرگاہ و جام
 و شراب تو بن سکتا ہے میں جام و شراب کے خیال ہی میں دل کو مست رکھوں گا۔ اگر یہ اتقویٰ سے طبیعت
 کو خوش نہیں کر سکتا۔ نہ ہی اس پر ہیزگاری کو برابر تصور کیا گیا ہے

ہوں تم سے غم نہ کرنے پہ بھی رہنی کہی گوش منت کش گلاب تک تسلی نہ ہوا
 مطلب یہ ہے کہ اگر تو نے وصل کا وعدہ نہ کیا تو بھی میری خوشی کا باعث ہے اس سبب
 کہ میرے کان کبھی تسلی کی آواز سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ میرا مقصود وعدہ وصل ہی تھا
 لیکن اس لئے کہ میں کبھی شرمندہ احیاں نہ ہوا تھا اپنی ناکامیابی سے خوش ہوں۔
 کسے محرومی قسمت کی شکایت ہے تب سے چاہتا تھا کہ جا میں سودہ بھی نہ ہوا
 فرماتے ہیں محرومی قسمت ہمارے حصہ میں آگئی ہے جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں وہی نہیں ہوتا
 یہاں تک ہماری قسمت کو ہم سے ضد ہے کہ ہم نے دنیا کے محسوس سے تنگ کر دیا چاہتا تھا کہ بد سے
 مری جائیں تو یہ بھی نہ ہوا۔

مر گیا صدیک جنبش لب غالب ناتواںی سے حریف دم عسلی نہ ہوا
 حریف در مقابل۔ فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ نے بھی پورا تھا باذن اللہ نہ کہا تھا۔ صدف ہونے
 کو خفیف ہی جنبش ہوئی تھی کہ غالب کا کام تمام ہو گیا۔ یعنی وہ اتنا خفیف و ناتواں تھا کہ حضرت عیسیٰ
 کے ہونٹوں کی حرکت کو بھی برداشت نہ کر سکا۔

ستائش گر ہے زاید پس قدس باغ فضاں کا وہ اک گلہ تہی ہم بخود دل طاق نیاں کا
 طاق نیاں طاق کو کہنے میں جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں۔ طاق نیاں کا گلہ تہی

وہ نگہ رستہ ہے جس کو طاق نیاں میں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ بنخودوں کی بہشت کو طاق نیاں کے
کھدستہ سے تشبیہ دینی بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو آج تک کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزری۔
مطلب یہ ہے کہ زراچہ جس باغِ حنت کی اس قدر مدح کرتا ہے وہ ہم بنخودوں کے طاق نیاں کا وہ
نکدرتہ ہے جس کو ہم نے دل سے اتار دیا اور بھلا دیا۔

بیاں کیا کیجئے بیدار کا و شہائے مژگان کا کہ ہر اک قطرہ خونِ آنہ ہے سچ مر جاں کا
خون کے قطرہ کو سونگے کے دانے سے جو تبیع میں ڈالا جاتا ہے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں۔
مژگانِ یار کی کاوش نے قطرہ خونِ آنسو بنا دیا ہے جنہوں نے مسلسل لڑی و رنج ہو کر تبیع مر جاں
کی صورت اختیار کر لی ہے بھٹونِ شہزادت سے خالی نہیں ہے۔

نہ آئی سبطِ قاتل بھی مانعِ میرے مالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
سبطِ رعب نیستان نے کاجنگل۔ نے بانسری کو کہتے ہیں۔ نے نوازی بھی محاورہ ہے
اور بانسری بجانی بھی بولا جاتا ہے۔ دانتوں میں تنکا لینا اظہارِ تکبار کرنا۔ ہندوستان میں بھی اس کا
عمل در آتا ہے اور جس بہ نماں گرفتِ فارسی محاورہ بھی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں قاتل کا رعب
و ادب بھی میرے مالوں کو نہ روک سکا۔ اُس کے خوف سے انہما عجز کے لئے جو تنکا میں نے دانتوں
میں دبایا وہ نے بکھر خود بخود بیچنے لگا اور اُس سے مالہ کی آواز پیدا ہو گئی۔

دکھاؤں کا تماشا دی اگر فرصتِ زیانے مرا ہر داغِ دل اک تھم ہے سرورِ چراغِ گل
فرماتے ہیں۔ اگر چکوزانہ نے مہلت دی تو میں تم کو سیر و کھاؤں لگا ہوا ہر اک داغِ دل سرورِ چراغِ گل
کا بیج ہے مطلب یہ ہے کہ داغِ عشق ابھی دل میں پیدا ہوا ہے ورنہ دگوں تھم ہے سرورِ چراغِ گل۔ غم
زبانہ کا کوئی انقلاب پیش نہ آیا تو وہ میرے دل سے بخورے دلوں میں سرورِ چراغِ گل پیدا ہو جائیگا۔
کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوئے کرے جو پر تو خورِ شیدِ عالمِ شہنشاہ کا
شہنشاہِ حرم ہے شہنشاہِ اوستاں سے شہنشاہِ اوس کو کہتے ہیں۔ ہستاں وہ مقام تھاں دوس
پڑی ہو۔ آئینہ خانہ وہ مکان جس میں دیواروں پر چاروں طرف آئینہ کے ٹکڑے نصب کیے

گئے۔ میں نے نہ مین بر کہ تیش محل سے ہیں۔ فرماتے ہیں تیرے جہوہ نے شیش محل کا وہ حال کرنا
 سوچا آفتاب کی گری شبنم کا کر دینی ہے جس طرح شبنم کے قطرے آفتاب کی گرمی سے ہلکا کر دیتے ہیں
 اسی طرح تیرے جہوہ کی گرمی سے آفتاب کی گرمی ہو کر رہ گئے۔

مری تعمیر میں شہر ہے گھر و رست خرابی کی ہوا برق خرمین کا ہے خون گرم دھنوں کا
 تعمیر نہایت مکان جراب۔ ویرانہ۔ کھنڈر۔ ہیور۔۔۔ وہ خون گرم۔ سرگرمی صعب یہ ہے۔
 میرا جسم فانی ہے، یعنی یہ اور خود میری فنا کی ویس ہے جس طرح دھنوں کی سرگرمی خود اس کے کھینک
 پر پہلی کا کام دیتی ہے اسی طرح میرے جسم میں فنا ہونے کی قابلیت پوشیدہ رکھ دی گئی۔ دوسرا
 حصہ: میں نے صبر سے کی شرت تصور کیا جائے۔

اُگاہے گھر میں سرسبز ویرانی تماشہ کر مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہی میرے دریاں کا
 سبزہ تھے سرسبز ویرانہ ہے۔ اور سبزہ بیگانہ ہے گھاس کو کہتے ہیں جو برسات کے موسم میں
 بے سوت مقام پر پیدا ہو جاتی ہے۔ مزارعہ صاحب فرماتے ہیں۔ مکان کے ویران ہونے کے بعد یہ ذلت
 پخت گئی ہے کہ اس میں جگہ جگہ پرگیس اُگ رہی ہے۔ دریاں کا کام جیگا نہ آدمی گھر کے اندر نہ آنے
 دینے کا ہے اس لئے وہ سبزہ بیگانہ کو کھود کھود کر گھر سے باہر نکالتا ہے۔ ویرانی کو خطاب کر کے کہتے
 اسے ویرانی تو یہ میر تو دیکھ لطف سے خالی نہیں ہے۔

خود غی میں شاخیں گشتہ لاکھوں آرزو میں ہیں چراغِ مردہ ہوں میں زبانِ گویاں کا
 مزارعہ صاحب فرماتے ہیں۔ میری خاموشی میں چھپی ہوئی لاکھوں آرزوئیں ہیں۔ گویا میں نے زبان
 بجھا ہوا چراغ ہوں۔ گویا غریباں کا۔ چراغ کی لو کو آدمی کی زبان سے تشبیہ دی ہے اور سمجھے ہوئے
 چراغ سے مراد بے زبان آدمی ہے۔ یہ تشبیہ خوں گشتہ آرزوؤں سے مناسبت رکھتی ہے۔

ہنوز اک پر تو نقشِ خیالِ یار باقی ہے دلِ افسردہ گویا جبرہ ہے یونٹ کے زندانِ کلی
 فرماتے ہیں۔ ابھی تک تصور اس خیالِ یار کا لمس باقی ہے۔ اگرچہ میری افسردہ فاعلی نے
 خیالِ یار کو دل سے مٹا دیا ہے لیکن اس ذرا سے پر توں بھی اس بل کا نور ہے کہ میرے دلِ افسردہ پر

حجرۂ زندان یوسف کا گماں ہوتا ہے۔ حجرہ چھوٹی کوٹھری کو کہتے ہیں۔ دل افسردگی سے تنگ آکر حجرہ بن گیا ہے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں نہ سبب کیا؟ خواب میں اگر تبسم ملے پہناں کا تبسم ملے پہناں وہ تبسم جس کا، تر ہونٹوں پر برائے نام ظاہر ہو۔ فرماتے ہیں خواب میں اگر تبسم پہناں کا سبب شاید یہ ہے کہ آپ کسی مقام پر غیر کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں اور میرے جلاسنے کے واسطے خواب میں آکر چوسی سے مسکراتے ہیں۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا قیامت ہے سرشک لودھ ہونا میرے مڑگاں کا فرماتے ہیں کہ کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تو نے بہایا ہوگا۔ یعنی کن کن لوگوں کو بے گناہ قتل کیا ہوگا۔ تیری مڑگاں کا آنسوؤں سے تر ہونا قیامت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے اب اُن بے گناہوں کی یاد تھک کر رہی ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کل فرماتے ہیں۔ جادۂ راہ فنا دنیا کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ ہے۔ تمام ادراق عالم فنا ہو کر اسی ایک ڈور سے میں منسلک ہو جاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جس شے میں تمام ادراق عالم بے ہوش ہیں میں اس رشتہ کو بھولا نہیں ہوں یعنی جادۂ فنا۔ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے وق کم میرا حباب موجہ رفتار ہے غمش قدم میرا یک بیابان ماندگی۔ بہت تھک جاتا۔ ذوق سے مراد یہاں ذوق صحرانوردی ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں خواہ کیسا ہی تھک جاؤں میرا شوق صحراوردی کم نہ ہوگا۔ جس طرح موج آب آگے بہکنے کی غرض سے اُبھرتی ہے۔ اسی طرح میرا نقش قدم آگے بڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔

محبت تھی حین سے یکنایت یہ دغی ہے کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

مطلب یہ ہے۔ پیسے بچے جن سے محبت تھی۔ اب نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ بولے کل جو بیشتر
مسترت اندر خونی پیدا کرتی تھی۔ اب اس سے یہ لڑک میں رہا ہے۔ نہ اس کے نقد ب سے محبت نے
نفرت کی صورت پیدا کر لی ہے۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور فوس حاصل کا

مطلب یہ ہے کہ مسترا پتا بے عشق بھی ہوں اور یہی بات جو غریزہ رکھتا ہوں۔ میری
مثال ایک آتش پرست کی سی ہے کہ آگ کی پرستش بھی کرتا ہوں اور خرم کے جل جانے کا بھی
انابیشہ ہے۔ ناگزیر الفت ہستی کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنے کو غریزہ رکھنے پر مجبور ہوں یہی اللہ تعالیٰ
نے میری خلقت میں یہ بات و ہیئت رکھ دی ہے کہ اپنی جان کو غریزہ رکھوں۔

بہ نظر ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوا صل کا

ذہن ہے اسے ساقی شہاب پڑنے میں جس قدر تیرا حوصلہ بڑھا ہوا ہے اسی قدر شراب
پیشہ میں بھی عالی ظرف واقع ہوا ہوں یعنی تو اگر دریائے مے ہے تو میں ساحل کی اندرانی ہوں
تو عدہ ہے کہ شراب خواہ کوشہ کے آثار پر انگریزائیاں آنے لگتی ہیں۔ ساحل یعنی دریا کا کنارہ
بوجہ دوریا قریب ہونے کے ہمیشہ تشنہ لب رہا کرتا ہے۔ اس مثال سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ
ساقی جس قدر دریا دلی سے شراب پلا رہا ہے اسی قدر میں بھی عالی ظرف ہونے کی
وجہ سے شراب کا پیاسا ہوں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے ازکا یاں نہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

فرماتے ہیں۔ راز کے نغموں سے تو خود ہی آتش ہے۔ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر
آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے اور سچ رہے ہیں اور اسرار الہی ظاہر کر رہے
ہیں بے مثل شعر لکھا ہے۔

رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتن گھمائے ناز کا

فرماتے ہیں۔ میرا راز اچھا رنگ میسے دوست کی صبح بہارِ نظارہ ہے اور وہ یہی وقت

تو ہے جب اُس کے گلہائے ناز کھلا کرتے ہیں۔ اس لئے معشوق سے خطاب کر کے فرماتے ہیں
صبح کے وقت میرے منہ پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی دیکھ کر تو بھی اپنے ناز و انداز کے بھول
کھلائے میں مصروف ناز و انداز ہو۔

تو اور سوئے خیر نظر ہائے تیز تیز میں اور دکھ ستری شرہ ہائے دلاز کا
شرہ ہائے دراز سے ہاں ل میں اُتر جا خواہی اور گھر کر لینے والی بلکیں مراد میں فرماتے
ہیں۔ تو اور غیر کی طرف یہ تیز تیز نگاہیں میں اور دل میں گھر کر لینے والی پلکوں کی تکلیف۔
مطلب یہ ہے تو جو لطف و عنایت کی نگاہیں غیر پر کرتا ہے بھکر رشک و حسد پیدا ہوتا ہے
اور اُس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تیرا عشق رشک کی بر جھیاں میرے دل میں چھوٹا ہے۔

صرفہ ضبط آہ میں میرا و گرنہ میں طعمہ ہے ایک ہی نفس جانگداز کا
فرماتے ہیں میں جو اپنی آہ کو ضبط کر رہا ہوں۔ اس میں میں اپنا فائدہ سمجھ رکھا ہے ورنہ
میرا جسم زاد میرے ایک ہی نفس جانگداز میں گھل کر آتش عشق کی خوراک بن جائے یعنی جس طرح
شمع جھک کر رہ جاتی ہے۔ میری آہ مجھ کو فنا کر دینے کے لئے کافی ہے۔

ہیں سکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے ہر گوشہ بساط ہے۔ سر شیشہ باز کا
شیشہ باز ایک قسم کا بھانسی ہوتا ہے جو تماشا کرتے وقت شیشے یا بوتل کو اچھاں کر سر
و دوش پر روکتا ہے اور ناچنے میں جسم کے ہر حصہ پر اُس کو لے آتا ہے۔ فرماتے ہیں بہار کا موسم
آنے سے شراب میں ایسا جوش پیدا ہو گیا ہے کہ جہاں جہاں فرش کے کونوں پر شراب کے بھرے ہوئے
شیشے رکھے ہیں۔ اپنے اپنے مقاموں پر وہ اسی طرح اچھل رہے ہیں۔ جس طرح باز یگر
کے سر و دوش پر جنبش دینے سے شیشہ اچھلتا ہے، اور پھر اُسی مقام پر قائم
ہو جاتا ہے۔

کاوش کا دل کسے تھا ضاکہ ہی ہنؤ ناخن پہ قرص اُس گرہ نیم باز کا
فرماتے ہیں۔ یار کی گرہ بند قبا ہم سے آدھی کھل کر رہ گئی پوری نہ کھل سکی۔ اس جسم

میں ہار دے کہ جس کا تھنا کر رہا ہے اور ناخن پر بھی تک گرہ بند تھا کہ ترسنا ہوا ہے
 یہ سب کہ ہم پہنچاں کوں ناخن سے کہ جس سے بند تھا پورا نہ کھل سکا تھا کہ پیر کر زخمی
 کر لیں اس سے زیادہ ترسنا کہ می کا بدن اور کیا ہو سکتا ہے۔

تاریخ کاوش غم پیراں ہوا اسد سینہ کہ تھا دقینہ گہرا سے راز کا
 تاریخ کاوش غم پیراں ہوا اسد سینہ کہ تھا دقینہ گہرا سے راز کا
 میں زخم ہوئی ہے وہ سب و غیرہ بونے پر دست دراز کرتی ہے۔ اور ساتھ کے ساتھ
 مکہ نوں کو بھی ڈھاتی دیکھ کر قی جاتی ہے۔ فراتے میں کاوش غم پیراں سے اسد
 پختیاب ہو کر اس کوٹا یا اور ہر ہر کردیا۔ سینہ میں جو کچھ زخمی یا رز حقیقت کے نزلے
 چھپے ہوئے تھے وہ سب ظاہر ہو گئے۔

بزم شاہ شاہ میں شاعر کا دفتر کھلا رکھو یا رب یہ دیکھتے گویا کھلا
 قلندریں میں جہنم میں جہنم موقوفوں پر متواتر شاعر ہو کر تھے باکھوض خیر و شاہ
 نعل سبانی باور شاہ کے غم میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اسی کے متعلق فرماتے ہیں بزم شاہ شاہ
 میں شاعروں کا دور دورہ پھر شروع ہو گیا۔ وہ زمانہ وہ موسم گیا جس میں سخت وارش عرس
 جاری ہو گئے گویا دفتر سخن کھل گیا۔ دوسرے مصرع میں اس خوشگوار موسم کے لئے دعا کرتے
 ہیں کہ الہی اس کان گوہر کے زردارہ کو ہمیشہ کھلا رکھنا۔

شب ہوئی پیراں بزم رخشہ کا منظر کھلا اس تکلف سے کہ گویا تیکہ کا در کھلا
 اس منظر میں پیراں بزم رخشہ کا منظر کھلا اس تکلف سے کہ گویا تیکہ کا در کھلا
 ہوئی بزم سخن منعقد ہونے کا وقت آ گیا چکنے والے ستاروں کا منظر کھل گیا۔ چکنے والے ستاروں
 سے یہاں اسد میرا ہیں۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں اس تکلف سے کہ گویا تیکہ کا در کھلا ہے
 کہ گویا تیکہ کا در کھلا یعنی وہ انجمن رخشہ جو اشعار کے باس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے
 آراستہ میرا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے دھلے ہوئے تبت سانسے رکھنے میں جو منہ سے

بول رہے ہیں۔
 گرچہ چوہوں یوانہ پریوں دوست کا کھاؤں۔ آستیں دشنہ پنہاں تھیں خنجر کھلا
 دشنہ چھری کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں ہوں تو دیوانہ لیکن دشمن درست نما کا فریب
 نہیں کھاؤں گا۔ آستیں میں چھری چھپا کر لیا ہے، درخشی میں کھنڈا ہوا شتر لے رکھا ہے۔ بظاہر
 فصد یعنی چاہتا ہے جو دیوانہ کا علاج ہے اور دل میں قتل کا ارادہ رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے
 کہ ظاہری دوست باطن میں دشمن ہوا کرتے ہیں۔

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں سکا بھید۔ پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پھر کھلا
 اس روایت کو معمول کہتے ہیں۔ یہاں گھٹنے کے معنی بے تکلف ہو جانے کے ہیں۔ فرماتے
 ہیں اُس کی پیچیدہ باتیں میں نہیں سمجھ سکتا اور اس کے پوشیدہ راز میں نہیں پاسکتا لیکن میں
 اسی میں خوش ہوں کہ مجھ سے وہ پری پھر بے تکلف ہو گیا۔

ہے خیال حسن میں حسن عمل کہ سا خیال۔ خلد کا اک۔ رہے میری گور کے اندر کھلا
 فرماتے ہیں میں خیال حسن یا میں ایسا محو ہو گیا ہوں کہ اب اُس کو حسن عمل خیال
 کرتا ہوں، اور اس خیال کرنے کی وجہ یہ واقع ہوئی ہے کہ خلد کی ایک کھڑکی میری قبر کے اندر
 کھل گئی ہے۔ مطلب یہ ہے معشوق حقیقی کے تصورِ کمال نے مجھ کو عبادت کا کام دیا ہے
 اور اسی کے ذریعہ سے میری بخشش ہو گئی ہے بخشش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جنت کا
 دروازہ قبر میں کھول دیا جائے۔

گنہ نہ کھٹے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں۔ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شعر کے منہ پر کھلا
 اس شعر کا یہ لکڑا کہ دیکھا ہی نہیں مرزا صاحب کے قصہ کا ہے معشوق حقیقی کا حسن و لبت
 کس نے دیکھا ہے شعر کی تشریح یہ ہے۔ باوجود اس قدر پردوں جو ظہورِ تجلیاتِ تابِ ساق
 پر عور ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اُس کی صفت بیان جو ہی نہیں سکتی۔ قاصدہ۔ ہے سیاہ
 زلفیں گویا رنڈ بھورت چہرے پر نہایت بھی معلوم ہو اُرتی ہیں یہ راز صاحب نے جس

نقابے لہو سے جی بڑے بخوشی معبود ہوئی۔ مرزا صاحب نے زمانہ قدیم کے موافق نقاب کو مذکر
باندھا ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ بے نی واسے، اتفاق نقاب کو مؤنث استعمال کرتے ہیں۔
در پہ پہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گپ جتنے عرصہ میں مرالپٹا ہوا بستر کھلا
شعر سیدھا اور صاف ہے معشوق کی تلون مزاجی طبیعت کی شوخی، بالخصوص گمانی
کی تصویر سادہ لفظوں میں کھینچ کر دکھائی گئی ہے۔

کیوں اندھیری شبِ غم ہی بلاؤں کا نزول آج ادھر ہی کو رہیگا دیدہ اختر کھلا
شبِ غم کی کلیفوں سے گھبرا کر اپنے دل سے سوال پیش ہے کیا سبب ہے رات
کیوں اندھیری ہے گویا جو اس ایسے بگڑ گئے ہیں کہ دماغ میں سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں
ہی ہے۔ پھر خود ہی سوچ کر جواب دیتے ہیں۔ بلاؤں کا نزول ہے یعنی مجھ پر شبِ فراق میں
آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدہ اختر اُس کے تماشائی ہیں، اسلئے تاروں نے
اپنا منہ آسمان کی طرف کر لیا ہے۔ اگر تاروں کی روشنی ہوتی اور میں ان بلاؤں کو آسمان سے اترتے
ہوئے دیکھ سکتا تو شاید کچھ اپنی حفاظت کی تدبیر کر سکتا۔ بے بات تو خیال میں آگئی کہ میر
شبِ غم ہے اس لئے اندھیری ہے مگر نزولِ بلا سے بچنے کی تدبیر اندھیرا گھپ ہو رہے ہے سبب
سے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

کیا رہوں غمِ بزمِ خوشی جو اوت کا خیال نام لے تا ہے وطن سے نام۔ برا کٹر کھسار
فرماتے ہیں میں وطن کی کلیفوں سے پکڑ پر دیں میں رہتا مگر مسافرت میں بھی حادثوں
کی یہ کثرت ہے کہ جو خطا نامہ برد وطن سے لاتا ہے وہ کھلا ہوا ہوتا ہے یعنی کسی کسی عزیز کی خیر
مگر درج ہوتی ہے اس صورت میں یہاں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی رسم ہے
کہ جس خطا میں کسی کی موت کا واقعہ تحریر کیا جاتا ہے اُس خط کا ایک کنارہ بھی کتر لیتے ہیں اور
لغافہ بھی نیم دار رکھتے ہیں۔

اُس کی آست میں میں تیر مچو کن مہ بند واسطے جس شے کے غالب گنبد بے در کھلا

یہ مقطع نعتیہ ہے۔ شب معراج کا واقعہ کس خوبصورتی سے کیسے مختصر جملے میں ادا ہو گیا ہے۔ یعنی گنبد بے در کا کھٹنا ہمارا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔

(غزل قطعہ بند)

شبکے برق سوزِ دل سے زہرا آ رہا تھا شعلہ جوالہ ہر ایک حلقہ گرداب تھا
فراتے ہیں۔ رات کو میرے سوزِ دل کی بجلی سے ابر کا پتہ پانی ہو گیا تھا اور جھینور
اُس میں پڑتا تھا۔ وہ ایک شعلہ جوالہ بن گیا تھا۔

واں کرم کو عذرا بارش تھا غما گیر خرام گریہ سے یاں مہیہ بالِش کھن سیلاب تھا
وہاں تو اس کو مہینہ برسے گا نہ مل گیا تھا۔ وصل کا وعدہ کیونکر انفا ہو سکتا
تھا اور یہاں سکنا منظر میں تھا کہ روتے روتے تکیہ کی روئی گویا پانی کا جھاگ بن گئی تھی۔
واں خود آرائی کو تھا موتی پروئے کا خیاں یاں نجوم عشق میں تازہ نگہ تابیاب تھا
وہاں تو اس کی خود آرائی بناؤ سنگھار کیلئے موتی پرور ہی تھی اور اس مصروفیت میں وعدہ
بھی فراموش ہو گیا تھا۔ یہاں یہ حال تھا کہ انتظار میں روتے روتے یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ آنسوؤں
کی کثرت نے تازہ نظر کو بھی گم کر دیا تھا۔ مدعا یہ ہے کہ معشوق چاہتا تھا کہ ظاہری آرائش
میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور عاشق کا شوق اس بات کا متقاضی تھا کہ وصل کی گھڑی جلد
آجائے خود آرائی اور بیتابی شوق کی تصویر اس سے بہتر لفظوں میں کس طرح میں نہیں سکتی۔

بلوہ گل نے کیا تھا واں چلے غاں آج یاں اُن شرکانِ چشم تر سے خون تاب تھا
وہاں تو اس کثرت سے پھول کھلے ہوئے تھے کہ ان کے عرس سے نہر کے پانی میں چراغ
روشن نظر آتے تھے اور یہاں خون کے آنسو ندی کی طرح آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔
یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوارِ جو واں ہ فرق تازہ جو بالِش کجواب تھا
فراتے ہیں۔ میرا میرا شور و ریدہ جس میں عشق و محبت کا جوش بھرا ہوا تھا۔ فرقت کی

میتا لی اور بیخوابی سے دیوار ڈھونڈ رہا تھا (مرزا صاحب دیوار سے سر پہوڑ کر مر جانے کی تکلیف کو فرقت میں جا گئے کی ایذا پر ترجیح دیتے ہیں) دوسرے مصرع میں مقابلہ اپنی حالت کے معشوق کی حالت پر رشک کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ وہاں وہ فرق ناز کجواب کے تیگوں پر رکھا ہوا تھا۔ وہ آرام سے سوتا تھا اور میں سر پہوڑ کرنے کی جستجو میں تھا۔

یاں نشن کرتا تھا روشن شمع نرم بخودی جلوہ گل و انساں با ط صحت احباب تھا
فراغتے ہیں۔ یہاں ہماری گرم آہیں شمع کی طرح روشن ہو گئی تھیں۔ ہنڈ سے سانس کے ساتھ شعلے نکل رہے تھے۔ درود شعلے ہماری بخودی عشق میں اضافہ کرتے جاتے تھے۔ وہاں فرش پر پھوپوں کا بکھونا ہو رہا تھا اس پر صحت احباب گرم ہمتی یعنی رقیبوں سے بیٹھے ہوئے ہیں بول رہے تھے۔

فرش سے شاعرش و ان طوفاں تھا بوج رنگ کا یاں میں آسمان تک موصفت کا باب تھا
اس شعر میں ترتیب بدل دی ہے۔ پہلے مصرع میں معشوق کی حالت دکھائی ہے، فرماتے ہیں: زمین سے آسمان تک وہاں خوشی کی سرواں کا ایک طوفان برپا تھا زکرت کیسے طوفان کا لفظ استعمال کیا ہے) وہاں زمین سے آسمان تک ہمارے جدنے کے لئے آگ بھری ہوئی تھی یعنی حسرت۔ نوس۔ رشک قییب۔ جوش محبت اضطراب دل یہ ساری جہ میں بہ کر تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ اپنی اور معشوق کی حالت کا تقابلی طریق سے مقطع تک جہنم و خوبی کے ساتھ کیا ہے اس کا نصف اہل مذاق اٹھا سکتے ہیں۔

ناگہماں میں رنگ کا خونابہ شیکانے لگا دل ذوق کا ورنہاخن سے لذت یافت
یہ شعر گریز کا ہے۔ اوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کو ختم کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ناگہماں یعنی یکایک میں طرح سے در میں اُننگ یہ ہو گئی کہ دوسری غزل اس زمین میں اور کھینی چاہئے۔ اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے اس رنگ سے خونابہ شیکانے کا تارہ دل

جو کہ دہشِ ناخن سے لذتِ یاب ہو چکا تھا۔

نالہ دل میں مٹا نہ اڑا اثرِ نایاب تھا تھا سچہ بزمِ وصلِ غیر کو بیتاب تھا
سینہ کالا دانہ جو اکثر بچوں پر سے نظر اُٹانے کی غرض سے جلا کر اُسکی دھونی دیتے ہیں
مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ رات کو نالہ دل میں مطلق اثر نہ تھا۔ ہمارا دوست بزمِ غیر میں تھا اور وہ نالہ
جو نہایت بیتاب تھا اور اپنے منظرِ اب کی وجہ سے بار بار زبان پر آجاتا تھا بزمِ غیر کیلئے کالا دانہ
بن گیا تھا یعنی بزمِ غیر کو نظر سے بے بچار اُٹھا۔ نالہ کی بے اثری بالکل چھوٹے خیال کے ساتھ
نئے الفاظ میں دکھائی گئی ہے۔

مقدمِ سیلابِ دل کیا نشاطِ آہنگ ہے خانہ عاشقِ مگر سازِ صدائے آب تھا
مطلب یہ ہے۔ سیلاب کے آنے سے میرا دل بہت ہی نشاط انگیز ہے شاید میرا گھر صدائے
آب سے ساز کا ہمسر ہو گیا تھا۔ ساز سے یہاں جلتی رنگ مراد ہے جو چینی کے سات پیالوں میں
پانی بھر کر ایک چھوٹی سے ذریعہ سے بجایا جاتا ہے۔

نازِ شایامِ خاکِ سترِ نشینی کیا کہوں پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
سنجاب کا پوسٹین بنا کر بیٹا جاتا ہے۔ اس پوسٹین کو بھی سنجاب کہتے ہیں۔ خاکی رنگ کا ہوتا ہے
فرماتے ہیں میں جس زمانہ میں خاکِ نشین تھا اُس زمانہ کے غور اور کجبر کا کیا حال بیان کروں،
اپنے خیال میں یہاں بھٹا تھا گو یا مسندِ سنجاب پر بیٹھا ہوا ہوں مطلب یہ ہے کہ فضاغت اور گوشہ
نشینی بھی بہت کم کبر و غور سے خالی ہوتی ہے۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ تارِ سانسے ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمِ تاب تھا
کچھ نہ کی یعنی ابھی بات نہ کی۔ ہماری مہٹی کردی جنونِ برسا سے یہاں مراد عشقِ ناز ہے
فرماتے ہیں عشقِ ناقص نے ہم کو جلوہٴ دوست سے فیضیاب نہ ہونے دیا ورنہ یہاں عیسیٰ دنیامیں
تو ایک ایک خاک کا ذرہ خورشیدِ عالمِ تاب بنا ہوا تھا۔ انہوں نے کہہ اکتا ہے فیض سے محروم
رہے اور تجلیاتِ نور الٰہی نہ دیکھ سکے۔

۱۰۰
قطعہ

نکدہ آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیر کی تھے کل ملک تیرا بھی دل ابرو دونا کا باب تھا
نرملتے ہیں۔ یہ آج نئی بات کیا ہے کہ حوا اپنے اسیروں سے بے پروا ہو گیا۔ کل تک تو تیرا
دل وفا اور محبت کا دروازہ بنا ہوا تھا۔

یا وکر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اک دیدہ بے خواب تھا
نراتے ہیں۔ وہ دن بھی تجھ کو یاد ہے کہ تیرے جان کا بہ حلقہ شکار کے تنہا رہنے میں یہ بے خواب
بنا ہوا تھا۔ حلقہ سو ام کی تشبیہ دیدہ بے خواب سے (جو عین نہ آنے کی وجہ سے ہر وقت کھلا رہتا
ہے) کس قدر ملینہ واقع ہوئی ہے۔

میں نے روکاراتِ غالب کو دگر نہ دیکھتے اُس کی سیل گریہ سے گردوں کھن سیلا تھا
نراتے ہیں۔ رات کو میں نے غالب کو رونے سے روک لیا۔ ورنہ تم تماشا دیکھنے کٹاں
کا سیل گریہ۔ سماں تک پہنچ کر آسمان کو ایک پانی کا ٹبلہ بنا دیتا۔

نکدہ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خون جگر و ولایتِ مترکانِ یار تھا
یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے۔ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مترکانِ یار
کی امانت تھی۔ اور اس لئے اُس کے ایک ایک قطرہ کا حساب ہی طرح دینا پڑے گا جس طرح انا
کا حساب دینا پڑتا ہے۔ (از یادگار غالب)

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو توڑا جو تو نے آئینہ تمثالِ دار تھا
نراتے ہیں تو نے آئینہ اس حالت میں توڑا ہے کہ جب تو اس میں اپنا منہ دیکھ رہا تھا
اور تیرا عکس اس میں نظر آ رہا تھا تو آئینہ میں اپنا تماشائی تھا اور میں یہ موقعِ عنایتِ مجھ کو تجھ کو دیکھ رہا تھا
میرے دل میں سینکڑوں رزویں۔ ہزاروں تماشائیں۔ لاکھوں خواہشیں جو ابھی تھیں تیرے
عروجِ حسن نے یہ گوارا نہ کیا کہ تو اپنا تماشائی آئینہ میں دیکھتا۔ تو نے آئینہ توڑ ڈالا اور اُس کے ٹوٹ جانے

سے میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ گویا آرزوؤں کا ایک آباد شہر تیرے آئینہ وژڈولنے سے برباد ہو گیا۔

گلیوں میں میری نفس کو کھینچے پھر گیا جاں داد وہ ہوا سے مہر بگڑا رہتا
 فرماتے ہیں میں نے رگنر عشق کی آرزو میں جان دی ہے۔ میرے اس بے مثل انجام
 کا انعام مجھ کو یہ ملنا چاہیے کہ لوگ میری نفس کو گلیوں میں کھینچے پھریں۔ نزاکت و لطافت معانی
 اس شعر میں یہ رکھی گئی ہے کہ عشق کی اس گلی کا پتہ نہیں دیا گیا جس کی آرزو میں جان دی گئی ہے
 صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میری نفس کو گلیوں میں کھینچے پھرو اور دل میں یہ خیال ہے کہ رفتہ رفتہ
 لوگ میری نفس کو عشق کی گلی میں بھی لے جائیں گے۔ یوں دلی مدعا حاصل ہو جائیگا۔ یہ
 قدرت معانی غالب ہی کے شعر میں پیدا ہوا کرتی ہے۔

موج سربست و فاکانہ پوچھ حال ہرزہ مثل جو ہر تیغ آید اڑھتا
 فرماتے ہیں۔ دشت و فاکانہ کیا حال مجھ سے پوچھتے ہو میں کیا بیان کروں خیر اتنا بتا دیتا ہوں
 دشت و فاکانہ سرب کی طرح دھوکا دینے والا ہے۔ جس طرح موج سرب پانی کا دھوکا
 دیکر طالب آب کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اسی طرح دشت و فاکانہ خیالی امید کے علاوہ کامیابی
 حاصل نہیں ہو سکتی اس کی مثال یہ پیش کی گئی کہ صحرائے وفا کی خاک کا ذرہ جو ہر تیغ کی مانند
 آبدار ہے۔ مدعا یہ ہے کہ وفاداری انجام میں عاشق کی جان لے لیتی ہے۔

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پرآب دیکھا تو کم ہوئے یہ غم روزگار تھا
 فرماتے ہیں۔ نا تجربہ کاری سے آوروں کی طرح ہم بھی غم عشق کو کم سمجھا کرتے تھے۔ مگر جب
 اس بلا میں مبتلا ہوئے تو حقیقت حال سے خبردار ہوئے یعنی غم عشق کم ہونے پر بھی ساری دنیا
 کے غم سے کچھ زیادہ ہی کلا۔

سبک و شوار ہے ہر کام کا آسان ہوتا آدمی کو بھی میسر نہیں اسناں ہوتا
 بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل جھوٹا

خیال ہے دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو میں انسان ہے اُس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا (از یادگار غالب)

گر یہ چاہے ہے خرابی سے کاشا کی درود یوار سے پیچھے ہے بیا باں ہونا
فرست ہیں۔ میرا گریہ چاہتا ہے کہ میرا گھر ڈھس جائے۔ گھر کے درود یوار سے صحرا بننا چاہتا
ہے یعنی ظاہر ہوتا ہے کہ اب یہ گھر کثرتِ آبِ گریہ سے گریہ بدن بن جائیگا۔ مگر یہ کی رعایت
کئے چکے کا لفظ ہے انقیاء مرزا صاحب کے ذمہ گوہر بار سے ٹپک گیا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔
واے دیوانگی شوق کہ ہر دم محب کو آپ جانا اُوھر اور آپ ہی حیراں آنا
فرماتے ہیں۔ دیوانگی شوق یعنی کثرتِ شوق نے مجھ کو ایسا خود رفتہ بنا دیا ہے کہ میں بار بار عشق
حقیقی کا شوقِ جہاں ہو کر اپنی خودی سے گزر جاتا ہوں اور نارسائی کی وجہ سے حیرن ہو کر
سوچا رہ جاتا ہوں کہ میں میں کہاں اور اس کا دیدار کہاں۔

جلوہ از لب کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
فرماتے ہیں جلوہ یار بار بار یہی کہتا ہے کہ مجھے دیکھ آئینہِ ولادی کا جو ہر مژگاں بنا چاہتا
ہے اس لئے کہ آئینہ کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس بیان میں مرزا صاحب نے جو خوبی رکھی
ہے وہ آئینہ سے زیادہ ردِ شبن ہے۔

عشرتِ قتلگاہِ اہل تمازت و چھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
فرماتے ہیں قتلگاہ میں اہل تمازت کی خوشی کا حال نہ چھو شمشیر یار کا عریاں ہونا شہادت
طلب لوگوں کے لئے عیدِ نظارہ ہے۔ شمشیر کو ہلال سے تشبیہ دی جاتی ہے، اور رمضان المبارک
کا چاند دیکھ کر ملو اور دیکھا کرتے ہیں یہاں شمشیر کا دیکھنا ہلالِ عید دیکھنے کے مقابل کہا گیا ہے۔
اور یہ معنی شعر کے الفاظ سے بغیر فکر و غور کے نکل آتے ہیں۔

لیگے خاک میں ہم دماغ تمناے نشاط تو ہوا و آپ بصرہ رنگِ گلستاں ہونا

فرماتے ہیں۔ ہم تو دلغ تمنائے نشاط قبر میں لے چلے اب تو ہوا در تنہائی کے عالم میں تنہا کو سو سو
طرح سے باغ کی مانند پھیلنا پھولنا نصیب ہو۔

عشرت پارہ دل زخم تمنا کھانا لذت لیش جگر غرق نمکداں ہوتا
یہ شعر دو سخت ہے اور دو سخت شعر میں اکثر فعل محذوف ہوتا ہے۔ اس خوبی کے ساتھ
دونوں مصرعوں کا کانٹے کی تول ٹلا ہوا مرزا ہی جیسے کامل فن کا کام ہے۔ معنی شعر کے یہ ہیں۔
دل کے ایک ایک پارچہ کا زخم تمنا کھانا باعثِ عشرت و شادمانی ہے اور زخم جگر کا نمکداں
میں سرتاپا ڈرا ہوا لذتِ عشقِ جاہل کرنے کی دلیل ہے۔

کی مکے قتل کے بعد اُسے جفا سے تو ہائے اس و دیشیاں کل پشیاں ہونا
دوسرے مصرع میں طنزاً بطور استعارہ کے دیرپشیاں کی جگہ زودپشیاں کہا گیا ہے۔ یہ
دیا ہی استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں اَنْذِرْهُمْ کی جگہ يَسْتَرْهُمْ بَعْدَ ابٍ اَلِيمٍ کہا گیا ہے۔
شعر کا مطلب یہ ہے۔ میرے قتل کے بعد اُس نے جفا و ظلم سے تو یہ کر لی۔ ہائے اس و دیشیاں جو جانے
والے کا پشیمان ہو جانا یعنی زندگی بھر تو اپنے ظلم سے پشیمان نہ ہوا اور قتل کے بعد جب تک قبضہ
اختیار سے باہر ہو گیا تو پشیمان ہوا۔ اس و دیشیاں کے حفظ کا خرابیاں نہیں ہو سکتا۔ یہ جدائی
کیفیت ہے تحریر میں نہیں آ سکتی۔ اہل مذاق ہی کچھ اس کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

حیف اُس چار گروہ کپڑے کی قسمت غالب جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریاں ہونا
ایسے بلند شعر کے بعد ایسا عالی رتبہ مقطع کہنا حضرت غالب ہی کا کام تھا۔ عالمِ وحشت میں
جنون کے ہاتھ سے گریبان دھجیاں ہوتا ہے۔ بھیر میں خود عاشق اپنے گریبان کا ایک ایک تار الگ
کرتا ہے۔ وٹل میں مشوق کی دست درازیاں گریبان عاشق کے پڑنے اُڑانی میں اور پھر وہ
گریبان کا کپڑا کتنا ہے صرف چار گروہ اس شخص کو تو دیکھئے۔

شبِ بزدوق ساقی خست ز اندازہ تھا تا محیط بادہ صورت خائے خمیازہ تھا
فرماتے ہیں۔ رات کو مشوق ساقی نے طول کھینچ کر خمار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ خمار نشہ کے

اتار کی حالت کو کہتے ہیں ”رست خیز اندازہ تھا“ یعنی قیامت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس طرح قیامت کے دن مرنے والوں سے اٹھیں گے سی طرح جو چیز جہاں رکھی ہوئی تھی وہ بلند ہوئی شروع ہو گئی یہاں تک کہ شراب کا احاطہ یعنی جس طرف میں شراب تھی وہ بھی اٹھنے کی طرح اپنے مقام سے اُبھرتا معلوم ہوتا تھا۔ یہ عہد ہے شراب خوار کو نشہ کے اتار کے وقت جمای اور انگڑائی آتی ہے۔ انگڑائی میں ہاتھ بلند ہو کر آپس میں مل جاتے ہیں درہمی شکل خیز کی ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ میری طرح انتظار ساقی میں شیشہ کے اندر شراب کو بھی، انگڑائی آنے لگی تھیں شراب میں خوش آ جانے کو انگڑائی سے تشبیہ دی ہے۔ جو مرزا صاحب کے نخل کی بلند پروازی کا ایک اوسنے نمونہ ہے۔

یکدم وحشت کے درس دفتر امکاں کھلا جاوہ جزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
فرماتے ہیں۔ ابھی میں نے ایک ہی قلم وحشت میں بڑھایا تھا کہ دفتر امکاں کا سبق میرے سامنے آ گیا اور مجھ کو معلوم ہو گیا کہ جاوہ دشت دو عالم کے اجزا کا شیرازہ تھا یعنی دو گویا بہان کی کیفیت مجھ پر منکشف ہو گئی۔

مارج دشت خرامیہائے سیلے کون ہے خانہ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا
یہ مشہور ہے کہ سیلی کئی بار کشمکش محبت قیس سے مجبور ہو کر سواری محل دشت مجنوں میں گئی ہے اور بخون غمازی سامان پایا پس عصمت مجنوں سے مل سکی۔ اس کے قریب ہر گز نہ گئی۔ مرزا صاحب اس قصہ کی طرف کنیت اشارہ کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ ”خانہ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا“ یعنی سیلی کا روکنے والا وہاں کوئی نہ تھا پھر کیا سبب نہ ہو کہ سیلی باوجود کشف عشق کے مجنوں تک نہ پہنچ سکی۔

پوچھ مت رسوائی انداز ستغنائے حسن دست مرہون خنار رہن غمازہ تھا
فرماتے ہیں جو لوگ خیر معشوق کو بناؤ سنگھ سے مستغنی بتاتے ہیں وہ گویا حسن کے ستغنا کو رسوا اور بدنام کرتے ہیں۔ دست معشوق ہندی کا منت پذیر ہے اور خنار معشوق غمازہ کا گرو

ہے مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کو خنکائی اور رخسار کو غارہ کی احتیاج ہے اور یہ دونوں چیزیں باعث آرائش حسن ہیں۔

نالہ دل نے دیے اوراقِ بختِ دل بیاو یادگارِ نالہ اکِ یوان بے شیرازہ تھا
اس شعر میں مرزا صاحب اپنے کمالِ شاعری کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ میر
دل کے ٹکڑے بھی میرے عالی مضامین جو نالہ دل کی صورت میں بے اختیار میری زبان
سے نکل گئے تھے۔ اُن کو میرے جوشِ طبیعت نے اوراقِ دل بنا کر ہوا پر اڑا دیا مطلب یہ ہے کہ میر
اچھوتے خیالات کو عالم میں پھیلا دیا۔ اب جو میں نے خیال کر کے دیکھا تو ”یادگارِ نالہ اکِ یوان
بے شیرازہ تھا“ یہ اشارہ اُس رُودِ دیوان کی طرف ہے۔ اسی مضمون کو قاری میں بھی ادا کیا ہے۔ وہ
بے ہے۔ اے بودیم بدیں مرتبہ اضی غالب شعر خود خواہش آں کر دکہ گردِ زین نا

دوستِ غمخواری میں میری سچی فرمائیں گے کیا زخمِ کئے بھرنے تلکِ ناخن نہ بڑھائیں گے کیا

فرماتے ہیں۔ دوستِ میری غمخواری میں کیا کوشش وسیع کریں گے (لفظ کیا) سے سوال پیدا
ہوتا ہے۔ اور اس میں مرزا صاحب نے لطف یہ رکھا ہے کہ ان کی کوشش کو سمجھ کر ان سے سوال
کیا ہے اور پھر اس سمجھے ہوئے معاملہ کو دوسرے مصرع میں خود ہی ظاہر کر دیا ہے یعنی ”زخم کے
بھرنے تلکِ ناخن نہ بڑھائیں گے کیا“ اس مطلب کو اس خوبی کے ساتھ بیان کرنا کہ دوستِ غمخواری میں
اس سے زیادہ کیا کوشش کریں گے کہ میرے ناخن کاٹ ڈالیں گے۔ میں زخم کو دیوانگی کی حالت
میں جو ناخن سے کر پتہ مارتا ہوں اور اچھا نہیں ہونے دیتا۔ ناخن کٹ جانے کے بعد زخم
کے جلد اچھا ہو جانے کی امید کی جاتی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے مقابلہ میں یہ سوچ رہا ہوں
کہ جب تلک زخم مندمل ہوگا میرے کئے ہوئے ناخن بھی بڑھ جائیں گے۔ اور اُن کی ساری کوشش
دم بھر میں بیکار ہو جائیگی۔ اس لئے کہ میں زخم کو پھر گہرا کروں گا۔

پے نیازِ جی سے گزری بندہ پروردِ کب تلک ہم کھینکے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
مشتوق سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔ بندہ پرورد آپ کی بے نیازی حد سے گزر گئی۔ کب تلک

یہی حالت رہی کہ ہم اپنا دل سرس کرینگے اور آپ بے پردائی سے "کیا" فرادینگے یعنی کیا کہا ہم نے نہیں سنا۔ دوسرا پہلو لفظ "کیا" سے طنز کا نکلتا ہے یعنی جو کچھ تو نے کہا وہ جھوٹ کا اس شعر میں "کیا" کا ایک پہلو ستفہار یہ ہے اور دوسرا پہلو طنز یہ۔

حسنت ناصح گرائیں دیدہ دل فرش راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا اس شعر سے مرزا صاحب کی شوخی طبع جو ان کا خاص اقتضائے طبیعت ہے ظاہر ہوتی ہے یعنی ایک مصرع میں حضرت ناصح کی یہ وقت و عزت ظاہر کیجاتی ہے کہ انکی تشریف آوری کے وقت دیدہ دل فرش راہ ہیں اور دوسرے مصرع میں ان کی فہمائش کو اس حقارت سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مجھے کیا سمجھا سکے ہیں۔ ان کی ہستی کیا ہے۔

آج داں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں غدی میرے قتل کرنے میں اب لائیں گے کیا یعنی قتل کرنے میں سب سے بڑا اندر یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس اس وقت تھوڑے ہیں اس غدر کو میں نے پہلے ہی سے مٹا دیا ہے کہ میں خود تھوڑا باندھ کر جاتا ہوں اور کفن بھی ساتھ باندھ لیا ہے کفن ساتھ باندھ لینے سے شعر میں یہ لطف پیدا ہو گیا کہ مجھ سے بڑھ کر اور کون سر فرزند ہو سکتا ہے کہ میں کفن باندھ کر آیا ہوں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھایوں سی جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا فوہی اس شعر میں یہ ہے کہ ناصح کو قید کرنا اوتا یا ہے۔ حالانکہ ناصح کسی کو قید نہیں کرتا۔ ترک عشق کی نصیحت کیا کرتا ہے۔ بار بار سمجھانے اور مجبور کر کے اپنے پاس تھانے کو مرزا صاحب قید کرنے سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ نہیں سکتے۔ ہم ناصح کے سامنے بھی اپنے خیالات میں متفرق رہتے ہیں۔

خانہ زاو زلف ہیں جسے گھبرا گینگے کیوں میں گرفتار و ناز و نیاز سے گھبراؤں گے کیا شعر دو بخت ہے دونوں مصرعے برابر کے واقعہ جو ہے میں مطلب صاف ہے زخمی سے اسے نہیں بھاگ سکتے کہ خانہ زاو زلف ہیں اور زندان سے یوں نہیں گھبرا سکتے کہ گرفتار و ناز و

پہلے ہی سے زنجیر زلف اور طوق و فارست و گردن میں آویزاں ہے۔ کیا ہے؟
 وہ اب اس محو رہ میں قحط غم الفت است۔ ہم نے یہ مانا کہ دلی میں ہیں کھائے کیا؟
 فرماتے ہیں۔ ہماری غذا تو غم الفت ہے۔ اور غم الفت اسی وقت نصیب ہوتا ہے
 جب انسان کسی پر عاشق ہو جائے۔ دلی میں غم الفت کا قحط ہے۔ یعنی یہاں اب ایسے مشوق
 نہیں ہیں جن سے الفت کی جائے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یا رہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا ہے
 مرنے پر اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہماری قسمت میں وصال یا رہ
 لکھا ہی نہیں ہے۔ اور اگر اور بھی زندہ رہتے تو بھی یہی انتظار ہوتا جو اب تک رہا۔ انتظار
 اس لئے رہا کہ دل عاشق کبھی وصل مشوق سے ناامید ہوتا ہی نہیں۔
 تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا
 مشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ تو جو ہم کو یہ الزام دیتا ہے کہ وعدہ وصل شکر
 تجھ کو مر جانا چاہئے تھا یہ ٹھیک ہے۔ مگر ہمارا زندہ رہنا اس وجہ سے ہوا کہ ہم نے تیرے وعدہ
 کو غلط سمجھا۔ اگر ہم اعتبار ہوتا تو ضرور شادی کر کے ہو جاتے۔

تری ناز کی سے جانا کہ بندہ حاتم عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
 فرماتے ہیں۔ تیری نزاکت مانع عہد شکنی ہے۔ اس نزاکت پر جو تو نے عہد توڑا تو ہم کو معلوم
 ہو گیا کہ عہد بودا بندہ حاتم تھا۔ اگر مضبوط بندہ تھا تو تجھ سے نہ ٹوٹ سکتا۔ کس غبی سے مشوق کو الزام
 عہد شکنی سے بری کیا ہے اور اپنے دل کو تسلی دی ہے۔

کوئی سیر دل سے پوچھے تیرے تیرے کشش فیلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
 تیرے کشش وہ تیرے کشش کے چوڑے وقت کمان پوری نہ کھینچی گئی ہو مشوق تیرے کشش
 ابھا ہوا دیکھ کر شرمانا اور فیل ہوتا ہے۔ اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ کیوں میرا تیرا اس کجگر سے پار
 نہ ہوا میرا صاحب اس کی شرمندگی کو ان لفظوں سے مٹاتے ہیں کہ تیرے تیرے کشش کو

کوئی میرے دل سے پوچھے "قاعدہ ہے تیرے زخم میں رہ جاتے سے بہ نسبت اُسکے پار ہو جانے کے
 زخمی کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور مشوق اسی واسطے تیرا تلوار کا دار کرتا ہے کہ عاشق کو زیادہ
 ایذا پہنچے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوستِ صحیح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی ننگسار ہوتا
 دوستوں کی شکایت میں فرماتے ہیں۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ ہر دوستِ ناصح بنکر ترکِ عشق کی
 فہمائش کرتا ہے۔ اگر دوستی کا دھوئے تھا تو میرے دردِ عشق کا علاج کیا ہوتا اور رفتِ غم کی
 تدبیر سوچی ہوتی۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا
 فرماتے ہیں۔ تم جس کو غم سمجھتے ہو یہ اگر شرار ہوتا تو پھر کی رگوں سے بھی اس طرح لہو جاری
 ہو جاتا کہ پھر کبھی نہ تھمتا۔ مگر وہ شر نہیں بلکہ شر سے زیادہ جلاسنے والی شے ہے اُس کو انسان
 ہی برداشت کر سکتا ہے پتھر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس تکلیف کو سہہ سکتا۔

غم اگرچہ جانگسں ہے یہ کہاں ہیں کہ دل ہے غمِ عشق گرنے ہوتا غمِ روزگار ہوتا
 اول مصرع کا دوسرا حصہ "یہ کہاں ہیں کہ دل ہے" یہ ثابت کر رہا ہے کہ دل موردِ آفات اور
 مَظہَبِ بے آلام پیدا کیا گیا ہے یعنی دل کیلئے غم کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر غمِ عشق
 نہ ہوتا تو غمِ روزگار ہوتا غمِ عشق میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ جانگسں بھی ثابت ہوا۔

کہوں کس سے کہ کیا پوچھ سب غمِ بری بلایے مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
 فرماتے ہیں شبِ غم کی کیا حقیقت بیان کروں۔ وہ موت سے زیادہ تکلیف دینے والی بلا
 ہے مزاجس کو زمانہ میں کوئی انسان پسند نہیں کرتا ساری دنیا جس سے گھبراتی اور ڈرتی ہے
 اس تکلیفِ شبِ غم کے مقابلہ میں میرے لئے وہ بھی اچھا تھا۔ شبِ غم میں تو ہزاروں بار مجھے
 مرنا پڑتا ہے موت کی ایذا اٹھاتا ہوں اور پھر نہیں مرنے۔ شبِ غم کو موت پر کس فی سے ترجیح دی ہو۔
 پہلے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں غرقِ دریا نہ کہیں خازنہ اٹھاتا نہ کہیں مزار ہوتا

فرماتے ہیں، ہم مرنے کے بعد ستم بہ وجود ہی رہے۔ اگر ہم غمگین رہے تو نہ ہمارا
خزانہ اٹھنا نہ مزار کا نشان باقی رہتا۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ گناہ ہے وہ دیکھتا جو دہائی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دُچار ہوتا
معتوق حقیقی کی بنگائی کا ثبوت مرزا صاحب نے اُسکے دو چار نہ ہونے سے دیا ہے یعنی اگر
کہتا نہ ہوتا اور دہائی کی ذرا سی بھی جھلک ہوتی تو ضرور کہیں نہ کہیں نظر آ جاتا۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ پاوہ خوار ہوتا
یہ دونوں باتیں مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ایک سلوبِ بیاں دوسرے تصوف
کا رنگ حضرت استادِ مولانا حالی مرحوم نے یا رنگار غالب میں اس مقطع پر یہ لطیفہ تحریر فرمایا ہے کہ جس
وقت یہ غزل بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سن کر کہا بھی تم توجب بھی ایسا نہ سمجھتے
مرزا صاحب نے فرمایا حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی
ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

ہو جس کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرزا تو جینے کا مزار کیا
یہاں نشاط کے معنی اُنگ کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کام کرنے کی اُنگ جو دلوں میں پیدا
ہوگئی ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ دنیا میں ہے کا زمانہ مورا ہے اگر زمانہ ہوتا تو جینے کا کچھ مزار
نہ تھا۔ زمانہ کی چیل چیل کا محرک ہی خیال ہے کہ موت سر پہ کھڑی ہوئی ہے جو کچھ کرنا ہے جلد انجام
دے لو۔ قاعدہ ہے جس قدر فرصت زیادہ ہوتی ہے آدمی اتنا ہی تاہل سے کام انجام دیتا ہے بیشک
سطح لکھا ہے۔

تجربہ پیشگی سے مدد کیا کہاں تک لے سہرا پانا ز کیا کیا
فرماتے ہیں۔ جب دیکھو تم تجربہ کو کام میں لاتے ہو۔ آخر تمہارا ولی منشا کیا ہے یعنی ہر کام
پر تم ”کیا“ کہہ دیتے ہو۔ کوئی بات سننے اور سمجھنے ہی نہیں ہو۔
نواز شہا کے سچا دیکھتا ہوں شکایت ہائے رنگیں کا کلا کیا

یعنی رقیب پر تمہاری رعایتیں بے محل دیکھتے ہوں۔ اور جب محبت بھرے الفاظ میں
تم سے اس کا کھاتہ ہوں تو تم مجھ سے الٹی شکایت کرنے لگتے ہو۔ یہ کیا بات ہے کچھ تاؤ تو سہی۔

نگاہ بے محاسبہ چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکین آ کر کیا

نگاہ بے محاسبہ بے تکلف اور بے نیاب ہو کر دیکھنا۔ فرماتے ہیں۔ مجھ سے آنکھیں چار کرو۔ میں
تمہاری نگاہ کی تاب نہ کر کر پ جاؤں گا۔ تم تغافل سے میرے صبر و ہمت پر کڑوا دیتے ہو۔
برائی سے گھبرانے اور بے قرار ہونے والا نہیں ہوں۔

فروغ شعلہ خس یک نفس ہے ہوس کو پاس ناموس و فاکیا

فرماتے ہیں۔ رقیب کی جھوٹی محبت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے شعلہ خس دم بھر میں دشنی
دیکر ٹھہ جاتا ہے۔ رقیب کو ناموس و وفا کا پاس خاک بھی نہیں ہے۔ اسکی محبت چاروں کی
چاندنی ہے ہمیشہ قائم نہیں۔ ہے گی عشق ناقص کو شعلہ خس سے تشبیہ یعنی ایک سیاہی چھوٹا
خیال ہے جیسا مرزا صاحب کا اکثر کلام۔

نفس موج محیطہ بخودی ہے تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

فرماتے ہیں۔ ہم تو مست الست ہیں۔ ہمارا برسان ایک موج بخودی ہے۔ ہمیں نہ
ساقی کی ضرورت نہ شراب کی احتیاج ہم کیوں تغافل ساقی کا گلا کریں۔ دوسرے معنی اس شعر
میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہم اپنے حال میں مست ہیں ہمیں دنیا کے بہت و نیست کا کیا غم۔

دامع عطر پیرا ہن نہیں ہے غم آوارگی ہائے صبا کیا

فرماتے ہیں۔ ہم تو یوئے یار کے سو گئے والے ہیں۔ ہمارا دافع عطر پیرا ہن یار کی خوشبو
جس پر غیروں نے عطر ملا ہے پسند نہیں کرتا صبا اگر رقیب کے کوچے سے عطر پیرا ہن کی خوشبو لیکرتی ہے
تو ہم اس کو کیا کریں۔ آوارگی کا لفظ بار بار ہے کہ صبا کو چہ رقیب سے بکراتی ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازنا البحر ہم اس کے میں ہمارا پوچھنا کیا

فرماتے ہیں۔ قطرہ جو ایک جزو ضعیف دریا کا ہے جیسا کہ دل سے یہ آواز نکلتی ہے کہ

میں دریا ہوں اور وہ دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے تو ہمارا کیا پوچھنا ہے۔ ہم تو اپنے مبدے کے ساتھ عینیت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ یعنی ہم تو قطرہ کے مقابلہ میں ایک انسان کا جسم ہیں۔ ہمارا سر یا تو اسکی ذات کا ایک بڑا حصہ ہے۔

مخایا کیا ہے میں صنم ادھر دیکھ شہیدان نگہ کا خون بہسا کیا
 فرماتے ہیں شہیدان نگاہ کا خون بہا لیا جانا دستوں کے غلات ہے۔ پھر لڑکیوں ڈرتا ہے
 بے خوف ہو کر میری طرف دیکھ اگر میں مرجاؤں گا تو اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ تجھے میری قتل
 کی باز پرس نہ ہوگی جس خوبی اور ندرت کے ساتھ مرزا صاحب نے اس مضمون کو
 ادا کیا ہے وہ ظاہر ہے۔

سُن لے غارتگر حبس و فاسن شکست قیمتِ دل کی صدا کیا
 فرماتے ہیں حبس و فاسن میرے دل میں تھی وہ گویا قیمتِ دل تھی یعنی ہر دل سی و
 سے قیمتی سمجھا جاتا تھا کہ اس میں حبس و فاسن تونے دل کو توڑ کر سکوتِ غارت کر دیا تو اب تو میری سُن
 اور مکر کہنا ہوں کہ میری بات سُن شکستِ دل کی صدا نہ ہوا کرتا ہے جس سے تو ڈرتا ہے اور سننا
 نہیں چاہتا۔ تو خوف نہ کر تونے دل میں توڑا بلکہ قیمتِ دل توڑی ہے۔ قیمتِ دل کی شکستِ دل کی
 صدا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں مجھے ڈرنا نہ چاہئے۔

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ شکیبِ خاطر عاشق بھلا کیا
 فرماتے ہیں۔ تو جو ستم یا تافل یا کلیتِ فراق سے بچھے ٹڑپانا اور بے چین کرنا چاہتا ہے میں
 نے کب تجھ سے جگر داری یعنی جادری اور مضبوطی کا دعویٰ کیا ہے۔ بھلا دل عاشق کا صبر ہی کیا ایک
 ذرا سے ناز و انداز میں تو اسکو بے صبر بنا سکتا ہے۔

یہ قاتل وعدہ صبر آزمائیوں یہ کائناتِ فرستہ طاقتِ رُپا کیا
 قاتل وعدہ صبر آزمائی صفت ہے۔ اور کائناتِ فرستہ طاقتِ رُپا کی مطلب یہ ہے کہ مجھ سے وعدہ
 صبر آزمائیوں کیا جاتا ہے اور اسی پہلے مصرعہ کا مضمون دوسرے مصرعہ میں دوسرے لفظوں کے ساتھ

اُلت دیا ہے بندش الفاظ قابلِ رد ہے۔

بلائے جان سے غالب اسکی ہر بات عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

اس مقطع میں مرزا صاحب نے کیا کو حرف علت قرار دیا ہے مطلب یہ ہے۔ اسے غالب اس کی ہر بات کی ہر ایک بات جانتا ہے خواہ عبارت ہو، خواہ اشارت واداد ہو، جان لینے میں یہ سب کی سب مساوات کا درجہ رکھتی ہیں۔

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسائہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہمسائے کوئی پیدا نہ ہوا

در خورِ فارسی محاورہ ہے یعنی لائق و سزاوار ہونا ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ آپ غیر پر تو ظلم و ستم کرتے ہی نہیں قہر و غضب کے لئے ہم ہی مخصوص ہو گئے ہیں۔ پھر اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمسائے کوئی دوسرا آپ کا چاہئے والا پیدا نہیں ہوا تو اس میں جھوٹ کیا ہے۔ آپ ہمارے قول کو کیوں نہیں تسلیم کر لیتے۔

بندگی میں بھی وہ آزاد ہو خود میں ہیں کہ ہم اُلتے پھر آئے در کعبہ اگر روانہ ہوا

خود میں و خود پسندی دونوں لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہیں یعنی دوسرے کو اپنے سے کم سمجھنا مگر یہاں مرزا صاحب نے خود میں کے معنی خود داری کے لئے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ عبادتِ الہی میں بھی اپنے کو ایسا لئے دئے رکھتے ہیں کہ اگر ہم کو در کعبہ کھلا ہوا نہیں ملتا تو کنڈی کھٹکھا کر دروازہ کھلوانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے واپس چلے آتے ہیں حقیقتِ حال یہ ہے کہ مرزا صاحب بندگی میں خود داری کا اکیلا علی نمونہ تھے۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکنائی کا۔ ویر کوئی بت آئینہ سیمائے ہوا

یعنی تیرا تیرے مقابل کوئی نہ بن سکا۔ دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔

کم نہیں تیرا ہمت نامی چشمِ خراباں تیرا بیمار بڑا کیا ہے گرا چھانہ ہوا

چشمِ معنوی کو نگہ بیمار واد چشمِ بیمار کہتے ہیں۔ فرستے ہیں۔ میں بھی تیرے عشق کا بیمار ہوں۔ اس لئے مجھے بھی مہادی کا فخر حاصل ہو گیا ہے۔ اگر میں چھانہ ہوا تو اس میں بڑائی کی کیا بات ہے۔ تیری

آئیکھ کا ہتمام مشہور ہو جاؤں گا۔

سینہ کا داغ ہے وہ مالہ کہ لب تک نہ گیا خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ وہ مالہ جو بے اثری اور نارسائی کی وجہ سے لب تک نہیں آیا ہے۔ میرے سینہ کا داغ بن کر رہ گیا ہے یعنی اس نے میرے جوش عشق کو دھتہ لگا دیا۔ اسکی تمثیل پیش کرتے ہیں کہ جس قطرہ میں دریا بننے کی قابلیت نہیں ہوتی وہ خاک میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ وہ ایذا ہے محبت جو کسی کو نہ ملی میرے لئے مخصوص کر دی گئی ہے اور وہ فتنہ قیامت جو کبھی برپا نہ ہوا میرے کام میں مصروف ہے یعنی میرے واسطے تکلیفیں اور مصیبتیں جمع کر رہا ہے۔

ہرگز موم و دم ذکر نہ ٹیکے خوناب حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

فرماتے ہیں جس طرح داستان گواہ حمزہ کی داستان بیان کرتا ہے اور سننے والے خوشی کے ساتھ سنتے رہتے ہیں عشق کا ذکر ایسا بے اثر نہیں ہے۔ اس کے بیان کرنے والے کے رونگٹے رز گئے سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ٹیکے خوناب میں ہتھام اقرار ہے یعنی ضرور خوناب ٹپکے۔

قطرہ میں جلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں گل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بیٹا نہ ہوا

دیدہ بیٹا یعنی نگاہ عارف کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ قطرہ دجلہ اور جزو میں گل نظر نہ آجائے۔ اس مصرعہ اولیٰ میں بھی ہتھام اقرار ہے۔ جس خوبی کے ساتھ یہ مطلع مفہوم مرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں ادا کیا ہے حد توصیف سے باہر ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پرشے دیکھے مہم بھی گئے تھے پتہ نشا نہ ہوا

مرزا صاحب اپنی عادت کے موافق اس مقطع میں بھی شوخی برت گئے۔ ایک معمولی مضمون کو نرالے پلوئے الفاظ میں ادا کیا ہے مطلب صرف اتنا ہے کہ معشوق نے غالب کا امتحان عشق لینے کے لئے ایک دن مقرر کیا تھا۔ اس کو یوں بیان فرمایا ہے کہ شہر میں یہ خبر مشہور تھی

آن میرزا ناب کے پڑوساڑیئے۔۔۔ مدتہ ثانی یہ دیکھنے مشفق کے کوہیہ میں جیت ہوئے
 فریاد تھاموئی رہا۔۔۔ بد متون عشق دوز میں بغیر متون دے کا مینا فیمل ہو گئی۔
 مسدود دہنوں میں سے بے شریاں کہ ہے سرخیہ ہر گاہ بہشت خار پنا
 فرما تیں۔۔۔ سے مدد جنوں دراحت میں دور اندر کا دے دے رخت سے گرسا ہے
 سرزد میں کہ مجنون پہنچی بہشت سے گئے ہیں۔۔۔ زمین یہاں ہے۔۔۔ مجنون کا پاس میں آجوں
 رستہ تھے در مجنون ان کی کھوں سے تکی کی کھوں کو تشبیہ کرتا تھا۔۔۔ مرزا صاحب چنے جنوں
 کی بات کو مجنون سے کامل ترقی ہر گستا میں دریا کہتے ہیں کہ سرخیہ ہر گاہ بہشت خار
 ہے یعنی وحشت کا وہ میں آج بھی آجی باور کو بھی میں پشت چھوڑا۔۔۔ اور۔۔۔ دروہی عجیب
 بہشت حاصل نہیں کر سکتا۔

چنے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا۔۔۔ بخون غشیلن مذک دعویٰ پارسائی کا
 فرستے ہیں۔۔۔ میں جو پتہ گز میں کے سبب بارگاہی میں شربت جس نازک دہر کا وجود
 میرے گنہوں کے مدد و ساعزے سے گستا کے سنت دارم مجھ پر فرماے۔۔۔ سب میں ان مجنوں
 کے ہرے میں شرم نارسائی کے تحفہ پیش کرتے ہیں یعنی وجود سے گنہوں کے بھی جو کہ
 ان حشر پہرے دس میں خون ہو گئی ہیں۔۔۔ دہر ہا حشر ہیں۔۔۔ غنہ کے رختیں پارسائی
 کا دھوے بھی پیش کرتے ہوں۔

نہ چوین تماشہ دست دیو بیوفائی کا۔۔۔ بہر لعل شکر ذابت ہے دعویٰ پارسائی کا
 حسن تماشہ دوست سے یہ سب ہے کہ جس حسن کے جلوے آواز سے اوریتے پتے ہیں شکر
 استہیں اور دیکھنے سے یہ بکھتے ہیں کہ ہر دوست۔۔۔ ہر رنگ۔۔۔ ہر شیں پنا ہو درخشاں
 ہے در بھر کیں ہو وہ دیش بھی جگہ تو مہر کرتا دین جہاں میں رہے اذن کا۔۔۔ مہر بھی نہ نہیں جاتا
 دیکھنے اور کی سبب دس نگہ میں اس میں مستون پر مہر کی کرتی ہیں۔۔۔ نہ جہاں میں کہ
 ہم آگے پردہ تک بھی دسائی حاصل نہیں کر سکتے۔۔۔ یعنی یہاں تک پارسائی ہے کہ میرزا کے

قرب تک کسی نظر کو رسائی حاصل نہیں ہے۔ پھر دعویٰ پارسائی کی صداقت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃ حسن دے اے جلوہ پیش کہ مہر آسا چراغ خانہ درویش ہو کا سا گدائی کا
مشتوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زکوٰۃ حسن دے یعنی حسن
کا چالیسواں حصہ بھی سال بھر میں اگر مجھ کو مل جائے تو آفتاب کی طرح کا سہ گدائی روشن ہو کر
چراغ خانہ درویش بن جائے مطلب یہ ہے کہ میرے دل کو اپنے عرفان سے آفتاب کی طرح
روشن اور منور کرے۔

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر رہا مانند خون بے گناہ حق آشنائی کا
فرماتے ہیں۔ تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھا اس لئے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی
گردن پر نہ لے۔ مگر اس صورت میں تیری گردن پر بجائے خون بے گناہ حق آشنائی رہ گیا۔
(از یادگار غالب)

تتنائے زبان مجھ سپاس بے زبانی ہے شاجس سے تھا فاضلہ شکوہ بیت و پانی کا
فرماتے ہیں۔ میری تنائی تھی کہ میں تجھ سے ایسی زبان مانگوں جس سے تیری درگاہ میں اپنا
عوض حال کر سکوں مگر اس درخواست یا دعا سے پہلے میری زبان مجھ سپاس بے زبانی ہو گئی
یعنی مجھ کو وہ خاص زبان نہ ملنے سے یہ فائدہ پہنچا کہ میں تیری درگاہ میں شکوہ بے دست و پائی یعنی
بے سرو سامانی کا کلا پیش ہی نہ کر سکا اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھ کو بجائے زبان شکایت کے
درجہ تسلیم و رضا عطا ہو گیا۔

وہی اک بات ہے جو نفس دان نہ کہت گل ہے چمن کا جلوہ باعث ہے مری نگیں زواری کا
فرماتے ہیں۔ میرے نفس اور نہ کہت گل میں کچھ فرق نہیں ہے۔ وہی اک بات ہے یعنی ان دونوں
کو مساوات کا درجہ حاصل ہے اور اس کا باعث جلوہ چمن بفضل بہار اور جوش گل ہے۔ چمن میں
جوش گل سے نہمت گل پیدا ہوتی ہے اور میں چمن کی بہار دیکھ کر نگیں زواری کے ساتھ غزل سرائی

شروع کر دیا ہیں۔

دہاں ہر شب بیخوارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک یوفا چرچا ہے تیری یونانی کا
مشتوق سے فرماتے ہیں۔ اسے یوفا اب تو تیری یونانی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا ہے۔ تو
یونانی چھوڑ دے اور اس کا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ زمانہ بھر کے مشتوق تھکاوٹ سے دیتے ہیں بیخوارہ
کے معنی جیسے اور تشنہ کے ہیں۔ اور مشتوق کی صفت ہے دہانی ہوتی ہے اس لئے وہن کو عدم سے
تشبیہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے کو کتیری یونانی کا چرچا ایک مشتوق سے لیکر دوسرے مشتوق تک۔ اور
دوسرے سے لیکر ہزار ہا مشتوق تک پہنچا ہے۔ زنجیرِ رسوائی قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ عدم میں نظر
انسان کی ساری عادتیں بدل جاتی ہیں مگر تیری یونانی کی عادت عدم تک پہنچ کر بھی نہ ہوتی۔

نہ نامہ کو تا طویل غالب مختصر لکھ دے
کہ دستِ پنج ہوں عرضِ تہمائے جدائی کا
فرماتے ہیں۔ سے ماتب تو جو طرح طرح کی شکایتیں اور قسم قسم کے نکلے ٹکڑے، کوئی اور
راہ ہے اس سے کیا فائدہ۔ مختصر سا فقرہ لکھ دے کہ تہمائے جدائی اور آوازِ فراق بیان کرنے کی حسرت
دل میں رکھتا ہوں۔ آپ تو تشریف نہ کریا مجھ کو بلا کر میری مصیبت کے واقعات میری زبان
سُن لیجئے۔

۲۰

گرتا اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
تے کلفتِ داغِ مہرِ دہاں ہو جائیگا
فرماتے ہیں۔ اگر شبِ فرقت کا رنگِ غم بیان نہ کیا جائیگا اور غم دل لگا کر اُس کو نہ سُنیجے گا
تو بڑی قیامت یہ پیدا ہو جائیگی کہ چاند میں جو داغ ہے وہ میرا مہر دہاں ہو جائیگا یعنی اس
طرح چاند کے داغ کو سارا زمانہ دیکھتا ہے اسی طرح تمہاری جدائی کی کلیفوں کا حال و گوں پہ
کھل جائیگا کو یا میری خوشی زبان بکرا فاشائے رازِ محبت کر دے گی اور پھر تمہارا نام ہو جائے گا
اس سے بہتر یہ ہے کہ میری مصیبت کا حال تم سُن لو تاکہ میرا دل غم کے بوجھ سے ٹپکا ہو جائے
دہاں کی جڑ اس نکل جائیگی تو رازِ چھپا رہے گا۔

زہرہ گرا یہی شاہِ ہجر میں جوتا ہے آب
پر تو قوتِ آبِ سسلیں غامناں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ اگر یہی تاعدہ قرار پا گیا ہے کہ شام سحر کی سختیاں بچوں کو بانی کر دیتی ہیں اور خون
سے آتشوں سے رُلا دیتی ہیں تو عجب ہیں کہ چاندنی سیل، آب بن کر میرے گھر کے در و دیوار کو
بہا لے جائے۔

سے تولوں سوتے میں سکے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
جوشِ عشق و رعبِ سن کی تصویر ایسے سادے اور صادق لفظوں میں کھینچی ہے کہ تابل
ستائش ہے۔ مرزا صاحب لب و مختار کے بوسہ کا شوق بوجہ ادبِ عشق ظاہر نہیں کرتے بلکہ
یہ کہتے ہیں کہ پاؤں کا بوسہ تقاضائے دل سے مجبور ہو کر سونے کی حالت میں لے تولوں مگر خوف
اس بات کا ہے کہ مجھ سے بدگماں ہو جائیگا۔ مطلب یہ ہے کہ میری پاک محبت کا یقین اُس کے
دل سے مٹ جائیگا اور مجھ کو بواہوس خیال کر لیگا۔

دل کی ہم سرفِ دنیا تجھے تھے کیا معلوم تھا یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائیگا
فرماتے ہیں ہم تو تجھے ہوئے تھے کہ دل کو وفاداریوں کے کام میں صرف کرینگے اور زندگی
بھر وفاداری میں ہمارا ساتھ دیگا۔ اس کی خبر نہ تھی کہ یہ پہلے ہی معشوق کے امتحان کی نذر
ہو جائیگا۔ اور ایک ہی نگاہ میں ایسا کارکن، کار گزار اور مددگار کام آ جائیگا۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا
عجیب بیخِ شعر کہا ہے، فرماتے ہیں۔ ایک عالم کے دل میں تیری جگہ ہے۔ ساری دنیا تجھ سے
محبت کرتی ہے۔ ہر کس و اکس تجھ پر فریفتہ ہے۔ اگر تو ہم سے راضی ہو گیا تو سارا زمانہ ہم پر مہربان
ہو جائیگا۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تسلیمِ مستبط شدہ خس میں صبیحے خونِ گ میں تنہاں ہو جائیگا
فرماتے ہیں تیری نگاہ و قہر و غضب، سوائی ادب و نامی کے خون سے، اگر اسی طرح تسلیم نہ
و آہ کی تعلیم دیتی رہی تو کیا عجب ہے کہ شدہ آتش گھاس کے تنکوں میں اسی طرح چھپ جائے
جس طرح خونِ رگوں میں پوشیدہ ہے۔

میں مجھ کو نہ ایجا ورت میرے حال پر
 برکٹ ترا یک چشم خوفناک ہو جائیگا
 زمانے میں عشق کے غم ورنج سے میری حالت ایسی زار و نزار ہو گئی ہے کہ جو مجھے دیکھتے
 سے سکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اگر تو مجھ کو اپنے ساتھ یاغ میں لے
 جائیگا تو گلاب کے تر و تازہ پھول چشم خوفناک بن کر میرے حال پر خون کے آنسو بہائیں گے اس
 کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سیر یاغ میں بجائے طرب و نشاط تجھ کو بے لطفی حاصل ہوگی۔
 وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
 ابلک تو یہ توقع ہے کہ وہاں ہو جائیگا
 زمانے میں۔ میں تیرے ظلم بجا صرف اس توقع پر اٹھ رہا ہوں کہ محشر کے دن میرا تیرا
 انصاف خدا کے سامنے ہو جائیگا اور مجھے میری منظوری کی دلدل جائیگی۔ اگر خدا خود مستحق
 بھی انصاف نہ ہوا تو پھر مجھ پر قیامت گزر جائیگی۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی سہہ دانا مسد
 دوستی ناواں کی چچی کا زیاں ہو جائیگا
 مثل مستو ہے۔۔۔ دن کی دوستی جی کا زیاں۔ زمانے میں۔ اسے سدا اس دوستی میں کیا
 فائدہ ہے۔ آخر تو عقل مند ہے اس بات کو اپنے دل میں سوچ کہ نادان کی دوستی میں جان کا
 ضرر ہوا کرتا ہے۔ لطف اس شعر میں یہ پیدا کیا گیا ہے کہ دل کو فریب دیکر عشق سے باز نہ
 رکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بات عاشق کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جان کے خوف سے
 عشق کو ترک کر دے۔

غزل

ورد منت کش دوانہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا بڑا نہ ہوا
 زمانے میں۔ میرا درد عشق دوا سے مست نہ سکا اور میں چھانہ ہو سکا۔ میرے لئے یہ کچھ
 بڑی بات نہیں ہوئی۔ اگر میں اچھا ہو جاتا تو میرے درد عشق کو دوا کا منت پذیر ہونا پڑتا اور مجھ
 کو کسی کا احسان اٹھانا منظور نہ تھا۔ اس لئے اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہوا۔
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا بگلا نہ ہوا
 زمانے میں فیصلہ کے وقت رقیبوں کو کیوں جمع کرتے ہو۔ جبکہ ابھارا تھا۔ ۵۰

صرف جھلا اور شکایت کرنے کا اس کو تماشہ بنانے سے کیا فائدہ۔ یہ بات ہم کو کسی طرح گوارہ نہیں
 کہ ہماری شکایت ہمارے منہ سے ہائے رقیب نہیں اور ہماری ہاں میں ہاں ملائیں۔
 ہم کہاں قسمت آزمانے جایں تو ہی جب خنجر آزمائے ہوا
 فرماتے ہیں۔ ہائے لے اور ایسی کوئی جگہ ہے جہاں جا کر آرزوئے قتل پوری کریں۔
 جب تو ہی خنجر کا امتحان لینے سے ہچکچاتا ہے۔

کتے شیریں میت کے لب کہ قریب گالیاں کھاکے بے مزار نہ ہوا
 شیریں دہی معشوق کی تعریف پر دعویٰ کس قدر متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں
 کہ تیرے ہونٹھے ایسے شیریں ہیں کہ رقیب جیسا بٹوالہوس بھی گالیاں کھا کر پی گیا اور بد مزار
 نہ ہوا۔ حالانکہ چاشنی عشق سے محروم تھا مگر تلخی دشتنام اُس کو بھی گوارا ہو گئی۔

ہے خیر گرم اُن کے آنے کی، آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
 شوق ہمان نوازی کا یہ جوش کہ خبر آمد معشوق مسنکر بے اختیار آنکھیں بچھا دینے کو جی
 چاہتا تھا اور بے سرو سامانی کی یہ کیفیت کہ آج گھر میں بوریا بھی نہیں رہا۔ کل تک تو تھا بھی
 اب اُن کی تشریف آوری کے خیال سے مرزا صاحب دل ہی دل میں شرائے طاعتے ہیں
 کہ ہائے وہ آئینکے تو میری بے سرو سامانی کو دیکھ کر دل میں کیا خیال کریں گے۔

کیا وہ غمزدگی خدا کی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
 مرزا صاحب نے اس شعر میں عجب شوخی برتی ہے جو کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ شعرا
 اس کے بعد کا شعر دونوں بیت الغزل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میری بندگی کیا غمزدگی خدا کی تھی
 کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ
 عبودیت ہے۔ بندگی پر غمزدگی خدا کی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے (انبا دگا بغالب)

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
 فرماتے ہیں۔ ہم نے زندگی بھر ایک ہی کام کیا ہے کہ جان دیدی لیکن پھر کچھ سوچ کر سمجھے

وہ جان تو اتنی کی دی ہوئی تھی۔ اس کی امانت اس کو واپس کر دی۔ اس میں کوئی خرابی
بات ہے۔ حق تو یہ ہے بھی سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا حق ہم سے کچھ بھی ادا نہ ہو سکا۔ اس
خیال سے لفظ اس بن بن کا کیا کہنا ہے۔

زخم گردب گیا لہو نہ تھا کام گردگ گیا روانہ ہوا
فرماتے ہیں زخم اگر دب بھی گیا یہی س و کٹ دگی بانڈ دینے سے مٹ بھی گئی ورنہ
زخم باہم پیوستہ ہو بھی گئے تو بھی خون بند نہ ہوا۔ مگر اس کے خلاف کام رُک گیا تو وہ روانہ ہو۔
قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ جس طرح زخم دب جانے سے لہو جاری رہا۔ اسی طرح کام رُک جانے پر بھی
ہوتا اپنی نفسی کا نظارہ کس دگی سے کیا ہے۔ کتنے بڑے مضمون کو درمصرعوں میں ادا کیا ہے۔
رہزنی ہے کہ دستیابی ہے لیکے دل دستاں روانہ ہوا

فرماتے ہیں ہم تو شرک شرک چلے جاتے تھے مستحق نے ہم سے دل چین لیا ستم۔
ستم یہ کہ دل بیتے ہی غائب ہو گیا۔ دستیابی کا قاعدہ یہ ہے کہ ٹھہر کر دیکھ لیا ہم کو اپنا، مرنشٹن
گھر کا پتہ۔ طے کا وقت بتاتا، اس نے تو یہ کچھ بھی نہ کیا۔ دل لیتے ہی چوروں کی حرکت جھاگ
اب ہمیں کون تیرے کہ یہ رہزنی تھی یا دستیابی۔ اس شعر میں مولہ قانیہ نے اور بھی طے یہ لکھ دیا ہے۔
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالب غزل سر نہ ہوا

نہ گیا ہے کہ یہ مدت عرصہ میں کسی تہذیب کے مکان پر مستند ہو۔ قما۔ مرزا صاحب نے
طرح میں غزل نہ لکھی تھی۔ حسب مصرعہ مباحثہ کی حد تک پہنچ گیا تو یہ غیر طرح غزل پڑھ دی۔
پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا۔

بگدا ہے شوق کو دلیں بھی تنگی مباح کا گھر میں مجھ ہوا اضطراب دریا کا
مرزا صاحب تنجب کے لئے اس فرماتے ہیں شوق کو تنگی جا کا گدا دل میں بھی ہے۔ "بھی" کا
لفظ تیار ہوا ہے۔ اس سے وسیع چیز ہے کہ دونوں عالم میں سا جاتے ہیں اور پھر فی بہت
باوجود اس وسعت کے شوق کو تنگی کی تنگی کا کہہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق کی بہت

بھی دل کی وسعت سے کسی طرح کم نہیں ہے (اب نگلی جاکا ثبوت ملاحظہ ہو) فرماتے ہیں: گھر میں
 دریا کی روانی موج جوگی یعنی کونے میں دریا سا گیا۔ مگر بچ جانے کے سبب سے موجوں کی حرکت بند
 ہو گئی۔ دل کو گوہر سے اور شوق کو دریا سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔ سچ ہے کہ اس
 مضمون میں دریا کونے کے اندر بند کر لیا ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ چستی بندش مناسب الفاظ
 حقیقیوں میں فرق نہیں آنے پایا۔ دونوں مصرعے ایک ہی ساقچے میں ڈھلے ہوئے معلوم
 ہو گئے ہیں۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسائے
 فرماتے ہیں۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ قیامت تک میرے کسی خط
 کا جواب نہیں لکھے گا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ ذوق خامہ فرسائی مجھ پر ظلم کرتا ہے اسلئے بار بار
 تجھ کو خط بھیج رہا ہوں۔ یاد ہو دیکھ امید جواب سے قطع نظر کر چکا ہوں۔

خسے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے ہی دوام کلفت خاطر عیش دنیا کا
 فرماتے ہیں۔ بہار اگر ایسی ہی بے ثبات اور بے بنیاد ہے تو بہار ہی کیا ہے۔ یعنی میر سم بہار
 خزاں کے پاؤں کا رنگ حسا ہے جو بہت جلد اڑ جائیگا اور اسکی مثال ایسی ہے جیسے عیش دنیا کے
 عیش کی مدت بہت ہی قلیل ہوتی ہے اور کلفت خاطر زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے
 کہ دنیا میں عیش و آرام کا زمانہ کم ہے اور رنج و مصیبت کا دور دورہ زیادہ۔

غم فراق میں کلفت سیر باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بجا کا
 قاعدہ ہے کہ رنج و مصیبت کے وقت عیش و عشرت کی چھٹیڑ چاڑنا گوارہ نہ کرتی ہے
 خیانتچہ انشاء اللہ خان انشاء کہتے ہیں۔

نہ چھٹیڑنے کھبت یاد بہاری اہ لگاپنی تجھے اشکھیلیاں سو جھی ہیں دیاں نیرا چھپے ہوا
 مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے غم فراق کی حالت میں سیر باغ کے لئے کیوں گھسیٹے لئے جاتے
 ہوئے کو خندہ ہائے بجا کا دماغ نہیں ہے۔ خندہ محل کو خندہ بجا ہے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ وہ کچھ

سوچ بھکر زراہ تعجب ہا متعجب میں مستاختہ بیچارے عجم کی حالت میں زیادہ تر، گورنہ ص
ہو رہا ہے۔ شعر کی عمدگی میں کلام نہیں۔

۴۹

مہو ز محرمی حسن کو ترستا ہوں کسے ہے ہرین ہو کا چشم بینا کا
فرماتے ہیں باوجود اس کے کہ میرا رونگٹا روٹ جائیگا چشم بینا بن گیا ہے۔ نوتے ذمے میں
اسکی تجدیاں دیکھ رہا ہوں پھر بھی مجھ کو محرمی حسن کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا یعنی کہ نہ ذات
اور معرفت الہی سے محروم ہوں۔

دل اسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دیکھتے ہیں مانع کہاں حسن کے تقاضا کا
ناز و ادا کو طلب دل کا تقاضا کتنا نئی طرح کی جدت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ادا صرف یہ بھی
ناز و ادا کا بھی آغاز نہ ہوا تھا ہم نے پہلے ہی سے دل نذر کر دیا۔ دوسری لطافت خیال سے شعر میں
یہ ہے کہ محسن حسن جو سادگی کے عالم میں تھا ہم اس پر عاشق ہو گئے۔ ناز و ادا جس کو نہ یو یسن
بجھا با آ ہے فریفتگی کے سے اسکی بھی ضرورت نہ تھی۔

نہ کہہ کر گریہ بقدا حیرت دل ہے مری نگاہ میں سے جمع زریح دریا کا
مرزا صاحب معشوق سے شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ نہ کہہ کر تیرا گریہ تیری سرت
دل کے برابر ہے نہیں یہ بات ہرگز نہیں ہے میری نگاہ میں دریا کا جھج و خپتہ ہے یعنی بس قدر
میں نے آئینہ بایں میں اس سے بہت زیادہ حسرت گریہ میرے دل میں موجود ہے حسرتوں
کے مقابلہ میں ابھی کچھ بھی نہیں روایا ہوں۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں سکریا داسے جنائیں اسکی ہے انداز کا رفرما کا
یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یا د آتا ہے سنے کہ آسمان جو ظلم و ستم مجھ پر کرتا ہے وہ سب اسکی
حکم سے ہوتے ہیں۔ بغیر حکم الہی کے آسمان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ شعر بہت صاف و در خیال نہایت
پاکیزہ ہے۔

قطرۂ لبک حیرت سے نفس پر در ہوا خطِ جامِ مے سراسر رشتہ گو ہر ہوا

۵۰

خود مرزا صاحب اس مطلع کی شرح اپنے ایک خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ ”خیال تو
دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں۔“ وہ فرماتے ہیں کہ قطرہ جو نیپکنے میں بے اختیار ہے
افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا اور برابر برابریوں میں جو نظم کر رہے گئیں تو پیالے کا خط اس تاگے کی
صورت بن گیا جس میں موتی پر دسے گئے ہوں۔“

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھتا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا
فرماتے ہیں معشوق کو میرے عشق کا یقین آ گیا ہے اور اس قدر اس کا اعتبار جم گیا ہے
کہ اگر غیر بھی بھولے چوکے سے کبھی آہ و فریاد کرتا ہے تو وہ یعنی معشوق خود بتامی اور روائی
سے مجھ پر خفا ہوتا ہے غیر کی طرف اس کا گمان بھی نہیں جاتا۔

جب مقرب سفر یار نے محل باندھا تپش شوق نے ہر ذرہ پاک دل باندھا

فرماتے ہیں سفر کے وقت جو یار نے اونٹ پر محل ک اور باندھا ہماری تپش شوق نے ہر
ذرہ خاک پر ایک دل باندھ دیا جو ختم سفر تک یار کے ساتھ ساتھ رہا مطلب یہ ہے کہ دوست کو
خصت کرتے وقت ہمارا شوق یہ چاہتا تھا کہ ہم بھی اُس کے ہمراہ روانہ ہو جائیں اور اُس مقرراری
کی حالت میں خاک کے ذروں کو دیکھ کر جو ساری کے وقت زمین سے گرد و غبار بن کر بلند ہوتے
تھے ہم سمجھتے تھے کہ ہر ذرہ پر ایک دل بندھا ہوا ہے ورنہ خاک کے ذرہ میں یہ تڑپ کہاں ہوتی ہے۔
اہل سینہ نے بحیرت کہہ شوخی نام نہ جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

اہل یقین سے یہاں وہ اہل تماشہ مراد ہیں جو یار کے آئینہ دیکھتے وقت ادھر ادھر موجود ہیں
اور حیرت کہہ وہ آئینہ ہے جس میں عکس یار شوخی و ناز کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ یہاں آئینہ سے
مراد فولادی آئینہ ہے جس میں جو ہر ہوا کرتے ہیں جو ہر فولاد کا رنگ بن رہا ہے اور ہر رنگ کو
ہمیشہ طوطی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ پہلوؤں سے دیکھنے والوں کو ہر ایک رنگ
سے جو ہر آئینہ کی سبزی سحرک نظر آتی ہے اس وجہ سے اُسے طوطی بسمل سے تشبیہ دی
گئی ہے۔ یہ تشبیہ نہایت لطیف اور بہت ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ جو ہر آئینہ فولادی کی

سبزی جو اطراف و جوانب سے متحرک نہ رہتی ہے یہ طوطی سیل ہے جس کو شوخی، مذکی چھری سے سیل کر دیا گیا ہے۔

یاس و امید کے بک عرہ میدان نکا عجز بہت سے طلسم دل سائل باندھا
عرہ کے معنی بہ خونی اور جنگجوئی کے ہیں فرماتے ہیں میں اور امید نے ایک میدان جنگ
لگ لیا ہے۔ آپس میں رسائی پڑ رہی ہے۔ کبھی یاس غائب جاتی ہے کبھی امید دوسرے مصرعہ
میں فرماتے ہیں۔ عجز بہت سے ایک طلسم باندھا ہے یعنی ہمسہ بنایا ہے جس میں یاس و امید کی
باہم رسائی ہو رہی ہے۔ یاس چاہتی ہے میں فتح پاؤں کروں۔ امید کی کوشش ہے میں شکست
دیدوں۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ جو شخص بہت نہیں رکھتا وہ سزاؤں بن کر امید بہیم میں مبتلا رہتا ہے
یعنی محال کرنے کے بعد جب تک کچھ ملے یا جواب صاف سے امید کا طلسم ٹوٹے۔ یاس و امید میں
بہیم بگڑا رہا کرتا ہے۔

نہ بندے تشنگی و ذوق کے مضمون غالب گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل بنا دیا
فرماتے ہیں ذوق سخن کی تشنگی کے مضامین جیسے باندھتے چاہتے تھے ہم تھے اسے غالب نہ بند
کے۔ باوجودیکہ دل کھول کے دریا کو بھی ہم نے ساحل باندھا۔ ساحل کو تمام شرارتیں لب لکھتے چھ
آئے ہیں اگرچہ آغوش میں دریا کو رکھتا ہے مگر پھر بھی خشک لب نظر آتا ہے۔ دل کھول کر کوئی کام کرنا
کسی کام میں مبالغہ کرنے کو کہتے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ ذوق سخن اس درجہ غالب تھا کہ باوجود بہت
کچھ لکھنے کے طبیعت مضامین سے سیر نہ ہوئی۔

میں اور تیرم سے یوں تشہ کام آؤں گریں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
فرماتے ہیں تعجب اور حیرت کی بات ہے مجھ جیسا باوجود خوار جس کو ساقی دنیا شراب خوار جانتی ہے
ہم سے اس طرح پراسا پلا آئے یہ مانا کہ میں نے توبہ کر لی تھی اور یہ پامں توبہ ساقی سے شراب نہ
مائی۔ مگر ساقی کو کیا ہو گیا تھا کہ اُس نے بے طلب کے مجھ کو نہ دی اور نہ بدستی نہ بدوی۔ جن
شفتوں میں مرزا صاحب نے اس معنون کو بیان کیا ہے کچھ میں نہ دیں یہی مرزا صاحب کی اصل

کر سکتے ہیں۔

ہے ایک تیز جہیں نون چھپے پٹے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر حبید تھا
اس مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور مطلع میں بھی باندھا ہے وہاں یوں فرماتے ہیں
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک اداس صامند کر گئی
موقوفہ بالا شعر میں بھی تیرے مراد تیر نظر ہے یعنی وہ زمانہ اب کہاں ہے کہ دل پہلو میں نہ
مقام پر رہتا تھا اور جگر سینے میں اپنی جگہ قیام پذیر تھا۔ اب تو عشق نے دونوں کو ایک ہی تیسرے
میں چسپید کر دین پر ڈال دی ہے۔

درمانہ گی میں غالب کچھ بن پٹے توجہ نون جب شمع بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا
مطلب صفت اتنا ہے کہ جب مانتے مصائب کی قدرت حاصل تھی اس وقت مصیبتیں نہ
پڑیں جس وقت ان کے دفعیہ کی طاقت باقی نہ رہی۔ صعیبوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مضمون کو اس
ستارہ میں بیان کیا ہے کہ ”جب رشتہ بے گرہ تھا“ یعنی کسی مشکل کا سامنا پیش نہ آیا تھا تو ”ناخن
گرہ کشا تھا“ یعنی اسکے دفعیہ کی قدرت تھی مشکل گرہ کا استعارہ ہے اور تیسرا ناخن کا استعارہ۔

گھر بار جو نہ رہتے بھی تو ویراں ہوتا بھر گھر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
فرماتے ہیں۔ ہمارے گھر کی قیمت ہی میں ویران ہونا لکھا تھا لوگ ہم پر رونے کا الزام کیوں
کھتے ہیں جو گھر گھر نہ رہا ہے وہی گھر نہ رونے کی حالت میں جنگل بن جاتا۔ غرض یہ ہے
کہ بنیسی، پناہ دگ دکھائے بغیر کسی طرح نہیں رہتی۔

تنگی دل کا کلا کیا یہ وہ کاف دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
اس شعر میں بھی مسطورہ بالا مطلع کا مضمون دوسری ترکیب اور دوسرے الفاظ میں بیان
فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دل کو سو درد رنج و غم پہنچا لازمی اور ناگزیر ہے یعنی اگر دل تنگ نہ
ہوتا اس قدر خاطر کی بدولت اس قدر پریشانی بڑھ جاتی کہ پریشان ہو جاتا۔

بعد یک عمر و سنا بار تو دیتا با سے کاش رضواں ہی دربار کا دربار ہوتا

فرماتے ہیں عمر بھر عبادت کرنے کے بعد جنت میں باریابی حاصل ہو جاتی۔ رضوان ہم کو نہ ترک
دریاد رکھا پس سب ان میں قدم سخت گیر رہے۔ عمر بھر التجائیں کرنے کے بعد بھی خائفہ دوست میں جلنے
کی اجازت نہیں دیتا کاش دربان رضوان ہوتا (جو بہشت کا دربان ہے) اس سے یہ امید
ہو سکتی تھی کہ وہ عمر بھر عبادت کرنے کے بعد نہ روکتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔ لہذا یہ مجھ کو مہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
کس خوبی کے ساتھ نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ جب
دنیا پیدا نہ ہوئی تھی اس وقت صرف خدا ہی خدا تھا۔ اگر اس عالم امکان کو پیدا نہ کیا جاتا تو بھی
خدا ہی خدا ہوتا پس میری ہستی نے ظاہر ہو کر مجھ کو ایک دوسرے جسم قرار دیا اور دوسرے جسم نے قرار پا کر مجھ کو براب
کر دیا اگر میں پیدا نہ ہوتا اور میرا وجود نہ ہوتا تو خیال کرنا چاہئے کہ میں کیا ہوتا یعنی خدا ہوتا۔ اس واسطے کہ
یہ پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا۔ اور کچھ نہ ہوتا تو بھی خدا ہی خدا ہوتا۔

ہو جب غم سے یوں جس تو غم کیا سر کے کٹنے کا۔ نہ ہوتا اگر جذبات سے تو زانو پر دھرا ہوتا
اس شعر میں لفظ بے جس نے ثبوت دعویٰ کے ساتھ عجب لطیف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں
جب ہمارا سر خنم والہم کی کثرت سے ایسا بے حس ہو گیا تھا کہ ہر وقت اس کو زانو پر رکھنا پڑتا تھا تو ایسے
سر کے کٹ جانے کا غم والہم بے فائدہ ہے۔ یعنی کثرت غم نے سر کو کٹنے سے پہلے بیکار کر دیا تھا
بیکار شے کا ضائع ہونا کچھ افسوس کی بات نہیں۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے وہ ہر اک بات پر کہنا کیوں ہوتا تو کیا ہوتا
یہاں "کیا" کا لفظ تختیر کے معنی پر ہستمال ہوا ہے جس سے اہتمام و رجحان کی بیداری اور ناامیدی
ظاہر ہوتی ہے۔ گویا دنیا کی بے ثباتی کا خیال کسی کام میں نظر کے سامنے سے ہٹا ہی نہیں۔ فرماتے
ہیں کہ غالب کو مرے ہوئے ایک عرصہ دراز گزر گیا ہے۔ مگر اب تک ہم کو وہ اور اس کی باتیں
یاد آتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہر بات پر یہ کہتا تھا کہ اگر خوش نصیبی سے ایسا بھی ہوتا تو کیا ہوتا یعنی
مع دنیا بیچ است و کار دنیا بھریج۔

یک ذرہ زمین نہیں بیکا رباع کا یاں جاوہ بھی قتیلہ ہے لالے کے داغ کا
 فرماتے ہیں اب کے سال بہار رباع میں ایسے زور شور سے آئی ہے کہ ذرہ بھر زمین بھی بیکار
 نہیں ہی ہے۔ رباع کی روشیں جو کثرت بہار سے سبزہ زار ہو گئی ہیں وہ گویا مرہم زنگار کی تیاں بن گئی
 ہیں۔ داغ لالہ کے واسطے (مرہم زنگار ہمیشہ زخم کو کاٹتا اور صاف کرتا ہے) یعنی لالے کا داغ مٹانے
 کے واسطے مرہم زنگار ہی کا استعمال مناسب سمجھا گیا ہے۔

بے بے کے ہے طاقت آشوب آگئی کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خطایاغ کا
 فرماتے ہیں بغیر شراب محبت الہی کے کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آشوب آگئی کی بردہ
 کر سکے۔ ایساغ کے معنی پیالے کے ہیں اور یہاں پیالے سے مراد وہ گلاس ہے جس پر شراب ناپنے
 کے لئے خطوط کھینچے ہوئے ہوتے ہیں۔ انگریزی میں جس کو منجم میجر اور ش میجر کہتے ہیں مطلب یہ ہے
 کہ عجز حوصلہ کی وجہ سے ہم نے پیائے شراب پر نشانات بنا دیے ہیں اور اسی سے شراب ناپ کر پیے
 ہیں اور مقدار شراب دن بدن بڑھاتے جاتے ہیں۔ آشوب آگئی کی طاقت برداشت بقدر خطوط
 جام رفتہ رفتہ پیدا ہوتی جاتی ہے یعنی ذکر و اشغال کی دن بدن مہارت و شوق زیادہ کرتے جاتے ہیں۔
 بلبل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے و داغ کا
 فرماتے ہیں۔ دیوانے آدمی کی حرکات چہرے طرح عام آدمی جیسے ہیں اسی طرح بلبل کے شوق
 نندہ و فریاد پر پھول خندہ زن ہیں اس سے ثابت ہوا کہ جس کو عشق کہتے ہیں وہ درحقیقت ایک قسم
 کا خلل دماغ ہے۔ انسان نے غلطی سے خلل دماغ کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ مصرع ثانی کی بے ساختگی
 قابل مدح و ستائش ہے۔

تازہ نہیں ہے نشہ فکری سخن مجھے تریاکی قدیم ہوں دو دوسپراغ کا
 فرماتے ہیں۔ فکری سخن کا نشہ مجھے آجکل کانیں و ذہن و دل سے نشہ فکری سخن ساتھ لیکر آیا ہوں
 تریاک کے معنی افیون کے بھی ہیں اور زہر کے چھینٹے کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح
 زہر و زہر پر زہر کی بو کے ذریعہ سے افیون کا دھواں سننے کی وساطت سے حقد کی طرح کھینچتے ہیں

در پیچے ہیں۔ سی طرح میں دو در چراغ سے نشہ فکر سخن کرتا ہوں قاعدہ ہے کنگر سخن یا سخن سخن یا سخن
رات کے وقت کی جاتی ہے اور رات کو لکھنے کی غرض سے سچا یا چراغ کا قریب ہونا بھی رازی ہے
طالبِ نعم بھی عموماً رات ہی کو سبق یاد کرتے ہیں۔

سو بار بند عشق سے آزاد تم ہوئے پر کیا کریں کہ دل ہی سدا ہے فرخ کا
میں شہر میں مرزا صاحب نے محنت کو تیش کا بڑا پہنا دیا ہے۔ یہاں عشق سے دنیا کی محبت
اور بند عشق سے اُس محبت میں پھٹ ہوا ہونا مراد ہے۔ فرماتے ہیں سو بار دنیا کی فکروں سے ہر
آزاد ہوئے ہیں اور دنیا و دل دنیا سے قس قس کر نچکے ہیں مگر سب بات سے مجبور ہیں کہ دل دماغ با
کے دشمن واقع ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر غیر تغزل فکر آدمی رہ ہی نہیں سکتا۔

بے خون دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار یہ میکہ خراب ہے مے کے شراب کا
فرماتے ہیں۔ انسان کی آنکھ اسی واسطے پیدا کی گئی ہے کہ ہمیشہ خون کے آئینہ بانی رہے۔ اگر
کچھ سے خون دل نہیں بہتا تو موجِ نگاہ کے بدلے آنکھوں میں خاک اُڑنے لگتی ہے یعنی آنکھ کی ریاضت
دور رونق قاک میں مل جاتی ہے۔ یہ میکہ یعنی چشم انسان بغیر شراب کا خراب ہوتا ہے۔ تنہا سبیل
کی کیا بات ہے۔

باغِ شگفتہ تیرا باطِ ناشاد دل ابر بہارِ خنکدہ کس کے دماغ کا
فرماتے ہیں۔ میرے غنچے خاطر کی کھلانے والی تیرا باغِ حسن کی بہار ہے اور یہ باغ بہار
در ہمیشہ شگفتہ رہنے والا ہے۔ میری ہستی کا سبب ابر بہاری نہیں ہو سکتا معلوم نہیں یہ خنکدہ جیسی بہار
کس کے مست کرنے اور بیوش کر دینے کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معمولی شراب خراب بہار
سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اور ان کا دماغ فصلِ گل میں چمن کی سیر سے فرحت و انبساط حاصل کر سکتا
ہے۔ میرے شگفتہ خاطر کرنے کے لئے تیرا باغِ حسن اور تیرے حسن کی بہار ہے۔

۱۵ وہ مری چین چین سے غم نہاں سمجھا رازِ مکتوب بے ربطی عنوانِ محبت
باتے ہیں معشوق میری چین چین سے میرے غم نہاں کو سمجھ گیا لا غم نہاں کے معنی نہاں

رکبت دلی کے ہیں) پھر اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔ خط کا مضمون پتہ کی بے ربطی سے اُس پر کھل گیا۔ چین جہیں سے استعارہ لغزہ خط سے اور غم نہاں کا استعارہ راز مکتوب سے کیا ہے۔

یک لفظ میں نہیں مستقل آئینہ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جبکہ گریاں سمجھا
حضرت صوفیہ کے ہاں صفائی قلب کے لئے بہت سے طریقے ذکر کے رکھے گئے ہیں
چنانچہ قادریہ خاندان کا یہ طریقہ ہے کہ تان کے مقام سے سامن کو کھینچ کر سینے تک لاتے ہیں اور
دہنی جانب سے گردن کو حرکت دیکر قلب کے اوپر ضرب لگاتے ہیں اور اس خیالی سامن کی
کشش کو عربی خط میں لفظ اکلا اللہ کی صورت تصور کرتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں میں
بھی اپنے آئینہ دل کی جلا چاک گریاں سے کرتا رہا ہوں۔ انجام کار کچھ کو یہ ثابت ہوا کہ ایک لفظ
سے زیادہ میرے آئینہ دل کی جلا نہیں ہوئی اور یہ ویسی ہی ایک سیدھی لکیر ہے جو آئینہ فولادی
کو منقل کرتے وقت ابتدا میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ مجھ پر اپنی غلطی ثابت ہو گئی اور اب میں سمجھ
گیا ہوں کہ سیر گریاں جس کو میں نے مستعد سمجھا تھا درحقیقت گھوڑے کی منقل کی صورت کا ایک آلہ
آہنی ہوتا ہے جس سے آئینہ فولادی یا تلوار وغیرہ ہتھیاروں کی منقل کیا کرتے ہیں ہو حقیقت میں
مستعد نہیں ہے بلکہ گریاں ہے۔ اب میں اُسے بیکار شے سمجھ کر چاک کر رہا ہوں اور اپنی غلطی پر زام
ہوں۔ گریاں یہاں مراد گریبوں کی کنش سے ہے جو بالکل مستعد سے مشابہت
رکھتی ہے۔

مشرّب اسباب گرفتاری خاطر مت چوچہ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں نہاں سمجھا
فرماتے ہیں۔ میری گرفتاری خاطر کا سبب مجھے شرع دیکھ کے ساتھ یعنی مفصل نہ پوچھو
میں اپنا پورا پورا راز کھولنا نہیں چاہتا۔ مجھ حال یہ ہے کہ دل میرا اس قدر تنگ ہو گیا ہے کہ
میں اُس کو نہ نہاں سمجھتا ہوں۔

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرم حسرت
رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

فرماتے ہیں میری بدگمانی نے یہ بات منظور نہ کی کہ وہ دیر تک سرگرم خرم تازہ رہے۔
 اُسکی وجہ یہ تھی کہ نزاکت کے سبب سے چلنے میں اُسکو جو پسینہ آیا درمختے پر اُس پینے کے قطرے
 جمع ہو گئے میں ہر قطرہ کو یہ سمجھا کہ رقیب کی چشمہ حیرت اُس کے رخ پر جمی ہوئی ہے۔
 شجر سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہو گا۔ نبضِ خس سے پیشِ شعلہ سوزاں تجھ
 غمِ کونسن و تند خوئی کو شعلہ سے تعبیر کیا ہے مطلب شعر کا یہ ہے۔ میں نے اپنی عاجزی اور
 اُسکی بہ مزاجی سے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح شعلہ سوزاں گھاس بھونک کو جلد دیتا ہے، اس کا قطرہ
 میری بربادی اور قتل کا باعث ہو گا۔

سفرِ عشق میں کی نصف نے راحت طلبی ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں بھجا
 فرماتے ہیں جب سفرِ عشق میں تھکان بہت بڑھ گئی اور کمزوری پیدا ہو گئی تو نصف
 نے آرام لینا چاہا۔ مسافر ہمیشہ تھک جانے کے بعد آرام لینے کے لئے سایہ کی تلاش کیا کرتا ہے
 چونکہ میرا سفرِ عشق تھا۔ یہاں درخت یا دیوار کا سایہ تو مفقود ہی تھا۔ میں نے اپنے ہی سایہ کو
 شبستاں بھجوا کر آرام لینا چاہا۔ استعاروں سے قطع نظر کر لینے کے بعد اس شعر میں یہ معنی پیدا ہوتے
 ہیں جب محرومی اور تکامی حد سے گزر جاتی ہے واثق یاں اور ناامیدی کو اپنا مہدم قرار
 دیکر تسکین کی طرح حاصل کر لیتا ہے۔

تھا گر یزاں مژہ یار سے دلِ ہم مرگ دفعِ پیکانِ قضا اس قدم آساں سمجھا
 فرماتے ہیں۔ مژہ یار سے میرا دل مرنے کے وقت تک بھاگتا اور ڈرتا ہی رہا اور
 نادانی سے بھاگنے کو میں دفعیۂ قضا سمجھتا رہا۔ تعجب ہے کہ پیکانِ قضا کا دفعیہ میں نے
 اس قدر آسان سمجھ لیا تھا۔

دل دیا جان کے کیوں اُسکو وفا دار نہ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا
 فرماتے ہیں۔ اے اسد تم نے اُسکو وفا دار جان کر کیوں اپنا دل دیا۔ بالقرضِ محارگر
 دل کا دنیا ہی مقصود تھا تو ہونا سمجھ کر دیا ہوتا۔ بہت بُری غلطی کی جو کافر کو مسلمان سمجھا یعنی دنیا کی

لو شتر اسلام ہے کا فرق اس سے کیا تعلق۔

پھر مجھے دیدہ تر یا د آیا دل حیرت شدہ فریاد آیا

فرماتے ہیں مجھے اپنا دیدہ تر پھر یاد آیا جس کے ذریعہ سے میرے بہت سے جو میلے نکلا کرتے تھے اور آتش عشق، آتش شوق، آتش رشک کچھ کھلا جایا کرتی تھی یعنی کسی قدر کین حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں میرے دل و جگر دیدہ تر کے یاد آ جانے سے آرزو مند فریاد ہو گئے۔ مرزا صاحب نے فارسی محاورہ کے موافق یہاں ہوئے کی جگہ آیا استعمال فرمایا ہے

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوت پھر تر او قسب سفر یا د آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُس کے چلے جانے کے بعد رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعراء دوزبان ہیں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے۔ ان دو مصرعوں میں اُس کی تصویر کھینچ دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیاں میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا (اد یادگار غالب)

سادگی ہائے تنہا یعنی پھر وہ نیرنگ نظریاد آیا

فرماتے ہیں۔ آرزو اور تمنا کی سادگی کو تو دیکھو یعنی پھر نگاہ یار کی نیرنگیوں کا تماشیا د آیا مطلب یہ ہے کہ نگاہ یار نے جو اشائے کنیے سے باتیں کی تھیں اور عاشق اپنی سادگی سے آرزو پوری ہونے کا ذریعہ سمجھا تھا لہذا اپنی کامیابی کا یقین کامل ہو گیا تھا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا ظہر چہ چاکہ مستحق کی نگاہوں کا وہ ایک فریب تھا مگر اس میں ایک قسم کا لطف حاصل ہو چکا ہے اس نے وہ پھر یاد آتا ہے۔

عذر بردر ماندگی اسے حسرت دل نالہ کرتا تھا حیرت یاد آیا

فرماتے ہیں۔ اسے حسرت دل میں عجب سے اپنے قاصر رہنے کا عذر کرتا ہوں میں ضرور

تیری خواہش کے موافق نہ کرتا لیکن مجبور اس سے ہو گیا کہ مجھ کو اپنا جگر یاد آ گیا یعنی میں نالہ کرتا تو جگر تن ہو جاتا مطلب یہ ہے کہ حسرت دل اس بات کی متقاضی تھی کہ نالہ کیا جائے اور اُس کے اثر سے کامیابی حاصل کی جائے مگر ہمارا نالہ ایسا پروردگار نالہ تھا کہ اُس کے منہ سے نکلتے ہی جگر شق ہو جاتا۔

زندگی یوں بھی گزر رہی جاتی کیوں ترارہ گزریا دیا

فرستائیں زندگی بسر مرنے کے لئے کسی پر عاشق ہونا لازمی امر نہیں۔ ہم بیہوش کے بھی آدمی ہو سکتے ہیں۔ تیری راہ گزریا دانا ہمارے لئے مصیبت کا سبب ہو گیا۔ نہ تری راہ گزریا جس کی ہم مدت سے شہرت کرتے تھے دیکھنے کے لئے جاتے نہ تجھ سے دوچار ہوتے۔ نہ ترا عشق پیدا ہوتا۔ نہ اس مصیبت میں پھنستے جس میں اب گرفتار ہیں۔ خوبی اس شعر میں یہ رکھی ہے کہ امر برفض و قدر کو اپنی نہ دانی کا سبب سمجھ کر اُس پر افسوس نہ ہو کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے زمانہ میں وہ گزریا کو مذکور بول اور لکھا جاتا تھا لیکن اب بدلتا قل بل وہی مؤثر استعمال کرتے ہیں

کیا ہی رشتوں سے لڑائی ہوگی گھر ترا حسلہ میں گریا دیا

اس شعر میں مرزا صاحب اپنی مہموں شوخی بہت نئے ہیں جس سے شعر کے ذہنی پیدا ہو گئے ایک۔ جب تیرا گھر ہم کو خلیہ میں یاد آئیگا درِ رضوان سے اُس کا ذکر کرینگے رضوان تیرے نہ ہم خلد کو ترجیح دیگا ہم عید کیونکر اس بات کو تسلیم کرینگے ضرور آس میں جگر اہوگا وہ ہمیں ٹھنڈا نیکام اُسے جھٹکینگے یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت آجائیگی۔ دوسرے لطیف معنی یہ نکلتے ہیں کہ جب تیرا خلد میں ہم کو یاد آئیگا تو ہم خلد سے نکل کر بھاگن چاہیں گے رضوان روکے گا یا ہم خوب کشتہ کشتا ہوگی۔

آہ وہ جبرأت فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آ یا

فراتے ہیں جگر کی موجودگی کے زمانہ میں جو فریاد کرتے دلت جبرأت سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ جبرأت اب جگر کے مٹ جانے کے بعد باقی نہ رہی دل آل اندیشی کی وجہ سے نالہ کرتے ہوئے پچھپاتا ہے اور اس کا سبب معشوق کی بدنامی کا خوف ہے اگر حب گر سینہ میں ہوتا

تو وہ اس قسم کا پسو پیش نہ کرتا کہ میں اثر ہوتا یا نہ ہوتا مگر نالہ ضرور کیا جاتا۔

پھر ترے کوچہ کو حساب آتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا
 فرماتے ہیں تیرے کوچے میں ہمارا دل کھویا گیا ہے اس لئے رہ رہ کر تیرے کوچہ کا خیال آتا
 ہے شاید یہ بات کہ دل گم گشتہ ہم کو بار بار یاد آتا ہے مرزا صاحب نے اس معنوں کو ادا کرنے میں
 آدابِ عشق اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ دوست کو دل کی چوری کا الزام نہیں دیتے بلکہ اُس کے
 کوچے میں دل کا گم ہو جانا طبعاً ہر کرتے ہیں۔ دوسری نزاکت معانی اس شعر میں یہ ہے کہ
 بیچین کرنے والے معشوق کی یاد ہے۔ مگر اخفاے رازِ عشق کے لئے دل گم گشتہ کے یاد آتے
 کا بہانہ کیا جاتا ہے۔

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھریا دیا

اس شعر میں دو معنی نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر دیران ہے
 کہ اُس کو دیکھ کے گھریا دیا جاتا ہے۔ یعنی خوت معلوم ہوتا ہے۔ مگر زرا غور کرنے کے بعد یہ دوسرے
 معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھری کو سمجھتے تھے ایسی دیرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی اس قدر
 دیران ہے کہ اُس کو دیکھ کر گھری دیرانی یاد آتی ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسل سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

فرماتے ہیں میں نے بچپن کے زمانہ میں لڑکوں کی دیکھا رکھی مجنوں پہ پتھر اٹھایا تھا مگر ذرا
 ہی مجھ کو اپنا سر یاد آ گیا یعنی یہ خیال ہوا کہ میرے سر میں بھی تو اسی قسم کا سودائے عشق سما یا ہوا ہے
 یعنی میرا مزاج تو بچپن سے عاشقانہ تھا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی عمنان گیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ وعدہ پر آپ تشریف تو لے آئے مگر دیر کر کے آئے اس توقف کی کوئی وجہ ضرور
 ہوگی شاید یہ وجہ ہو کہ غیر آپ کو یہاں آنے سے روکا تھا۔

تم سے بچا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

۱۰۔ زشتی تقدیر کو خوبی تقدیر کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں مجھ سے مجھے اپنی تباہی کا بکا بے چارہ ہے اس میں منور کچھ نہ کچھ میری بد نصیبی کی بھی شراکت تھی۔ معشوق کو کثرت محبت کی وجہ سے الزام دیتے ہوئے سچائی نے ہیں۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ ہست لادوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی پتھر بھی تھا
فرماتے ہیں۔ میں وہی شکار ہوں جو کبھی تیرے گھوڑے کے شکار بند میں باندھا گیا تھا اور تو نے مجھ کو حقیر سمجھ کر کھوکھلیاں چھینکات و شاید مجھ کو بھول گیا ہو مگر میں ابھی تک اپنے کو تیرا شکار ہی سمجھے جاتا ہوں پتھر شکار کو کہتے ہیں فتراک اُس موتی رسی یا تسمہ کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی زین میں گینڈیوں کے چاروں طرف کوڑوں پر بندھی ہوئی یا پوسٹ ہوتا ہے۔

قید میں تھے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک نچ گرا نباری زنجیر بھی تھا
فرماتے ہیں تیرا وحشی تیری زلف کی یاد کو جس میں پہلے قید رہ چکا ہے ابھی تک جو مانہیں البتہ اس کے ساتھ میں یک خیف و خیال گرا نباری زنجیر کا بھی تھا۔ اس بیان سے قید زلف کے مقابلے میں قید زنجیر کی سختی کو کم درجہ کا ثابت کرنا منظور تھا۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کب بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی بھٹ
اس شعر میں مرزا صاحب نے س منقون کو کہ معشوق نے آنی آن میں اپنی صورت دکھادی تو اُس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے اس طرح اد کیا ہے ”بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کب“ دوسرے حصہ کا مفہوم یہ ہے۔ مجھ سے گفتگو بھی کرنی پڑے تھی۔ میں تقریر سننے کا بھی مشتاق تھا آنکھوں کو تو دیدار سے کچھ تھوڑی بہت تسلی ہو کر مکرمل کارمان نہ نکلا یہ جب ہی نکلتا کہ میرے پاس تھوڑی دیر ٹھہر کر مجھ سے بات چیت کی جاتی۔

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی گر بجز جینے تو میں لائق تقریر بھی بھٹ
فرماتے ہیں میں نے اُس کو یوسف کہہ دیا یعنی غلام بنا دیا بڑی خیر چوٹی کہ وہ مجھ سے اپنی یہ تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ اگر وہ ناراض ہو جاتا تو میں یوسف کہہ دینے کے درم میں رہتا۔

کے قابل تھا۔

دیکھ کر غیر کو جو کیوں نہ کلیجہ بھٹکا
نالہ کرتا تھا دلے طالب تاثیر بھی تھا
فرماتے ہیں غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو جائے اس لئے کہ میں نالے کرنا تھا اور اپنے
نالوں سے تاثیر کا طلبگار بھی تھا۔ یعنی مجھ پر میرے نالوں کا اثر کچھ ظاہر نہ ہوا تھا اب غیر کو بڑی حالت
میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ میری ہی فریاد کا اثر ہے۔

پیشے میں عیب ہیں رکھتے نہ سزا دیکھنا
ہم ہی آشفۂ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
فرماتے ہیں۔ پیشہ کچھ عیب کی بات نہیں ہے۔ آپ فرما دو کیوں نام۔ کہتے ہیں۔ یعنی سزا دیکھنا
بھی ایک عشق پیشہ گزار ہے ہم بھی عشق ہیں اور میر بھی عشق پیشہ تھا۔ اگر سزا دیکھنے کی سختیوں سے
مجبور ہو کر وہ کئی اختیار کی تو اس میں عیب کی کیا بات ہے۔ کوئی عاشق پہاڑ کا سا ہے کوئی قریبی مہیبت
کے دن کا سا ہے۔ کوئی شیفۂ ہجر کی راتیں کا سا ہے۔

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سی
آخراں شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
فرماتے ہیں ہم تو جان قربان کرنے کے لئے اُس کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے اگر اُس نے
ہمارے پاس آنا کسر شان سمجھا تھا تو دور ہی سے کوئی تیر کیسٹ مارا ہوتا مطلب یہ ہے کہ ہم سے ناجیز
عاشق کو بھی اپنے اداؤں کا شکار بنانا ضرور تھا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناخ
آدمی کوئی ہمارا دم تختیر بھی تھا
فرماتے ہیں۔ کراؤں کا تبین کی تحریر پر کیوں ہمارے گناہوں کا شمار منحصر رکھا گیا ہے۔ وہ تو
فرشتے ہیں ان کو انسانی خواہشات کا کیا احساس ہے جس بات کو چاہا گناہ میں شامل کر لیا۔ لکھنے کے
دقت دنیا کے دستور کے موافق ہمارا آدمی یعنی ہمارا کوئی دلیل ضرور ہونا چاہیے تھا صرف فرشتوں
کی تحریر پر ہمیں کیوں سزا دی جاتی ہے۔

ریختہ کے عتیں اُسا و نہیں ہو غالب
کتنے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا
ریختہ اردو میں شعر کہنے کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اردو شاعری میں اسے غالب نہیں اُستاد

نہیں ہو۔ کہتے ہیں یہی مشورہ ہے کہ پہلے زمانہ میں کوئی شاعر میر بھی تھا کہیں خوبی سے فن سخن میں اپنے کو میر صادق کا ہم پدہ ہونا ثابت کیا ہے۔

آن لب خشک و ریشنگی مردوگاں کا زیارت کدہ ہوں دل آزدوگاں کا

فرماتے ہیں میں لب خشک آن لوہوں کا ہوں جو آرد اور شوق کی حالت میں غمیر کا میوہ جس کے دُنیا سے گزر گئے ہیں۔ اس واسطے دل شکستہ و پریشانی فطر دوگوں کی زیارت گوئی ہوں۔ دل آزدوگاں سے مراد گروہ عشاق ہے۔ جو اکثر محرومی کی حالت میں ہتھارتے ہیں۔

ہم سزا امیدی ہمہ بدگمانی میں ہوں فریب دنا خوردوگاں کا
فانے ہیں۔ سر سے پانک، امید اور بدگمانی کی تصویر بن گیا ہوں سر سے کیوں نہ لوگوں کا
دل ہوں جو دُنیا سے مشوق کا فریب کھا چکے ہیں یعنی جن عشاق نے مشوق کو دود و تہجد اس طرح طبع کے نقصان اٹھائے ہیں اور آخر کار حصولِ کامی کے بعد، امید ہی چال کی ہے۔

آن تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اس شعر کے گناہری حتیٰ تو یہ ہیں کہ آج تک کسی کا بھی دوست تو نہیں بنا ہے اور یہ جو یہ کہ مجھ ہی پر نہیں ملکہ تو نے اوروں پر مجھ سے زیادہ زیادہ ظلم کئے ہیں لیکن کسی قدر ستم طلب اس شعر کا یہ ہے کہ جو ظلم مجھ پر کبھی نہ ہوا تھا وہ بتو اوروں پر کر رہا ہے۔ اور دور سے یہاں فخر قریب کی طرف اشارہ ہے یعنی قریب پر تو نے مجھ سے زیادہ ستم کر کے میرے دل میں شک کی یہی آگ لگا دی ہے کہ جس کے ہاتھ بد میں جو رستم کچھ حقیقت نہیں کہتے تیری اس واسطے ثابت ہو گیا کہ میرے متعلق تیرا ترک جو رستمی کا ظہر کر رہا ہے۔

چھوڑا مہرِ شبنم کی طرح دستِ قضا نے خورشید مہوڑا اس کے برابر نہ ہوا تھا

ماہِ شنب وہ مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا مشہور بابین متفانے چاہے شنب سے نکالا تھا یہ چاند داؤں کے ذریعہ سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی مدد سے زیادہ دور تک پہنچ سکی تھی اور اصل چاند کے سامنے ناقص الخلق قرار پاتا تھا۔ دو مہینے تک چاند شنب سے نکلتا رہا بعد میں شبنم ہو گیا

فرماتے ہیں ماہِ خشب کی طرح ناقص اور بیکار سمجھ کر دستِ قدرت نے چھوڑ دیا حالانکہ خورشید
ابھی روئے یار کے مقابلے میں تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں سے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا
بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادھکی
صیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی سمجھ کا تصور ہے۔ دعوتِ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوگی
ہے اسی کے موافق اُس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرہ اشک جس کو آنکھوں میں
جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا سوتی بن جانے پر قانع ہو جاتی تو اُس کو صیبا کہتے
ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا (از یادگار غالب)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدیار کا عالم میں مستندِ فتنہ محشر نہ ہوا تھا
قدیار کو ہمیشہ فتنہ حشر یا فتنہ شمشاد گلستاں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب
تک میں نے قدیار کا اندازہ اور اُس کی حشر خرامی کا تماشا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا فتنہ قیامت
کا دل سے مستند نہ ہوا تھا۔

میں سادہ دل آزر دگی یار کے خوش ہوں یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا
سادہ دل یا سادہ لوح بیوقوف آدمی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں میں اپنی سادہ دلی سے
آزر دگی یار کو بھی موجبِ عیش و مسرت سمجھا ہوں اور دل میں خوش ہوں کہ جس سبقِ شوق کی
ایک مرتبہ لذت نصیب ہو چکی ہے دوبارہ بھی اُسکا لطف حاصل ہوگا یعنی یار سے جب صلح ہو چکی
تو پھر سبقِ شوق کو ڈھراؤں گا اور وہ باتیں جو ایک مرتبہ دل کو مزاد سے چکی ہیں۔ مکرر یعنی دوسری
بھی مزادیں گی۔ یہ خبر ہی نہیں کہ اب اُس سے صلح ہونی ممکن نہیں۔

دریائے سخی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سیر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
فرماتے ہیں گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراغ ہے کہ باوجودیکہ دریائے سخی خشک
ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا کوئی تنک بھی نہیں بھیگا (از یادگار غالب) گنہ کی تکمیل کے بعد حوصلہ گنہ

کا ذاتی۔ ہذا اور شوق گنہ میں یہ کہتا کہ دریا سے مٹی تنگ آبی سے خشک ہو گیا بالکل اچھوتا خیال
اور نئی جنت ہے۔ سنا گیا ہے کہ اُتار دوزخ کو مرزا صاحب کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

جاری تھی اس دریاغ جگر سے مری تحصیل آنشکرو جاگیر سمندر نہ ہوا تھا
سمندر ایک جانور بین کیا جاتا ہے۔ جو نیولے کی قسم کا مگر نیولے سے کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے
آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں میں اُس وقت سے اپنے داغ جگر سے فائدہ
حاصل کر رہا تھا کہ جب آنشکرو میں سمندر پیدا بھی نہ ہوا تھا یعنی جب سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔

شبکہ در مجلس فروز خلوتِ اموس تھا رشتہ ہر شمع خار کسوتِ فانوس تھا
رشتہ شمع سے وہ تگمرا ہے جو موم بتی کے درمیان میں ہوتا ہے اور موم کی وساطت سے

روشن ہو کر ملتا رہتا ہے۔ اموس شرم دیا کسوت لباس۔ خادمہ پرہیز بولن فارسی محاورہ ہے۔
مرزا صاحب نے اُردو شعر میں نظم کیا ہے۔ فانوس کا دھپنچ اکثر سوئے کے تاروں کا بنا کر اس پر ہر ایک
کپڑا چڑھا دیتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ رات کو جب دُشمر کی مغل خوبت میں مشوق بزمِ فروز
تھا اس کے سامنے شمعِ خجالت سے بلی بلی ہو رہی تھی۔ اور شمع سے حق میں رشتہ شمع خار پرہیز بگیا تھا۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جواگتی ہے جانا کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پاؤں کھٹکا
مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ مشہد و عاشق میں جو کوسوں تک حسرتی کے درخت پیدا ہوتے

ہیں یہ اس خون کے اثر سے ہیں جو وقتِ قتل رہا گیا تھا۔ اور خا کا پیدا ہونا یہ بتا رہا ہے کہ تنہید
کس قدر حسرتِ پاؤں کا خواہش مسند تھا زندگی میں تو یار کے قدموں تک اس کی رہائی نہ ہوئی
مگر اس آرزو میں خاک ہو جانے کے بعد بس نے خاکے لباس میں ظاہر ہو کر قدِ سوئی کی تڑپ
ظاہر کی ہے۔ اگر مشوقِ مہندی پاؤں میں لپکا تو یہ خواہش پوری ہو جائیگی۔

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکیبِ آرزو دل بدل پیوستہ گویا اک لبِ انیس تھا

فرماتے ہیں ہم نے عشق و محبت کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہ دیکھا کہ آخر کار حسرت
و آرزو کا خون ہو گیا۔ عاشق و مشوق کا دل سے دل اگر مل بھی گیا تو وہ بھی گویا اک کین

انوس بن کراخیر میں ہاتھ ملتا ہی نظر آئیگا۔

کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیاں جو کہ کھایا خون دل بے منت کیہوں تھا

کیوں اصطلاح طب میں مہتمم جگر کا نام ہے جس میں غذا مہتمم ہو کر خون بن جاتی ہے بشرطہ
فرمانے میں کہ بیماری غم کی فارغ البالی کی کیا تعریف بیان کروں۔ رر جو کچھ میں نے کھایا بے کیوں
ہوئے وہ خون جگر ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بیماری غم میں میں نے ہمیشہ خون دل نوش
فرمایا۔ اور خون دل کھانا غم و غصہ کھانے کے مقام پر استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے معنی
اس شعر میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ بیماری غم میں مجھ کو اس قدر فارغ البالی حاصل تھی کہ جو غذا
میں کھاتا تھا یہی سلوم ہوتا تھا کہ خون دل کھا رہا ہوں۔

آئینہ دیکھ اپنا سامنے لیکے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا عسر تھا

میرزا صاحب مشوق سے کہتے ہیں کہ تم تو میری عاشقی پہ طعنہ زن تھے اور میرا مذاق اڑاتے
تھے آئینہ دیکھ کر اپنی صورت پر خود بھی عاشق ہو گئے۔ اب وہ دل نہ دینے کا غور۔
کہاں گیا۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارے اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصہ تھا

عشق اجازت نہیں دیتا کہ معشوق اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل کرے اور عاشق دیکھے اس
مضمون کو مرزا صاحب نے اس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے اور قاصد کی خطا کو اپنی خطا
ظاہر کرنے سے بھی ہی مراد ہے کہ وہ ہم کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ اُس کے ہاتھ سے دوسرے
شخص کا قتل ہونا دل محبت قبول کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔

عز من نیا نہ عشق کے قابل نہیں ہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں ہا

فرمانے ہیں جس دل کو نیا زندی عشق کے لئے پیش کیا جائے وہ دل اب میرا نہیں
نہیں رہا۔ یعنی جبر کے سدھے۔ بیوفائی کے بیج۔ بے اعتنائی کے قتل اتنے اٹھائے ہیں کہ میں عشق
کی خدمت بجا لانے کے قابل نہیں رہا۔ دوسرے مصرع میں فخر یہ کہتے ہیں۔ میرا دل در حقیقت

عشق کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل تھا اور پیش بھی کیا گیا تھا اور مجھ کو اس دل پر کسی ذرہ نہ
میں ناز بھی تھا مگر اب وہ دل صدمے اٹھاتے اٹھاتے کسی قابل نہیں رہا۔

جاتا ہوں وانع حسرت ہستی لئے ہوتا ہوں تسبیح کشتہ درخور محفل نہیں رہا
فرماتے ہیں۔ میں دنیا سے جاتا ہوں حسرت ہستی کا دانے لئے بولے یعنی قند سے عبور ہو کر

میں نے جان دی ہے۔ میرا دل مرنے کو نہ چاہتا تھا۔ دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل
واقع ہوا ہے۔ یعنی میں کبھی ہوئی شمع ہوں محفل کے قابل نہیں رہا۔ قاعدہ یہ ہے کہ حسب سبب تحقیق
ہے دہتی بہت دیر تک چمکتی رہتی ہے اور وہ گویا داغ حسرت بہت ہستی ہے۔

مرنے کی اسے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایان دست دبانے قابل نہیں رہا
فرماتے ہیں۔ عاشق کی حالت زار و زار دیکھ کر قاتل کو رحم آگیا اور اس نے قاتل پر رحم

ہو جانے کے بعد قتل کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اس ضمن میں کو اس طرح ادا فرماتے ہیں کہ میں
شایان دست دبانے قابل نہیں رہا۔ اب مجھ کو اپنے مرنے کی اور ہی کچھ تدبیر کرنی چاہئے
قاتل کا سہارا تو میری حالت زار نے مٹا ہی دیا اور حالت زار اس بات کی مستحق ہے کہ
کسی نہ کسی طرح مر جانا چاہئے۔

برائے مستش بہت دیر آئینہ باز ہے یاں مین زنا نفس و کامل نہیں رہا
فرماتے ہیں۔ آئینہ جس طرح مکس قبول کرتا ہے کچھ امتیاز نہیں کرتا بعینہ اسی طرز کی کیفیت

دل عارف اور اہل دنیا کی ہے۔ یہ شعر حقیقت اور مچا زردنوں پہلوئے ہونے ہے۔ اگر حقیقت
کی طرف اس شعر کو لے جانا چاہو تو مطلب یہ ہو گا کہ دل عارف پر اچھی بُری دونوں نسبتیں تو

نگن ہوتی ہیں۔ اور اگر اس شعر کے معنی مجازی لئے جائیں گے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ اہل دنیا کو
اپنے برے کلام کا فرق محسوس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ناقص و کامل کا فرق سمجھ نہیں سکتے

و کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن غیر از نگاہ اب کوئی حامل نہیں رہا
فرماتے ہیں۔ شوق خود نمائی نے نقاب حسن کے بند کھول دیئے ہیں یعنی ذرہ ذرہ پر

قطرہ قطرہ منظر تجلیات الہی ہے لیکن شکل یہ ہے کہ ناظر کی ظاہری آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی۔
اس لئے کہا گیا ہے کہ سوائے نظر کے کوئی حجاب درمیان میں باقی نہیں ہے چشم باطن وادھو
جائے تو حجابِ ظاہری اُٹھ سکتے ہیں۔

گو میں رہا رہیں ستمہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
فراٹے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں رنج و آلام دنیا میں مبتلا رہا لیکن تیری یاد کسی
وقت کسی حالت میں میرے دل سے نہیں مٹی اور میں کبھی تیرے خیال سے غافل نہیں رہا
یہ اور اس سے اوپر کا شعر خاص تصوف کے رنگ میں ہیں۔

دل سے ہوائے گشت و فاش گئی کہ وہاں جاہل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا
فراٹے ہیں۔ اب دل سے باغ و فاکہ آئندہ بھی مٹ گئی۔ حوصلہ پست ہو گیا۔ ہمت
جواب دید یا اور اس کا سبب یہ ہے کہ وفا کے بعد وفا کا صلہ حسرت و افسوس
کے سوائے کچھ نہیں پایا۔

بیدارِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
مطلع کے مصرع ثانی پر دوبارہ مصرع لگایا ہے۔ فراٹے ہیں۔ بیدارِ عشق سے میں
نہیں ڈرتا اور یہ گریزِ خون کے سبب نہیں ہے بلکہ اسے اسد ظلم اُٹھانے والا دل جو میرے پلو
میں تھا اور جس پر کھکھو ناز تھا وہ دل باقی نہیں رہا۔ اب بیدار کون اُٹھائے۔

رنگ گستاخ ہے کہ اس کا غیر سے خلا چھین عقل کہتی ہے کہ وہ بے ہرکس کا آشنا
فراٹے ہیں عشق نے تو میرے دل میں وہم پیدا کر دیا ہے کہ اسے غیر سے وہ محبت و خلوص
کے ساتھ ملتا ہے اور عقل ساری عمر کے تجربہ کے بعد یہ کہتی ہے کہ بھلا وہ بے ہرکس کی خلقت
میں محبت رکھی ہی نہیں گئی کس کا آشنا ہو سکتا ہے۔

ذرہ ذرہ۔ ساغرِ میخانہ شیرنگ ہے گردِ شمعوں خشک ہائے لعلِ آشتا
فراٹے ہیں۔ دنیا کا ایک ایک ذرہ میناؤ مگر و فریب کے ایک ایک ساغر کا حکم دیتا

ہے، اور یہ ساری نیرنگ سازی دنیا میں آسمان کے اشارہ سے ہو رہی ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ مجھوں کو دیکھ لو جو ان کی حالت میں اس کی باگ ڈور لیٹے ہی کے اشارہ سے ہے۔ شوق ہے سماں، حطر زماں میں رہا بے غم زورہ صحر اور سنگاہ و قطبہ دریا آشنا فرماتے ہیں۔ بار باب بے غم یعنی ان ن خاکی کا سرمایہ ناز عشق ہے جس کے سبب ایک ذرہ ناچیز صحران جاتا ہے اور قطرہ بے حقیقت دریا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ن خاکی جو ایک بے اعتبار ہستی رکھتا ہے عشق الہی تک ترقی بہم پہنچا کر جس طرح ذرہ صحر میں اور قطرہ دریا میں مل کر عین صحر اور عین دریا کہلانے کا سزاوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان ن ذات باری تعالیٰ تک عشق کی بدولت رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

شکوہ سنج رشک ہمدیگر نہ رہنا چاہئے میرا زانو موٹا اور آئینہ تیرا آشنا فرماتے ہیں۔ رشک اور ہمدیگر کی دونوں بے لطف کر دینے والی باتیں ہیں۔ یا ہم ہم دونوں کو ان دونوں باتوں سے قطع نظر کر لینی چاہئے۔ اس لئے کہ زانو میرا رفیق ہے۔ میں ہمیشہ سر زانو رہتا ہوں اور آئینہ نہ ہمارا آشنا ہے۔ اس سے تم ہر وقت مشغول رہتے ہو۔ بہتر یہ ہے نہ تم شکایت کرو نہ میں برا مانوں۔

میں اور ک آفت کا ٹکڑا وہ وحشی کی ہے عاقبت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا مجھے اس وحشی دل سے پالا پڑا ہے جو ایک آفت کا ٹکڑا ہے اور عاقبت کا دشمن ہے یعنی آرمے مجھ کو اپنے گھر میں بیٹھنے ہی نہیں دیتا عشق کے سودے میں آدا کر کے گلی گلی کرتے کہ چھپنے پھرتا ہے۔

کو کہن تھا میں یک مثال شیریں تھا اسد سنگ سے سرور کر ہوئے نہ پیدا آشنا فرماتے ہیں۔ اسے اسد تو کہن تے جو کوہ بے ستوں کو تراشا اس سے اس کی یہ غم غمی کہ ایک تصویر یہ در شیریں کی بنا لوں وہ نادان یہ نہ سمجھا کہ بجز کہیں پھر سے سرور کر بھی عشق پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا عشق کامل نہ تھا۔

ذکر آن پس می کش کا اور پھر بیان اپنا بن گیا قریب آخر تھا جو راز دان اپنا فرماتے ہیں میں نے جو عشق کے حُسن کی تعریف کی۔ تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشین تھا وہ بھی سُنکر میرا قریب بن گیا۔ اس واسطے کہ آدل تو ایسے پرپوش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جاوید بیاں کی زبان سے پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی اور پھر بیان اپنا یہ مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہے (از یادگار غالب)

مے وہ کیوں بہت پیٹے بزمِ غیر میں یارب آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحان اپنا فرماتے ہیں۔ اگر اُن کو اپنی عالی ظرفی کا امتحان منظور ہوتا تو وہ بزمِ غیر میں شرابِ مقدّہ سے زیادہ کیوں پیٹے۔ اس کے بعد صرت سے یہ فرماتے ہیں کہ یارب اُن کو اپنی عالی ظرفی کا امتحان آج ہی منظور ہوا۔ کاش یہ امتحان میری بزم میں ہوا ہوتا تو میں اُنکی زیادہ بخودی سے لطف و صل زیادہ حاصل کر سکتا۔ دوسرا رشک کا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ میری موجودگی میں کیوں اُن کو اپنا امتحان منظور ہوا۔ بدقسمتی سے میرے واسطے یہ نظارہ نہایت دلخراش اور ضبط آزا تھا۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا مطلب یہ ہے۔ ہم اپنی حقیقت و ماہیت سے بالکل بے خبر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا مکان عرشِ اعلیٰ پر واقع ہوا ہے۔ کاش ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا کہ ہم عرش پر منظر بنا کر اپنے مقام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے لیکن افسوس یہ ہے کہ مکان ایسی بلندی پر واقع ہوا ہے جس سے بلند تر اور کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔

مے وہ جس قدر ذلت ہم مٹی میں لیتے باسے آشنا نکلا اُن کا پاس بان اپنا یعنی خوب ہی ہوا کہ عشق کے درد کا پاس بان ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اُس کو مٹی میں ڈالتے رہیں گے اور یہ ظہر کہیں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے دربار اس کا قدیم سے ہی برتاؤ ہے (از یادگار غالب)

درِ دل لکھوں کتنا چاہوں ت کو کھدو انگلیاں نگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

فرماتے ہیں خط میں پناہ در بدل کب تک لکھتا رہوں یہ کبھی تو ختم ہی نہیں ہوتا اور اس طولانی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلیاں زخمی ہو گئیں اور قلم سے خون ٹپکنے لگا۔ بہتر یہ ہے کہ میں ان کے پاس چلا جاؤں۔ اپنی زخمی انگلیاں دراپنا خونچکاں خامہ ان کو دکھا دوں۔ امید تو یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں دیکھ کر وہ خود اپنے دل میں میرے در بدل یعنی میری مصیبتوں کو سمجھ لیں گے۔

گھستے گھستے مٹ جاتا آٹے کا عیث بدلا تنگ سجدے سے میرے تنگ ستار اپنا فرماتے ہیں۔ آپ نے اپنا تنگ آٹا اس لئے بدلا ہے کہ میرے سجدوں نے اُسے خراب یا ناپاک کر دیا تھا۔ مگر آپ نے ایسا کیوں کیا وہ تو خود ہی کثرت سجدے سے کھس جاتا۔ اس وقت نیا پتھر اُس کی جگہ لگا دیا جاتا۔

تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں بھنے ہنر بان اپنا فرماتے ہیں۔ ہم دشمن کی زبان سے دوست کی شکایت اُگلا لیتے ہیں اور پھر خود بھی اُسکی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں اور یہ اس غرض سے ہے کہ وہ کہیں ہماری جنبی یا رے سے جا کوڑکی گویا ہم نے شکایت یا رے میں اُس حق کو اپنا ہنر بان بنا لیا ہے۔

ہم کہاں کے دانائے کس منہ میں بھیتا ہے بے سبب غالب دشمن آسمان اپنا یہ بات مشہور ہے کہ آسمان اہل کمال کا دشمن ہوا کرتا ہے۔ میرزا صاحب اپنی کسر نفی سے فرماتے ہیں۔ ہم ایسے کہاں کے عقلمند اور فن سخن میں بھیتاے روزگار تھے۔ اسے غالب ہمارا دشمن تو آسمان بے سبب ہو گیا ہے اور یہ بات، دہر جادی ہے کہ بے سبب آسمان دشمن ہوا نہیں کرتا۔ آسمان کی دشمنی کے سبب دانائی اور بھیتائی ہوا کرتے ہیں۔ لہذا اپنی دانائی اور ہنرمندی جس خوبی کی یہ ظاہر کی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ کہ ہے چشم سریدار پاجاں میرا میرزا صاحب نے یہ شعر اپنے حسن کلام کی تعریف میں لکھا ہے یعنی میرے کلام کو فیض عام ہے اور اس سے محنت نفع حاصل ہو سکتا ہے اور وہ صرف اس غرض سے ہے کہ خبردار کی آنکھ پر میرا

احسان رہے یعنی بصارت سخن فہمی اس سرمد سے حاصل ہوتی ہے۔

خصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم تیرے چہرے سے ہوتا ہر غم یہاں میرا
یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ہوگی تو ہم ضبط نالہ کرینگے اور اس کا اثر ضرور ہے کہ تجھ تک پہنچے گا۔
نالہ دل سے نکلتا ہے اور ضبط کی حالت میں وہ دل ہی میں دھوئیں کی طرح گھٹیکا۔ مثل مشور ہے کہ
دل سے دل کو راہ ہوتی ہے تیرے دل تک اسکا اثر پہنچے گا اور انجام کا تیرے چہرے سے وہ اثر ظاہر ہوگا۔

غافل مجھم ناز خود آرا ہے ورنہیاں بے شانہ صبا نہیں طرہ گسیاہ کا
دراے ہیں اہل دنیا راز حقیقت سے خبردار نہیں ہیں۔ ہر شخص کی طبیعت میں فخر و ناز کا
ایک ادہ ہے جو سب کے دلوں میں یہ دھم پیدا کر دیتا ہے کہ ہم نے یہ کام اچھا کیا اور ہماری تدبیر سے
یہ کام بن پڑا۔ حالانکہ جو کچھ ہے سب اس کی طرف سے ہے۔ بغیر حکیم الہی کے یہاں کچھ نہیں ہوتا
لطف الہی کو بار صبا سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ صید بزم دام حبسہ ہے اس دام گناہ کا
بزم قدح۔ بزم شراب۔ صید بزم دام حبسہ۔ وہ شکار جو جاں میں جھپکنے لگی ہو۔ مطلب یہ
ہے کہ بزم سے خوشی سے عیش و عشرت کی تمنا رکھنی ایک ایسا شکار ہے جس پر قبضہ نہیں رہ سکتا۔
عیش و عشرت کو دنیا میں ثبات حاصل نہیں ہے۔ نازک خیالی اس شعر میں یہ ہے کہ تیرے غریبی
سے تھوڑی دیر کے لئے جو رنگ چہرے پر آ جاتا ہے وہ نشہ اُتر جانے کے بعد قائم
نہیں رہتا۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
فرماتے ہیں۔ گناہ کا عذر کرنا ایک آسان بات ہے۔ مگر ہم عذر گناہ بہ تراز گناہ جانتے ہیں
اس لئے عذر گناہ بھی نہیں کر سکتے۔ مگر ہماری مذمت اور شرمندگی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اگر
رحمت اس کو عذر گناہ کی جگہ قبول کرے تو کیا بعید ہے۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے پُر گل خیالِ رحمت سے دامن گناہ کا

فرماتے ہیں۔ شوق شہادت میں قلنگاہ کو اس خوشی کے ساتھ جاتا ہوں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولہا سہر بندھے ہوئے چلا جاتا ہے۔ میں نے گویا خیالی زمروں سے نگاہ کے دامن کو بھر لیا ہے۔

جاں ورمو اسے یک نگہ گرم ہے اسے پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا فرماتے ہیں۔ اسد تیری نگاہ و لطف کے شوق دآند میں اپنی جان دینی چاہتا ہے اور پروانہ کو اپنا وکیل بنا کر تیری بزم میں داد چاہنے آیا ہے۔ جان دینے کا تاشہ پروانہ شمع پر جل کر بجھ کر دکھا دیگا۔ اسی طرح تو ایک نگاہ گرم سے اس کی یعنی اسد کی جان لے لے۔

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلا میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ جور سے باز آگئے ہیں مگر ایسے ظالم ہیں کہ جور سے کیا باز آئیں گے یعنی ہرگز ہرگز ستم نہ چھوڑیں گے۔ اس لئے کہ جور سے باز آ کر یہ فرماتے ہیں کہ اب ہم شرمندگی بستم کی وجہ سے تجھ کو منہ نہیں دکھا سکتے۔ عاشق سے چھپنا اس کے سامنے نہ آنا بھی تو ایک طرح کا ظلم و ستم ہے۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسمان جو رہ گیا کچھ نہ کچھ گھبرا میں کیا اس شعر میں شان توکل دکھا کر فرماتے ہیں کہ سات آسمان دن رات ہمارے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے لئے جو کچھ حکم الہی ہے اس کے سامان خود بخود مہیا ہو جائیں گے ہم کیوں گھبرا میں اور پریشان ہوں۔

لاگ ہو تو اس کو ہم تجھ سے لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھا میں کیا لاگ دشمنی۔ اور رنگ و محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اقد نے بھی بانڈھا ہو۔ مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر بانڈھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب یہ کہ عشق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے اور نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اس کو دوستی سمجھتے لیکن جب دوستی نہ ہو تو دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھا میں۔ قلم نظر خیال کی حمد کی اور نہ رت کے لاگ اور یہی دو لفظ ہم پہنچا ہے میں جینا

ماخذ متحی اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دو چند کر دیا ہے
(از یادگار غالب)

ہولے کیوں نامہ برس کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
خط کا جواب حاصل کرنے کا شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ نامہ برس کے ساتھ ساتھ چلے جاتے
ہیں اور اس شوق میں ایسے محو ہیں کہ یہ بھی یاد نہیں رہا کیوں نامہ برس کے ساتھ ہولے میں دوسرے
مصرع میں تعجب سے ارشاد ہوتا ہے یارب اپنے خط کو ہم خود کیا پہنچائیں یہ تو ایک شرمناک
بات ہے۔ اس بیان میں جو لطف ہے وہ محتاج شرح نہیں۔

موج خوں سر سے گزری کیوں چائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
موج خوں سے یہاں ایذا و تکلیف مل رہی ہے۔ فرماتے ہیں ہمیں خواہ کتنی ہی تکلیف
کیوں نہ پہنچے مگر اب آستانِ یار پر آجھے ہیں اور دھمکی دیدی ہے تو یہاں سے اٹھ کر
کیا جائیں گے اب تو مری کے کماؤ خیں گے۔

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت
زندگی سے ضرور بہتر ہوگی۔ اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھائے ہیں جس کا تمام عمر منتظر
رکھا ہے۔ (از یادگار غالب)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلاؤں کیا
اس مقطع میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں اور دونوں لطف سے خالی نہیں ہیں۔ ایک معنی یہ
ہے کہ وہ دریافت کرتے ہیں غالب کون شخص ہے اور کیا آدمی ہے۔ مشورہ طلب یہ بات ہے
کیا ہم صاف صاف یہ کہیں کہ وہ ہمارا عاشق اور دلدادہ ہے۔ اس میں کچھ تباہی تو نہ ہوگی
دوسرے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ وہ غالب کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں
یعنی تباہی بے عارفانہ کرتے ہیں۔ اب ہم کو کوئی صلاح بتائے کہ ہم اس کا جواب ان کو کیا دیں۔

فہم

سنانیت سے کشت فستہ جلوہ پیدا کرتی سکتی چمن رنگارنگ ہے اسی سے باد بہاری کو
 فراتے ہیں سنانیت میں جب تک کشت شامل نہ ہو جائے جلوہ ثانی کی قابلیت پیدا
 نہیں کر سکتی۔ مصرع ثانی میں بات بات پر یعنی باد بہاری کا جلوہ چمن کے ذریعے سے
 نمودار ہوتا ہے تو یہ چمن ہی سبزی کے اعتبار سے اسی سے باد بہاری کا رنگارنگ ہوا کرتا ہے مطلب
 یہ ہے کہ کشت چمن لطافت جلوہ باد بہاری کے باعث سے ہے۔

حریفہ چشمن و یائیں خود واری شامل جہاں ساقی ہو تو دغوی و باطل ہوشیاری کا
 یعنی ساحل لاکھ اپنے کو بچائے مگر جب دریا طغیانی پڑتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا
 یہ طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری نہ ہو دعویٰ تل میں سکتا۔ یہ شہر حقیقت و مجاز دونوں
 پر محمول ہو سکتا ہے (از یادگار غالب)

فہم

عشر بیت قطر ہے دریا میں فنا ہو جانے درو کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جانے
 یعنی جب درد سے گزر جائیگا تو مر جائیگا گے یہ فنا ہو جائیگا مگر اتحاد و ریاضت سے
 جائیگا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس درو کا حد سے گزر جانا بھی اس کا دوا ہو جانا ہے
 (از یادگار غالب)

تجربے سے فست میں مری صورت قفل ابجد تھا نکھارات کے بنتے ہی جدا ہو جانے
 فرماتے ہیں میرا نوشتہ قسمت تنہا ابجد کی طرح واقع ہوا تھا۔ قفل ابجد اس کہتے ہیں جس
 حلقوں پر حروف ابجد کندہ ہوتے ہیں قفل کا بنانے والا حروف مفرد سے ایک فقرہ ترتیب سے
 بنایا ہے کھولتے وقت جب وہ فقرہ مرتب ہو جاتا ہے تو قفل کھل جاتا ہے۔ مرزا صاحب
 فرماتے ہیں کہ میرا نوشتہ قسمت یہی تھا کہ جب تجھ سے ربط دلی پیدا ہو جائے تو جدائی حاصل ہو۔

دل ہوا کشش چارہ زحمت میں تمام رٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا دوا ہو جانے
 فرماتے ہیں۔ دل کی تکلیف نفع کرنے کے واسطے اس قدر تدبیروں کی کشمکش ہوتی ہے کہ
 کام تمام ہو گیا۔ دوسرے مصرع میں اس کی مثال پیش کرتے ہیں یعنی جس طرح گھسنے گھسنے سے گڑہ رٹ

ہے نہ ڈورا باقی رہتا ہے۔ میرے دل کو اس کے علاج نے تمام کر دیا۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمن ارباب دوست ہو جاتا

اس شعر کا لطف و جدائی ہے۔ بیان میں نہیں آ سکتا۔ فرماتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم

پر طرح طرح کے لطف اور قسم قسم کی عنایتیں ہوتی تھیں۔ اب ایک یہ وقت ہے کہ ہم پر جفا بھی

کرتے۔ بیزاری بخشگی نفرت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ قسم کرنا بھی ناگوار خاطر ہے۔ اللہ اللہ اس قدر

ارباب و فاکار دشمن ہو جانا۔

ضعف سے گریہ مبتدل بہم سرور ہوا باور آیا ہیں پانی کا ہوا ہو جانا

مسئلہ استعارہ غماص کے اب تک ہم قائل نہ تھے مگر جب دیکھ لیا کہ ضعف اور ناتوانی کی وجہ

ہمارا گریہ دم سرور سے بدل گیا تو امتحان کے بعد ہم کو یقین ہو گیا کہ پانی ٹھنڈی ہوا سے بدل جایا

کرتا ہے۔

دل سے مٹا ترے انگشت خانی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا ٹھنڈا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ بھلا کیس گوشت سے ناخن بھی جدا ہوا کرتا ہے۔ ہم اپنے دل سے تیری قدق

بند انگلیوں کا خیال کیونکر مٹا سکتے ہیں۔ مٹ ہی نہیں سکتا یعنی یہ امر ناممکن الوجود ہے۔

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر گھٹا روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غم فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے

ابر بہاری کا برس کر گھٹنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔ (از یادگار غالب)

گر نہیں بکھبت گل کو تیرے کوچہ کی ہوس کیوں ہے گرد و ہوا چلان صبا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ اگر چلوں کی خوشبو کو تیرے کوچہ میں پہنچنے کی ہوس و آرزو نہیں ہے تو کیسے

یہ باد صبا کے ساتھ ساتھ چکر کاٹتی پھرتی ہے۔

تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے سیقل دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

آئینہ فولادی پر برسات کی ہوا سے رنگ آ جاتا ہے۔ میرزا صاحب مثال کے طور پر فرماتے

ہیں کہ صرف باغ و صحرا میں موسم بہار کا، شطہ ہر نہیں جوتا۔ بلکہ آئینہ فولاد تک اس سے متاثر ہوتا ہے مطلب یہ ہے موسم بہار کی ہوا سے فرحت و انبساط حاصل کرنی چاہئے۔

بخشنے ہے جلوہ گلِ ذوق تماشا غالب چشم کو چاہئے ہر رنگ میں راہِ حُبِ ناما
فرماتے ہیں۔ لے غائبِ باغ میں رنگِ بنگ کے پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر یہ شوق پسند ہوتا ہے کہ چشمِ حقیقت میں کو ہر رنگ میں راہِ حُبِ ناما چاہئے۔ یعنی ہر طرح کے سیر و تماشے سے، چھا
بُرائیتجہ اخذ کرنا چاہئے۔

ردیف بارے موصدہ

پھر ہوا وقت کہ ہوا لکشا یوج شراب لے بطمے کو دل و ست شامیج شراب ۴۱
فرماتے ہیں۔ وہ وقت آگیا ہے کہ موجِ شراب اُڑنے کے لئے اپنے بازو کھولے اور لپٹے
کو تیرا کی کا شوق رکھنے والا دل موجِ شراب عطا کرے۔ ایران میں قاعدہ ہے کہ جب لکڑیاں رکھ جاتا
ہے تو سنگ مرمر کے حوضوں میں اس کو بھر دیا جاتا ہے۔ آفتاب کی تیزی سے دو چار دن کے بعد اُسکا
عرق ٹھکن شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت زعفران کے ان حوضوں میں اتر کر پاؤں سے روندتے ہیں
اس کے بعد سٹی کی منہ بند صراحیاں اس میں ڈال دی جاتی ہیں۔ بطمے اس صراحی کو کہتے ہیں۔
مسامات کے ذریعہ سے عرق اُگو چھنکر صراحیوں میں بھر جاتا ہے۔ شرابِ ناب خاص اس شراب
کو کہتے ہیں۔ مطلب شراب کا یہ ہے کہ پھر بار آگئی ہے اور شراب کی خوشبو ہوا پر پھرا اُڑنے لگی ہے
پھر صراحیاں بطوں کی طرح سے حوضوں میں تیرتی پھرتی ہیں۔

پوچھت و جہِ سیستی ارباب چمن سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا یوج شراب
ارباب چمن۔ درختانِ چمن۔ فرماتے ہیں۔ تاک کے سایہ میں ہوا اس قدر تازہ آئینہ
ہے گویا موجِ شراب بن گئی ہے۔ درختوں کا جھونسا ہوا کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ سیستی
نشہ کی وجہ سے ٹہنیاں جھوم رہی ہیں۔

جو ہوا عرفہ مے بخت رسا رکھتا ہے ستر گز سے پہنچی ہے بالِ ہوا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ اعتدال سے شراب پینے والوں کا ذکر نہیں ہے وہ تو تریف سے سستے ہیں وہ لوگ جو شراب بے انتہا پیتے ہیں اور داغ اُن کا کثرتِ نشاء سے معطل ہو جاتا ہے۔ اس صفت میں بھی اُن کو بادشاہی کا درجہ حاصل ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ شراب کا نشہ بیوش کر دینے کے بعد بھی بال ہما کا حکم رکھتا ہے شہو ہے کہ جس شخص کے سر پہ ہما کا سایہ پڑ جاتا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر موج، مستی کو کرے فیض موج شراب فرماتے ہیں کہ برسات کے زمانہ میں افتادہ زمیوں پر بھی سبزہ پیدا ہو جاتا ہے کیا عجب ہے کہ بادِ بہاری موجِ مستی کو موجِ شراب بنا دے مطلب یہ ہے۔ بہار کا موسم طبعیوں میں جوش و دلولہ پیدا کر دیتا ہے۔

چار موج اُٹھتی ہیں طوفانِ طرح کے ہر سو موج گل موج شفق موج صبا موج شراب فرماتے ہیں جوشِ طرب ایک وریاے طوقاں خیر ہے جس میں یہ چار موجیں یعنی موج گل، موج شفق، موج صبا، موج شراب بلند ہو کر تلی ہیں۔

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنہ ناز لھے ہے تسکین بدہم آبِ بقا موج شراب فرماتے ہیں۔ بارش سے مدخول میں جس طرح قوت نو پیدا ہوتی ہے اسی طرح موج شراب شراب خواروں کے دلوں میں منگ اور جوش پیدا ہو جاتا ہے یعنی شراب ایک قسم کی قوتِ نامیہ ہے جو انسان کے دل میں نشوونما کے ساتھ فخر و ناز کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔

بسکہ دودھے ہے گلابِ ماکِ میوے ہو جو شہ پیرنگ سے ہے بال کشا موج شراب فرماتے ہیں۔ انگور کی بیلوں میں مارہ شراب سی طرح دوڑ رہا ہے جس طرح رنگوں میں خون دہرہ کرتا ہے اور خون کے دہرہ سے جیسے انسان کا چہرہ گل رنگ ہو جاتا ہے ویسے ہی انگور کی بیوے میں موج شراب بھری و شادابی پیدا ہو گئی ہے گویا بھری و شادابی کا پیدا ہونا پرواز ہے۔ موج گل کے چراغاں سے گزر گاہِ خیال ہے تصویریں بس جلوہ تما موج شراب فرماتے ہیں۔ رنگ، برنگ کے چوں نے کھل کر خیالی رستوں پر چراغاں کی بار پیدا کر دی

ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ تصور میں موج شراب جلوہ نما ہے۔

نشہ کے پردے میں ہے موجِ تاشائے دماغ بسکہ رکھتی ہے سبز نشو و نما موجِ شراب
فرماتے ہیں موجِ شراب نشہ کے پردے میں موجِ تاشائے دماغ ہے اور یہ اس واسطے
ہے کہ نشو و نمائی کا ثبوت رکھتی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح خیال ترنی کرتے کرتے بہت بڑھ
جاتا ہے اسی طرح شراب کا نشہ و غم میں پہنچ کر بڑھتا رہتا ہے۔

ایک عالم یہ ہیں طوفانی کیفیت فصل موجِ سبزہ خوشی کے زما موجِ شراب
فرماتے ہیں کیفیت فصل بہاری اور کیفیت موجِ شراب نے زمانہ بھر میں طوفان مٹا
رکھا ہے یعنی فصل بہاری نے سبزہ و گل بے انتہا پیدا کر دیے ہیں اور نشہ شراب نے نشاط و طرب
بے حد مٹا کر دی ہے گویا دنیا میں ان دونوں چیزوں کا طوفان آگیا ہے۔

شرح ہنگامہ ہستی ہے شے موہم گل رہبرِ قطرہ بدیہا ہے خوشا موجِ شراب
فرماتے ہیں موہم گل کا جوش تیار رہا ہے کہ ہنگامہ ہستی کی گرم بذاری خاص میرے ہی دم
سے دنیا میں قائم ہے گویا میں ہنگامہ ہستی کی شرح ہوں اور اسی طبع موجِ شراب دعوئے
کر رہی ہے کہ میں قطرہ کو دور یا تک پہنچانے کے لئے حضورِ راہ کا حکم رکھتی ہوں یعنی جس طرح
قطرہ فنا ہو کر دریا میں جاتا ہے اسی طرح نشاء شراب روح کو بیخودی کے عالم میں اس
کے مرجع تک پہنچا دیتا ہے۔

ہوش اڑتے ہیں سحرِ جہوہ گل دیکھ اسدل پھر ہوا وقت کہ ہوا بال کش موجِ شراب
فرماتے ہیں اے سحرِ جہوہ گل دیکھ میرے ہوش اڑنے شروع ہو گئے ہیں اب معلوم ہوتا ہے
کہ ہمارے ساتھ ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ حبیبِ موجِ شراب ہوا پر اڑنے لگے یعنی ملکِ جگہ
شراب کی بھٹیاں بن جائیں۔

روایت (ت)

افسوس کہ دیدان کا کیا رزق فلک نے جن لوگوں کی تھی درخورِ عقیدہ گہرا گشت

ویدان حج وود بالکسر یعنی کرم فرماتے ہیں جن لوگوں کی انگلیاں موتیوں کے چھلکوں کے
قابل تھیں ان کو آسمان نے مرنے کے بعد ویدان کا رزق بنا دیا ہے جی افسوس ہے چھوٹے چھوٹے کپڑے
ان نازک نازک انگلیوں کو قبر میں نوش فرما رہے ہیں جو موتیوں کے چھلکوں میں رہتی تھیں۔
کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا خالی مجھے دکھل کے بوقت سفر نکشت
قعدہ ہے کہ بوقت سفر یاد تازہ رکھنے کے لئے نشانی کے طور پر اکثر چھلکے آدیا جاتا ہے میرا جتنا
فرماتے ہیں کہ اس نے مجھ کو بوقت سفر ملا۔ زکے لئے بجائے چھلے کے خالی انگلی دکھا دی اور
یہ بات میرے لئے چھلے کے داغ سے زیادہ ہو گئی۔ میں یہی نشانی اس کی یاد رکھوں گا کہ
اُس نے مجھے نشانی کا چھلکے بھی نہ دیا۔

لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم ترک نہ سکے کوئی سرے حرف پر انگشت
سخن گرم۔ اشعار نثر۔ فرماتے ہیں۔ اے اسد میں ایسے لطیف اندر پاکیزہ اشعار لکھتا ہوں
کہ میرے کلام میں مخ لطف عیب نکال ہی نہیں سکتے۔ حرف پر انگلی رکھنی عیب جوئی کرنے کو کہتے ہیں۔
رہا اگر کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنے سے حضرت سلامت
مرنا ہے یعنی موت لازمی اور ناگزیر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص قیامت تک بھی زندہ رہا
تو پھر کیا۔ مرنا لازمی ہے۔ قیامت کے دن مرے گا۔ قیامت کے دن مرنے میں یہ لطف پیدا ہو گیا ہے
کہ روز قیامت زندہ ہونے کا دن ہے۔ اس دن کسی شخص کا مرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔
جگر کو مرے عشق کو خنابہ مشرب لکھے ہے خداوند قیامت سلامت
عشق کو خنابہ مشرب۔ عشق جس کے مذہب میں خون کھانا جائز ہو فرماتے ہیں عشق کی خوراک
ذہن ہے۔ میرے جگر کا خون پیکر عشق نے بدورش پائی ہے۔ اسی وجہ سے میرے جگر کو خنابہ مشرب
خداوند قیامت تحریر کرتا ہے۔

علی الزعم دشمن شہید وفا ہوں مبارک مبارک سلامت سلامت
فرماتے ہیں۔ ہر غارت دشمن شہید وفا ہوں۔ مبارک ہو۔ اور شہید وفا ہوں یعنی شہادت

ہے سے زندہ جاوید ہو گیا ہوں، اس لئے سلامت رہوں گا۔

نہیں رُسرو برگ، دراک معنی تماشا کے نیزنگ صورت سلامت

فرماتے ہیں۔ اگر شاید ذات باری تعالیٰ نہ ہو اور کائنات کا دراک چل نہ ہو سکتا ہی
وجود اشیا کی رنگ برنگ صورتیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے ہونے کا کامل یقین تو حاصل ہو گیا۔ ہاں یہ
یقین ہی سلامت رہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا کوئی ہے۔

مُتَمَنِّئِیْنِ کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غایت یا رانے مری بالیں پر سے پھر کس وقت

ذاتے ہیں میرے احباب میری بالیں پر اس کو اس وقت، اے کہ جب میں نزع کی کشمکش میں
بتلا تھا جس طرح چراغ ٹٹا کر گل ہو جاتا ہے اسی طرح آنکھیں کھولتے ہی کھولتے ہی تے بند ہوئیں
مطلب یہ ہے کہ یہاں نے بے وقت کوشش کی اور دوست نے بے موقع عزت فرمائی۔

اگر خطا ہے تو اسے سرور جو بازار دوست دود شمع کشتہ تماشا یہ خطا رہا دوست

فرماتے ہیں۔ رخساروں پر سبزہ آواز ہو جانے سے گری سن کی سرور بازاری ہو گئی معلوم ہوتا
ہے کہ خطا رخسار دوست بھی ہوئی شمع بھا، حواں تھا جس کے پیدا ہوتے ہی حسن کے دھار میں حیرت
مچھالیا۔ ورسائے خریدار صیبت ہو گئے۔

سے دل ناما قیامت اندیش ضبط شوق کر کون لا سکتا ہے تب جلوہ دیدار دوست

فرماتے ہیں۔ سب انجیم کا نہ سوچنے والے دل اپنے شوق دیدار کو ضبط کر کے کیا تیرا کہ یہ نہیں
ہے کہ طور پر حضرت مونس کا ذرا سی دیدار کی بھیجک، دیکھ کر کیا حال ہو گیا تھا۔ جدو دیدار دوست کی بہ
کون لا سکتا ہے؟

خانہ ویراں سازی حیرت تماشا کیجئے صورت نقش قدم ہوں فتنہ رفتار دوست

فرماتے ہیں۔ حیرت کی خانہ ویرانی کو ملاحظہ کیجئے یعنی ہم حیرت میں مبتلا ہو کر اپنے گھر کو بھول گئے
ہیں ورنہ گھر بغیر ہمارے ویران ہو گیا ہے ہم نے دوست کی رفتار کا تماشا دیکھا تھا اس کا اثر
یہ ہوا کہ نقش قدم کی طرح جو دو دو ہوا ہو کر زمین پر گر پڑے ہیں اور یقین ہے تھوڑی دیر

میں بسٹ جائیں گے۔

عشق میں پیدا و رشک غیر نے مارا مجھے گشتہ دشمن ہوں آخر چہ تھا بیمار دوست
فرماتے ہیں۔ میں دوست پر مبتلا ہو کر مدت سے عشق کے آزار کا بیمار تھا۔ نیم جاں تو پہلے ہی
سے تھا اب رشک دشمن کے ظلم نے رہا سہا بھی ہلاک کر دیا پہلے میں بیمار دوست تھا اب کشتہ دشمن
بن گیا افسوس کہ میرا انجام اچھا نہ ہوا۔

چشم مار دشمن کہ اس بیہ دکا دل شاد ہے دیدہ پرخوں ہمارا ساغر شراب دوست
فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم عشق میں خون کے آنسو رو رہے ہیں مگر صرف اس وجہ سے
کہ اس بیہ دکا دل میں خون کے آنسو سے روتا ہوا دیکھ کر شاد ہے اس لئے ہم بھی کہتے ہیں
چشم مار دشمن یعنی اب ہم بھی اپنے دیدہ پرخوں سے خوش ہیں اس واسطے کہ ہمارا دیدہ پرخوں
ساغر شراب دوست بن گیا ہے مطلب یہ ہے جس طرح شراب پیکر سرور محال ہوتا ہے اسی طرح
اس بیہ دکا دل ہم کو خون کے آنسو روتا ہوا دیکھ کر سرور ہوتا ہے اور اس کے خوش ہونے سے ہم بھی
شاد ہیں۔

غیر کلوں کرتا ہے میری پرستش اسکے میرا بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غنچہ دوست
اس قطع میں کس خوبی کے ساتھ میرزا صاحب نے دشمن کے منافقانہ برتاؤ کی تصویر کھینچی ہے اور اس کے
ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ دشمن کا انداز التفات اس کی اپنی شہنی پر مبنی ہونے کے علاوہ کمال دشمن
ملکہ آتش رشک کا بھڑکانے والا ہے۔

تا کہ میں جانوں کہ ہے اسکی رانی داں تاک مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست
فرماتے ہیں۔ مذکورہ بالا التفات دشمن اس غرض سے بھی ہے کہ میں یہ بات سمجھ لوں کہ اسکی
رانی نہ تاک ہے اس لئے مجھ کو پیام وعدہ دیدار دوست کا قریب بھی دیتا ہے۔

جبکہ میں کرتا ہوں پنا شکوہ ضعیف دماغ سر کرے ہے وہ حدیث شریف عنبر بار دوست
فرماتے ہیں اسکی ڈینگیں منکر جو میں نے ضعیف دماغ کی شکایت کرتا ہوں یہی یہ کہتا

ہوں کہ تیری فضول جوں سے میرا سر بھرا جاتا ہے تو وہ مکار زلف غنبر دوست کی تعریف شروع
کر دیتا ہے۔ اس سے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ غنبر زلف یا زلف کی کمزوری کا علاج ہے۔ یہ تو
کیوں میرے ساتھ باتیں کرنے سے صنف دماغ کی شکایت کرتے ہو۔

چپکے چپکے بچکے دوست دیکھ پاتا ہے اگر ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست
ڈالتے ہیں میرے چپکے چپکے روتے کا علاج شوخی گفتار دوست کا بیان سمجھ کر اسکی یعنی دوست
کی باتوں کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔

مہربانی دے دشمن کی شکایت سمجھے یا بیاں کیجے سب پر لذت زبردست
تپ فراتے ہیں کہ دشمن کی سمت آئینہ مہربانیوں کی شکایت کی جائے یا ظلم دوست کی شکر گزری
بیان ہو۔

غزل اپنی بھجی سے پسند آتی ہے تپ ہے ردیف شعر غالب بن بکار دوست
فراتے ہیں۔ اسے غالب یہ غزل اپنی مجھ کو دل سے پسند ہے۔ اس واسطے کہ اسکی ردیف
میں لفظ دوست بار بار آیا ہے جو لفظ ختم شعر بقیوں کے بعد بار بار آتا ہو اسکو ردیف کہتے ہیں۔

ردیف جیسیم

گلشن میں نہ بدست بزم گریہ ہے آج نثری کا طوق حلقہ بیرون در ہے آج
حلقہ بیرون در سے دروازہ کی محراب مراد ہے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں گلشن میں مہاراجہ
ہے اس لئے دوسرا نہ بدست کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حلقہ بیرون در یعنی محراب در قمری کا طوق بستی
ہے آج جو شخص چمن کی سیر کو باتیں میں آئیگا وہ قمری کی طرح گرفتار چمن ہو جائیگا۔ تادمہ ہے ہمارے
موسم میں جو من جنوں ہو کرتا ہے آج کل باغ کی ہوا اور سیر چمن جنوں نہیں ہے۔

آتا ہے ایک پارہ دل ہر نقاب کے ساتھ تا بغض مند شکا بہ شرم ہے آج
فرماتے ہیں۔ آج میری ہر آہ سے ساتھ یک میرے دل کو ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ تا بغض ک
کند نے تڑو شکا کر لیا ہے مطلب یہ ہے کہ آج میری آہ میں تاخیر پیدا ہوگئی ہے اور اس کا تڑو مسیگر

دل پر چور ہے۔ اس لئے مجھ کو اپنی آہوں سے کامیابی کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

اے عاقبت کنارہ کراے انتظارِ مہل سیلابِ گریہ درپے دیوارِ دور ہے آج
فرماتے ہیں۔ اے عاقبت یعنی آرام و راحت سے زندگی بسر کرنے کے زمانے میرے پاس سے
دور ہو جا اور اے انتظام تو بھی اس گھر سے رُفُو چکر ہو۔ میرا سیلابِ گریہ یعنی میرے اشکوں کا طوفان
اب میرے گھر کو گرانے والا ہے۔ آج کے بعد میری زندگی کے دن مصائب و کالیفت میں گزرینگے
تم دونوں میرے ساتھیوں ایذا سہتے ہو۔

تو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں اچھا اگر نہ تو مسیحی کا کیا علاج
فرماتے ہیں۔ مہشوق مریضِ عشق پر یہ الزام لگانا ہے کہ تیرا کوئی بیمار دار نہیں ہے جو وقت
پر دوا پلائے اور پرہیزی غذائیں کھلائے بے تدبیری اور بد پرہیزی سے مرض بڑھتا جاتا ہے
میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم مریضِ عشق کے بیمار دار بنتے ہیں اور اسکی دوا وغیرہ کی غرائی ہمارے
ذمہ ہے لیکن پہلے یہ بات طے ہو جانی چاہیے کہ مریضِ عشق اگر چھانہ ہو یعنی دوائے وصل سے بھی
اس کا مرضِ عشق زائل نہ ہوا تو مسیحی یعنی مہشوق کی کیا سترائو تیر کی جلتے میرزا صاحب کا کہنا
یہ ہے کہ مریضِ عشق کسی طرح صحت یاب ہو ہی نہیں سکتا۔

روایتِ نجیم قاری

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر یہ سچ ہے
فرماتے ہیں۔ انسان کو اُمید و آرزو کا میلابی کی حالت میں بھی ترک نہ کرنی چاہئے اگر شراب
نہیں ہے تو بھی ساغر کا انتظار کھینچنا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کامیابی کی توقع کسی حالت میں نہ چھوٹی
چاہئے۔ انتظار کھینچنا اور شراب کھینچنا دو محاورے ہیں۔

کمال گرمی سے تلاش دید نہ پوچھے برنگِ خار مرے آئینہ سے جو ہر کھینچ
فرماتے ہیں۔ میرے آئینہ کمال کی گرمی و سی کا حامل مجھ سے نہ پوچھو۔ اہل نظر کی تلاش
جو جستجو میں اتنی صوبتیں اور کلیفیں میں سے اُٹھائی ہیں کہ اب میرے آئینہ کمال کا جو ہر ہری آنکھ

میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ قدروان کمال کے نہ ملنے سے یاموں ہو کر صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا ہی مجھ کو مل جائے جو جوہر کمال کو میرے آئینہ کمال سے کانٹے کی طرح کھینٹ لے۔

مجھے بہانہ راحت ہے انتظار اسے دل کیا ہے کس نے اشارہ کیا نہ بستر کھینچ

فرماتے ہیں بستر پر لیٹے معشوق کا انتظار کھینچنا یا تیند کا انتظار کھینچنا کھلی ہوئی بہت جلدی ہے۔ وعدہ یا رکاوٹ کا یہ اشارہ نہیں ہے کہ عاشق چنگ پر لیٹ ہوا بستر کے ناز اٹھائے۔ اگر معشوق وعدہ

پر نہیں آیا ہے تو نہ آنے کی وجہ دریافت کرنے میں کوشش کی جائے۔ بالکل ناامیدی کی صورت

میں بادیہ گردی صحراؤں کی جامہ دوری ناکہ کشی بہت سے کام ایسے ہیں کہ جن میں صبر نہ ہو کہ عاشق وقت

گزارا سکتا ہے۔ اور اگر صرف نیند کے انتظار میں آدمی پڑا کر دوسرے دن کے لئے بھی بہت شغل

ملنے ہو سکتے ہیں مطلب یہ ہے ہر قسم کے آدمی کے واسطے راحت طلبی ممنوع سمجھی جاتی ہے۔

تری طرف ہے۔ حسرت نشانہ نگرں بکوری دل و چشم قیہ ساغر کھینچ

فرماتے ہیں۔ نگرں کھلی بندھے ہوئے پنکھا حسرت تیرا منہ نکلتا ہی ہے اور میرے سامنے

تجھ کو کسی کا دیکھنا نہا برقاہت ہے۔ لیکن یہ میری رقیب جی نگرں صبیحہ کی بھی اندھی ہے اور افسوس

کی بھی اندھی ہے اس خوشی کے موقع پر تجھ کو شراب پینی چاہئے۔

نیم غمزدہ ادا کر حق و دیست ناز نیام پر وہ زخم جگر سے خب کھینچ

فرماتے ہیں۔ داؤد ناز بھگوان افسردہ تالی سے بختے ہیں وہ گویا اس کی امانت کا حق

نیم غمزدہ سے ادا کرو اور پورا غمزدہ ہو جائیگا۔ تو فوراً عاشق کی جان نکل جائیگی۔ اس لئے تجھ کو لازم ہے کہ

نیم غمزدہ سے کام لے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر زخم جگر میں وار کرنے سے بعد خیر ہو جائیگا۔

تو بے ل فوراً جاں بحق ہو جائیگا اور اگر وار کرنے کے بعد خیر نہ ہو تو خیر نہ ہو جائیگا۔

تو مجروح کے مرنے میں ضرور دیر لگے گی۔ اور شاید جانبر بھی ہو جائے۔ اس لئے نیم غمزدہ سے

کام لینا بہتر ہے۔ دوسری صحت الفاظ اس شعر میں یہ بھی رکھی گئی ہے کہ نیام کا لفظ مثال مرنے

کے بعد نیم زدہ جاتا ہے۔ اور نیم غمزدہ ہی سے کام لینے کو عاشق کہتا بھی ہے۔

میرے قلع میں ہے صہبائے آتش نہاں ہر فتنے سقرہ کبابِ دل سمندر کھینچ
 فراتے ہیں میرے پیالہ میں صہبائے عشق جھپی ہوئی ہے جس میں آتشِ مستیاں سے زیادہ
 گرمی ہے۔ اس کی مناسبت سے کباب بھی دلِ سمندر کا ہوتا چاہئے (سمندر ایک جانور ہوتا ہے
 جو آشکدہ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ سے باہر آکر فوراً مر جاتا ہے) کہتے ہیں سمندر کے سینہ
 میں سے کبابِ دل سمندر کھینچ لے۔

رولیت واو

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بائے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
 فراتے ہیں حسن کو ناز و انداز کی کشاکش سے میرے مرجانے کے بعد رہائی ہو گئی۔ بارے
 اہلِ جفا و اہلِ ستم یعنی تمام معشوقِ آرام سے ہو گئے۔ جب تک میں زندہ تھا تو ہر حسین مجھ کو اپنا
 فریضہ بنانے کے واسطے اظہارِ غمزہ و ناز میں پھٹا رہتا تھا۔

منتصبِ نیفتگی کے کوئی قاتل نہ رہا ہوئی معزولی انداز وادامیر کے بعد
 فراتے ہیں۔ اب کوئی آدمی منصبِ عشق کے قابلِ بانی نہ رہا۔ یہ عہدہ خالی ہو گیا اور
 اسی کے ساتھ میں ناز وادائے معشوقوں بیکار و محفل ہو گئے۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں دھواں اٹھتا ہے شعلہٴ عشق سے پوش ہوا میرے بعد
 فراتے ہیں۔ شمع کے بجھتے وقت جو شعلہٴ آتش دھواں بن کر ظاہر ہوتا ہے وہ درحقیقت
 دھواں نہیں ہوتا بلکہ شمع کشتہ کے سوگ میں شعلہ سے پوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عشق کا شعلہ
 میرے مرجانے کے غم میں سے پوش ہو گیا ہے مطلب یہ ہے کہ میں سوز و گدازِ عشق کا مرتبہ رکھتا تھا۔

خون کے دلِ خاک میں حوالِ تباہِ پریشانی ان کے ناخن جوئے محتاجِ حنا میرے بعد
 فراتے ہیں خاکِ قبر میں ہمارا دل خون ہو گیا ہے۔ اس غم میں کہ سشتوں کے ناخن ہمارے
 مرجانے کے بعد حنا کے محتاج ہو گئے ہیں مطلب یہ ہے کہ عا حنین ہمارے خون کی ہندی دھتوں
 میں لکھتے تھے، اسلئے کہ خاں ہمارے خون کا ساشش رنگ نہ ہوتا تھا۔ ہمارے مرجانے کے بعد

انہیں مہندی لگانی پڑی۔

دورِ خودِ غرض نہیں جو ہر بیدار کو جب لگے نہ نہ ہر سرے سے خفا میرے بعد
فراتے ہیں۔ جو ہر ظلم بیدار کے ظاہر کرنے کا موقع ملتی نہ۔ باہمی میں مرگیاں لے گئے نہ
میرے بعد شرت سے خفا رہنے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے قدر دان جن کے معاملے کے بعد سینوں کو
بناؤ سنگھار سے نفرت ہو گئی۔

ہے جنوں اہل جنوں کیے آغوشِ وداع چاک ہوتا ہے گریباں سے خدا میرے بعد
فراتے ہیں۔ ان دیوانوں کے گریباؤں سے جو یہ گریباؤں کو چاک رکھتے ہیں چاک گریبا
نہا ہوتا ہے۔ جی میرے معاملے کے بعد چاک کسی گریبان کے پاس آئے بھی نہ چھٹیکے اس سے پاک
مٹے مگر گریباؤں سے خدا پر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کالوں سے زمانہ خالی ہو جائے گا۔
پھر کوئی میرا سا عاشق کامل پیدا ہوگا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ انگنِ عشق ہے کمر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں۔ مے مردِ انگنِ عشق کا ساقی یعنی
مستوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی وہ ان کو شرابِ عشق کی طرت دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ میرے بعد
شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے مرنے یا وہ
غور کرنے کے بعد جیسا کہ میرزا خاں بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں
اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع بھی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرع کو وہ مکر پر صلا دیتا ہے ایک
دفعہ بلائے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ انگنِ عشق یہ یعنی کوئی ہے جو مے مردِ انگن
عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اس مصرع کو، یوسی کے لہجہ میں مکر پر صلا دیتا
کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ انگنِ عشق! یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ ہمیں لہجہ اور طرزِ آواز کو بہت دخل
ہے کسی کو بلائے کا لہجہ اور مے اور یوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعہ مذکور
کی تکرار کر دے تو زاریہ معنی ذہن نشین ہو جائیگی (از یادگار غالب)

غم سے مرنا ہوں کہ اتنا نہیں دیا میں کوئی کہ کرے تعزیت ہر دوفا میرے بعد
 فرماتے ہیں میں اس غم سے مرنا ہوں کہ میرے مرجانے کے ساتھ ہی ہر دوفا کا بھی خاتمہ
 ہو جائیگا۔ اور پھر اتنا بھی کوئی نہیں ہے کہ ہر دوفا تعزیت میرے بعد کرے گی۔
 آئے ہے سبھی عشق پر رونا غالب کس کے گھر جائیگا سیلاب بلاتے ہیں بعد
 فرماتے ہیں۔ اسے غالب مجھ کو عشق کی تنہائی اور تکیسی پر رونا آتا ہے میرے مرجانے کے بعد
 کون اس کا میزبان بنے گا اور یہ سیلاب بلا یعنی عشق کس کے گھر جائیگا۔

روایت

بڑے ہیں جو یہ پیش نظر درو دیوار نگاہ شوق کو ہیں بال و پر درو دیوار
 دربانے ہیں یہ درو دیوار جو حامل نظر ہیں اور نگاہ کو مشوق تک پہنچے نہیں دیتے ہیں ان کے
 حاجب بن جانے سے ہمارا کچھ حرج نہیں ہے۔ ہماری نگاہ شوق تصویریں یا رنگ پہنچنے لگی ہے
 اور مشق تصور کا سبب بھی درو دیوار کا حجاب ہے گویا یہ حامل ہو کر نگاہ شوق کے بال و پر بن گئے
 ہیں یعنی انہی کی وجہ سے چشم تصویریں یہ فوت پیدا ہو گئی ہے۔
 نورائشک نے کوشائے کا کیا یہ رنگ کہ چمکے مرے دیوار درو دیوار
 فرماتے ہیں میرے جوئی گریہ نے ترقی کر کے گھر کا یہ حال کر دیا ہے کہ دیوار گر کر دروازہ بن گئی
 ہے اور دروازہ ملیہ پڑ کر دیوار بن گیا ہے
 نہیں، سایہ کہ شکر نوید مستم یار گئے ہیں چند قدم پیش تر درو دیوار
 فرماتے ہیں۔ یہ سایہ درو دیوار نہیں ہے جو درو دیوار سے تھوڑے فاصلہ پر نظر آ رہا ہے بلکہ
 یار کے قدم رنجہ کرنے کی خوشخبری سن کر خود درو دیوار صمان کے استقبال کے واسطے چند قدم
 آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہوئی ہے کس قدر رزائی ہے جلوہ کہ مست ہے تھے کوچہ میں ہر دو دیوار
 فرماتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے شراب جلوہ کو تو نے اس قدر ستا کر دیا ہے کہ تیرے

لوچہ کے دو دیوار بھی تیری شراب دیدار سے مست ہو گئے ہیں۔

جوتے بچے سر سودائے انتظار تو آ کہ ہیں دکان متاع نظر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو انتظار کا سودا سلف خریدنا منظور ہے تو آ اور تماشہ دیکھ کہ عالم انتظار

میں میری نگاہیں درو دیوار پر اس طرح جمی ہوئی ہیں جیسے دکانداروں کے ہاں بیچنے کا سامان
دکانوں میں سجا ہوا ہوتا ہے۔ متاع نظر کی خریداری اگر تجھ کو منظور ہو تو چلا آ۔

وہ آ رہا میرے ہمسایہ میں تو سایہ سے ہوئے فد درو دیوار پر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ وہ میرے ہمسایہ میں آ کر آباد ہو گیا تو میرے درو دیوار کا سایہ اس کے

درو دیوار پر قربان ہونے لگا۔

نظر میں کھینچے ہے بن تیرے گھر کی آبادی ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ تیرے ذراں میں ہمارے گھر کی آبادی ہماری آنکھوں میں کھلتی ہے آنکھ

میں کسی چیز کے کھٹکنے کا لازمی نتیجہ آنسو کا جاری ہو جانا ہے، ہم اپنے درو دیوار کو دیکھ کر ہمیشہ

تیری یاد میں رویا کرتے ہیں۔

ہجوم گر یہ کا سامان کب کیا میں نے کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر درو دیوار

فرماتے ہیں۔ میں نے جب کبھی دل کھول کر رونے کا ارادہ کیا ہے تو فوراً درو دیوار میرے قدموں

پر گر پڑے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرے رونے میں ایسا اثر ہے کہ تکمیل ارادہ سے پہلے تاثیر

ظاہر ہو جاتی ہے۔

نہ پوچھو بخود عیش مقدم سیلاب کہ تاجتے ہیں پڑے سرسبز درو دیوار

فرماتے ہیں۔ سیلاب آنے کے وقت بخود عیش کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھو گویا درو دیوار

کو حال آ جاتا ہے اور وہ مصروف بقص ہو جاتے ہیں۔

نہ کہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں حریف را بہ محبت مگر درو دیوار

افشار از کی نسبت فارسی کا متولہ مشہور ہے کہ دیوار ہم گوش دارد۔ میرزا صاحب سے

کی مخالفت میں فرماتے ہیں کہ اپنا رازہ محبت اسے غالب زمانہ میں کسی سے نہ کہہ سوائے درود یوار کے
یعنی اگر تو اپنا رازہ محبت چھپا نہیں سکتا اور کسی کے سامنے کہنا ضروری سمجھتا ہے تو بجائے انسان کے
درود یوار سے کہہ بطلب شر کا یہ ہے کہ رازہ محبت کبھی منہ سے نکالنا نہ چاہئے۔

گھر حب بنا لیا ترے در پر رکھے بغیر جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کے بغیر
مرزا صاحب نے اس مطلع میں نئی قسم کی شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں میں نے جب کبھی معشوق
سے شکایت کی ہے کہ تو کبھی میرے گھر نہیں آتا تو اس نے جواب میں شوخی سے یہ کہہ دیا ہے کہ
میں تمہارا گھر نہیں جانتا۔ ورنہ ضرور آتا۔ اب مرزا اپنا قدیمی گھر چھوڑ کر معشوق کے دروازہ پر
آپڑے ہیں اور اس سے یہ کہتے ہیں کہ میں نے تیرے دروازہ پر بغیر تجھ سے اجازت لئے گھر بنا لیا
ہے لیکن اب بھی تو میرے گھر کو بغیر میرے کہے ہوئے نہیں جان سکتا۔

کہتے ہیں حب رہی نہ مجھے طاقت سخن جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
سے ہیں کا اشارہ معشوق کی طرف ہے یعنی وہ کہتے ہیں اور اس وقت کہتے ہیں کہ جب
مجھے اپنی طاقت گویائی نہ رہی کہ میں اپنا حال دل مفصل اور شرح بیان کر سکوں۔ میں کسی کو
مدد دلی بیان کے بغیر کیونکر سمجھ سکتا ہوں مطلب شر کا یہ ہے کہ جب مجھ میں حال بیان کرنے
کی قوت نہ رہی تو وہ ستم ظریف شوخی سے مجھ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تو اپنے دل کی بات بیان
کرتا ہی نہیں۔ میں بغیر کے تیرا معادولی کس طرح سمجھ سکوں۔

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں یوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
فرماتے ہیں۔ میں ایسے معشوق ستم شعار پر عاشق ہوا ہوں جس کے نام کے ساتھ ہر شخص ستمگر
کا لفظ ضرور استہان کرتا ہے۔ یہ ظالم سے کس طرح مدعا براری ہو سکیگی۔ یوے کا لفظ بہت
قدیمی زبان کا ہے۔ مرزا صاحب کو یہ اردو دیوان لکھے ہوئے تقریباً ایک سو بارہ برس گزرے
اب یہ اور اس کے ساتھ اور بہت سے الفاظ متروک ہو گئے۔ آخر عمر میں مرزا صاحب نے بھی ایسے
سدا الفاظ ترک کر دیے تھے۔

جی میں ہی کچھ نہیں ہے، ہمارے وگرنہ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہے :۔ میں پر سکے بغیر
 فرماتے ہیں میرے دل میں کسی کی طرف سے بعض وعدہ دیتے ہیں۔ میں ایک صاف
 باطن آدمی ہوں جس کے صاف ملتا ہوں۔ اگر کسی کی طرف سے میرے دل میں کچھ بُرائی ہوتی تو فوراً
 اس کو ظاہر کر دیتا۔ اگر اس کے اظہار میں میری جان پر ہی بن جاتی تو میں ہرگز کچھ پروا نہ کرتا۔ یہ
 یہ ہے کہ میرزا صاحب اپنی زندگی میں حسن اخلاق کا ایک نمونہ تھے۔ شعر کی خوبی میں کس
 کو کلام ہو سکتا ہے۔

چھوڑ دوں گائیت اس بت کافر کا پوجنا چھوڑے :۔ خلق کو مجھے کافر کے بغیر
 چھوڑے کا لفظ دونوں مصرعوں میں اس بے تکلفی کے ساتھ باندھنا حسنِ بیاں پر دل ہے
 معنی شعر کے بالکل صاف ہیں جو شخص کسی بت کافر کو پوجے گا خلق خدا ضرور اس کو کافر کہے گی۔
 مقصد یہ ناز و غمزہ سے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے۔ دشمنہ و خبیثہ کے بغیر
 فرماتے ہیں۔ دشمنہ و خبیثہ سے میری مراد ناز و غمزہ ہے۔ یعنی محسوسات سے تشبیہ دے
 بغیر ہر کس و ناکس مطلب سمجھ نہیں سکتا۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بارہ و ساغر کے بغیر
 اس شعر میں بھی سطورہ بالا شعر کا مضمون دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مصرع ثانی میں
 بات کا لفظ محذوف کر کے حسنِ بیاں کو دو بار دہرایا ہے یعنی بارہ و ساغر کے بغیر بات نہیں بنتی۔
 بہراہوں میں توچا ہے دو ماہو التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرر کے بغیر
 یہ شعر مرزا صاحب کے سببِ حال ہے (آخر میں نقلِ سعادت بہت بُرہ گیا تھا) نئی قسم کی شوخی
 برتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میں بہراہوں جب تک بلند آواز سے دھم دھم کرتا ہوں تو
 کہی نہ جائے میں سن نہیں سکتا۔ اس موقع پر آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ یہ موقع تو
 دُگنا التفات فرمانے کا ہے نہ کہ آزر دہ ہونے کا۔

غالب نہ کہ حضور میں تو بار بار عرض ظاہر ہے تیرا حال سب سن پر کئے بغیر

صنعت معنوی کے علاوہ اس مقصد میں بہت بڑی خوبی یہ رکھی گئی ہے کہ سب کچھ عرض حال کر لینے کے بعد بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں کہا۔

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
کمال رشک کا اظہار اس خوبی سے کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں۔ رخ یار کی چمک مک
دیکھ کر محکوم جل جانا چاہئے تھا۔ کیوں نہ میں جل گیا۔ اب اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی طاقت دیدار دیکھ کر حلا
جاتا ہوں یعنی رشک و حسد نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے سرگرم نالہائے شرر بار دیکھ کر
فرماتے ہیں جس ارادت سے آتش پرست آگ کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی ذوق و شوق سے میں
آتش شرر بار کرنے میں سرگرم رہتا ہوں میری یہ حالت دیکھ کر اہل جہاں محکوم آتش پرست کہتے ہیں۔
کیا آبرو سے عشق جہاں عام ہو جاتا رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
فرماتے ہیں۔ تم نے جفا کو عام کر دیا کسی قسم کا امتیاز باقی نہ رہا۔ اور تمہارے اس فعل نے عشق
کی آبرو کو ہٹا لگا دیا یعنی مورد جفا ہمیشہ عاشق کی ذات ہوا کرتی ہے۔ تم رقیب پر بھی جفا کرتے ہو۔
رقیب کے دل میں تمہارا عشق نہیں ہے۔ اس پر تمہاری جفائیں دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ تم بے سبب
آزار ہوا اور یہی بات میرے کھینچ جانے کا سبب ہے۔

آتا ہے میرے قتل کو میرے جوش رشک سے مرتا ہوں اُسکے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہو کر سامنے سے آ رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ
قریب آ کر ضرور مجھ کو قتل کرے گا لیکن اس کے دست ناز میں تلوار کو دیکھ کر میں جوش رشک سے مرتا
ہوں پہلی تہمت تو اس شعر میں یہ ہے کہ منگام قتل عاشق کے دل میں بجائے خوشی یا خون کے
رشک پیدا ہو گیا ہے (ہو ز قاتل کے قریب آنے اور تلوار کے وار کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی ہے
یہاں پہلے ہی سے آثار موت شروع ہو گئے ہیں دوسری خوبی غلط رشک نے یہ پیدا کر دی
ہے کہ وہ ہاتھ جس میں مشتوق نے قتل کرنے کو چھٹی سی تلوار لے رکھی ہے کیا اس قابل نہ تھا کہ

عاشق کی گردن میں جامل ہوتا یا اول ترسکین رکھنے کی غرض سے رکھا جاتا۔ ان دونوں باتوں کو چھوڑیے کہہ سے کم وہ نازک ہاتھ دست عاشق میں تو جوتا یا یہاں رشک کی دلیل یہ بھی پیدا ہو گئی ہے کہ تلوار اس کے دست نازک میں کھنکریہ ی بن گئی ہے۔

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلع لڑی ہے موج سے تری رفتار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ شیشہ کی گردن پر خلع خدا کا خون ثابت ہو گیا ہے اس لئے خوف سے موج سے یہی رفتار کو دیکھ کر کانپ رہی ہے مطلب یہ ہے کانشہ کے عالم میں تیری رفتار زیادہ مستانہ ہو گئی ہے اور اس کو دیکھ کر ایک زمانہ قتل ہو رہا ہے اگر تو شراب نہ پیا تو بہت سے آدمیوں کا خون نہ ہوتا مثلاً اب کانشہ لوگوں کے قتل کا سبب ہوا ہے۔ پس گردن مینا پر خون ثابت ہو گیا۔ نہ تو شراب پینا نہ لوگ تیری مستانہ چال پر جان قربان کرتے۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچی ستم سے ہاتھ ہم کو حرمیں لذت آزار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ اے افسوس ہم کو ظلم کا خواہشمند دیکھ کر اس شتمکار نے جفا ترک کر دی مطلب یہ ہے عاشق کی بڑی خواہش بھی مشق پوری نہیں کرتا۔

بکباتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ لیکن عیار طبع حشریدار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ ہم اپنی حبیب سخن کے ساتھ خریدار کے ہاتھ خود بھی بک جاتے ہیں لیکن طبع خریدار کی کسوٹی کو پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کسوٹی کھوٹا کھرا شعر پر کہنے والی ہے بھی یا نہیں مطلب یہ ہے ہم اپنے قدردان سخن کو بھی پہلے آزما لیتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا شعر سمجھ سکتا ہے اسکے بعد ہم خود اس کے قدردان بن جاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ میرزا کا کلام سمجھنے کو ایک غیر معمولی دماغ کی ضرورت ہے۔ ان کے معمولی سے شعر کی تہ میں بھی ایسی بات چھپی ہوئی ہوتی ہے کہ بہت ہی دشواری سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

زنا رہا بندہ سمجھ صدا نہ توڑ ڈال رہو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ زنا را در تبیع میں ایک ہنسی درا ہے یعنی نگاہ عارف میں یہ دونوں رکتے ہیں

منزل مقصود تک پہنچنے کے رشتہ زنا کو بسبب صاف ہونے کے راہ ہوا سے تعبیر کیا ہے اور تسبیح کو اُس کے دانوں کے اتار چڑھاؤ کے خیال سے نشیب فراز کا رستہ قرار دیا ہے جس میں منزل تک پہنچنے کے لئے سوٹھو کریں ٹھکانی پڑتی ہیں۔

ان آبلوں کے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خارا دیکھ کر فرماتے ہیں۔ ان آبلوں سے بہت گھبرا گیا تھا مگر جنگل کو کانٹوں سے بھرا ہوا دیکھ کر دل کو خوشی پیدا ہو گئی۔ مطلب یہ ہے جب انسان کے دل کو عشق کی جنگ لگی ہوتی ہے تو کیسی ہی تکلیفوں کا سامنا ہر بہت نہیں ہوتا۔

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مجھے طوطی کا عکس سمجھے ہے رنگار دیکھ کر معشوق کی صفات میں سے ایک صفت خوش گلوئی اور خوش بیانی بھی ہے خوش بیانی کی صفت طوطی میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ طوطی کی خوشنوائی مشہور ہے، رشک کا مادہ جتنا عاشق میں ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ معشوق میں بھی ہوا کرتا ہے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مجھ سے ایسا بدگماں ہے کہ میں اگر آئینہ بھی دیکھتا ہوں تو اس میں رنگار کی سبزی کو دیکھ کر میرا معشوق عکس طوطی سمجھتا ہے اور اس کو اس بات کا رشک پیدا ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرا عاشق طوطی کی خوشنوائی سے اپنا دل بہلا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کو میرا عشق جاتا رہے گا۔ اس لئے وہ اپنی بدگمانی سے رنگار آئینہ پر رشک کرتا ہے۔

گرمی بھتی ہم پر برق تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرف قیج خوار دیکھ کر اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے آہستہ کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انہوں نے اس کو اٹھالیا۔ میرزا فرماتے ہیں۔ برق تجلی کے گرنے کے ہم سختی تھے نہ کوہ طور۔ اس لئے کہ مشر بنو کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اُس کو شراب دی جاتی ہے پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے وہ کیونکر تجلی الہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال سے جس تجلی کے جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال

ہے (از یادگار غالب) یہ شعر مرزا صاحب کے فستروں میں ایک نشتر ہے۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریہ حال کا یا آگیا مجھے تیری دیوار دیکھ کر
سیرزا صاحب نے مصرع اولیٰ میں وہ کے لفظ سے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ سر پھوڑنے کا
سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ سر پھوڑنے کا موقع اور وقت گزر گیا مگر اس کی دیوار کو دیکھ کر اب
نک وہ تاشا آنکھوں کے رو برد پھر جاتا ہے۔ در دیوار دیکھنے والوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

لڑتا ہے سرا دل ز محبت ہر درختاں پر میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر
فرماتے ہیں۔ قباب ایک قطرہ ناچیز کے جذب کرنے میں وہ سرگرمیاں دکھا رہا ہے کہ اس کے
دیکھنے سے میرا دل کانپا جاتا ہے۔ قطرہ اور قطرہ بھی وہ قطرہ جو نوک خار پر ٹھہر گیا ہے بہت ہی
اپنا دھڑکتی کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے لئے جب ایسی سرگرمی کی ضرورت ہے تو دنیا کے بڑے
بڑے کام تو بہت ہی دشواری اور محنت سے سرانجام پاتے ہونگے۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف کتایاں جی آری سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہر زندہ
فرماتے ہیں۔ زندان میں جس یوسف کے لئے آزمائش کا سان پیدا ہو گیا یعنی حضرت
یعقوب کی سفیدی چشم قید خانہ کے در دیوار پر پھر رہی ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت یوسف کے
نصو میں روتے روتے حضرت یعقوب کی آنکھوں کے کور ہو جانے کی طرف۔

تو تعلیم درس بخودی ہوں منہ سے کہ محنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ بستان
فرماتے ہیں میں نے اس زمانے میں فنا کی تعلیم پائی ہے جب محنوں مثل کتب تھا اور
کتب کی دیواروں پر حرف سفر و بچوں کی طرح لکیریں کھینچ کر لکھتا تھا۔ لام الف مکتوبہ
لا ہو جاتا ہے اور کائناتی کا صیغہ ہے لا اذن سے حضرت صوفیہ کے ہاں نفی و اثبات و ضرب
لکائی جاتی ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں درس فیض عاصری پر سبقت رکھتا ہوں۔ اس لئے
کہ محکو فنا کی تعلیم۔ و نہ ازل میں ملی تھی۔

فراغت کس کد رہتی تھے تشویش مرہم سے بہم گر صلح کرتے بارہا بے دل نگہاں سے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو مرہم کے نسخے ڈھونڈنے تلاش کرنے بنانے لوگوں سے مانگئے۔ سے
فارغ البالی حاصل ہو جاتی۔ اگر وہاں کے زخم آپس میں ٹکد ان پر صلح کر لیتے مطلب یہ ہے کہ تنہا
اور صبر انسان کو تلاش اور جستجو کی تکلیفوں سے چھڑا دیا کرتا ہے۔

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار نازا ایسا کہ ریشہ چشم سے جسکے ہر حرفے تھر عنوان پر
میرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں بہت بڑے مضمون کو بیان فرمایا ہے جسکی دست
کے سامنے بڑے سے بڑا دفتر بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا فرماتے ہیں۔ اقلیم عشق میں کوئی دفتر
کی کتاب اغماض و ناز اور انداز معشوقانہ سے خالی نہیں ہے اور ناز معشوقانہ ہمیشہ عاشق کے
بر خلاف حکم جاری فرماتا رہا ہے۔ فرما دوسرے پورے شیریں کے عشق میں مرگیا اور وصل بقیست ہو نہیں
دیوانہ ہو کر جنفل میں جا پڑا۔ مگر ایسی نے وصل سے انکار ہی کیا۔ ایسے ہزاروں واقعات دنیا میں
گزرے ہیں۔ میرزا کا دعوئے یہ ہے کہ عاشق صادق ہمیشہ ناکام و نامراد ہی ہوا کرتا ہے۔ دنیا یا
ایسا کوئی عاشق پیدا نہیں ہوا کہ جس سے معشوق نے اغماض و انکار نہ برتا ہوا اور ریشہ چشم سے
انکار پر ہنر نہ کی ہو۔

مجھے اب کھکرا بر شفق آلودیا د آ یا کہ فرقت میں تری آتش برستی گلستان
مرزا صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ مجھ کو اب تیرے سامنے ابر شفق آلود
دیکھ کر یاد آ گیا ہے کہ تیری بھلائی میں اسی طرح گلستاں پر آگ برستی تھی۔ یعنی جب کبھی فرقت کے
زمانہ میں بات کی سیر کو جانے کا اتفاق ہوا ہے اور غنچہ و گل پر نظر پڑی ہے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ
آگ برس رہی ہے سرخی رنگ کی مناسبت سے گل کو آگ سے تشبیہ دینی اور ہجر میں یاغ
کی سیر کا ناگوار گزنا جس خوبی سے بیان کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بجز یہ واز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا قیامت اک ہوا ہے تنہا ہے خاک شہیداں پر
فرماتے ہیں۔ تیرے شہیداں ناز کے ڈھیر پر سو یا قیامت آپکی ہے یعنی جب تیرے بواہلی
ہے ان کی خاک نہ کر پریشان ہو گئی ہے اگر وقت معین پر قیامت آئی بھی تو تیرے شہیداں ناز کو

یہ نکر ٹھاسکے گی۔ ان کی خاکس باقی کہاں ہے وہ تو پہلے ہی بردہ ہو چکی ہے۔
 نہ لڑنا صبح سے غائب کیا ہوا اُسے شہد کی ہمارا بھی تو آخر زور چلنا ہے گریبان پر ہم
 مجبور ہی بنے ہوئی اور سیکسی کی تصویر غفلتوں میں اس سے بستر میں چھپا گئی۔ فرماتے ہیں۔
 غالب نام صبح کی سخت زبانی اور ہیر جی کی کیوں تکایت کرتا ہے، در کس لئے اس سے رو؟
 ہے خاموش مورہ صبر کر اس کے مقابلہ میں ہمارے بھی تو زور گریبان پر چلتا ہے جب تک یادہ۔ یوں
 اور مجبور ہو جاتے ہیں تو ہم اس اندہہ و غم کی حالت میں اپنا گریبان بھاڑ لیتے ہیں۔ نام صبح کی زبانی
 چھتی ہے۔ وہ ہمیں برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے ہاتھ چھتے ہیں ہم مظلوم اپنا گریبان بھاڑ لیتے ہیں
 بے مثل قطع لکھا ہے۔

۱۵ ہے سیکہ ہر اکٹونیک اشارے میں نشان اور کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے کہاں اور
 فرماتے ہیں۔ ان کی کوئی بات بناوٹ اور فریب سے خالی نہیں ہوتی محبت کے پردہ میں
 ہی دشمنی کا اظہار ہو کرتا ہے اس لئے میں ہمیشہ اس سے ہوشیار و بدگمان رہتا ہوں۔
 یارو نہ سمجھے میں نہ سمجھیں گے مری بات سے اور دل ان کو جو نہ لے مجھ کو زبان و
 اس شعر کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ سول ہیں بہ میری زبان میں لٹنی اور صاف غفلتوں
 میں اپنی وضع کے خلاف مدعا و دی بین نہیں کر سکتا۔ روئے تو اپنے بھولے پن کے سبب میرے
 مطلب کو سمجھ نہیں سکتے یا جان بوجھ کر دان پن جاتے ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ سے درخواست
 کی جاتی ہے کہ ان کو ہی دوسرا دل عطا فرمائے۔ اگر مجھ کو اور زبان میں ملتی مدد سے معنی بقول شاعر
 حضرت مولانا کی مرحوم و منفور یہ ہیں کہ میرزا صاحب در پردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ فرما کر
 کہتے ہیں جو میرزا کے کھلم کھلم کو بے معنی یا بے الفہم کہا کرتے تھے۔

ابرو سے ہے کیا من نگہ ناز کو پیوند ہے تیر مقرر مگر اسکی ہے کہاں اور
 میرزا صاحب تیر و کمان کی پڑائی تشبیہوں کو پیش پا افتادہ سمجھ کر نیا پہلو اختیار کر لیا ہے
 فرماتے ہیں۔ کمان برو سے سکی نگہ ناز کو کوئی تعلق نہیں ہے یعنی نگہ ناز تیر تو ضرور ہے مگر سکی ناز

ایرو نہیں ہے۔ یہ نگہ نماز کا تیرولی ارادہ کی کمان سے نشانہ پر لگا کرتا ہے۔ اسی واسطے اس کے زخم مختلف صورتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ خوشی کا پہلو اختیار کر کے عاشق کو تڑپاتا ہے کہیں غصہ کے پیکان سے قتل کرتا ہے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل جان اور
فرماتے ہیں، تمہارے عشق میں ہر شخص جان و دل سے تنگ آ گیا ہے۔ بازاروں میں
کم قیمت پر سودا بن جاتا ہے۔ ہم جان و دل اور خریدائیں گے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بہت شکنجی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور
اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت
تک راہ معرفت الہی میں ایک اور سنگ گراں سبوتا ہے۔ پس اگر ہم نے بہت توڑنے میں سبکدستی
حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بہت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔ (از یادگار غالب)
ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدہ خوننا بہ فشاں اور
فرماتے ہیں خون جگر جوش کی حالت میں ہے کامش ایسا ہوتا کہ مجھ کو دیدہ خوننا بہ فشاں
دل گئے ہوتے تو غلن تھا کہ میں دل کھول کر یعنی دل کی خواہش کے موافق روتا۔ اور خون جگر
کے دریا بہا دیتا۔ جوش خون جگر کے عالم میں صرف دو آنکھوں سے کیا خاک رو سکتا ہوں۔

مرتا ہوں اس وارز پہ ہر چند سر اڑ جائے جلاؤ کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
فرماتے ہیں معشوق کا یہ کہنا کہ ہاں اور وار کر۔ ہاں ایک اور مانتہ چھوڑ۔ ہاں ایک اور
زخم لگا مجھ کو اس قدر پسند ہے کہ اپنی جان جانے کا مطلق غم نہیں۔

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا ہر روز دکھاتا ہوں میں کئی انج نہاں اور
فرماتے ہیں۔ میرے دل دھج میں پوشیدہ ہزاروں داغ ہیں۔ میں ان داغوں میں
ہر روز صبح کے وقت ایک نیا داغ لوگوں کو دکھا دیتا ہوں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خورشید جہاں تاب
سمولی طور پر افق مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔

لیتا۔ نہ اگر دل تمہیں دیتا۔ کوئی دم چین کرتا۔ جو نہ مرنے کوئی دن۔ آہ و فغاں اور

میرزا صاحب سے مشفق نے یہ سوا ل کیا ہے۔ تو کوئی دم چین سے نہیں بتا اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ تو ہمیشہ فریاد ہی کرتا رہے۔ اس کے جواب میں میرزا کہتے ہیں کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرجاتا تو کوئی دن آہ و فغاں اور کرتا رہتا یا وجودِ پاکِ قہقی کے (جس کو فارسی ارباب نے جائز قرار دیا ہے) دونوں مصرعے عجیب پر لطف اور معنی خیز واقع ہوئے ہیں۔

پائے نہیں جب کہ توجہ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو جوتی ہے رواں اور نالے یعنی ندی نالے۔ نہ آہ و نالہ۔ مثال کس قدمش نہ کے سبق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اُسی قدر راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے سببِ حال لکھتا ہے وہ نہایت سوز اور درد انگیز ہوتا ہے (از یادگار غالب)

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہا اندازِ بیاں اور زمانے ہیں۔ دنیا میں اور شاعر بھی بہت اچھے ہیں لیکن یہ بات مسلمہ ہے۔ سب لوگ اتفاق کے ساتھ کہتے ہیں کہ میرزا غالب کا اندازِ بیاں سب سے جداگانہ ہے (یہ بات میرزا صاحب کی خصوصیات سے ہے)

صفائے حیرتِ آنیت ہے سامانِ رنگِ آخر تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگِ آخر زمانے ہیں جس طرح آئینہ بے کار اور معطل پڑے رہنے سے رنگِ آلودہ ہو جاتا ہے سطحِ نمبر سے ہوئے پانی پر کائی حجم کرا سکو بد رنگ اور سیلا کر دیتی ہے مطلب شعر کا یہ ہے جو آدمی یلغارِ شہر اور کام کے کچھے جاتے ہیں وہ ہی زیادہ موردِ آفات و بلا رہتے ہیں۔

نہ کی سامانِ پیش و یاد نہ تیرے سرِ چشت کی ہو جامِ زمرہ بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر فرماتے ہیں۔ میری رحمتِ مزامنی سامانِ عیش و جاہ سے بھی نہ مت ہلکی اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ زمرہ پر یہ بھی میری نگاہ میں چیتے کا داغِ بلیا مطلب یہ ہے دنیا میں

خوش و خرم رہنا دولت مندی کے سبب نہیں ہو کر تاکہ یہ خدا کی دین ہے جس کو وہ چاہتا ہے عجبی
انفلسی میں بھی دل شاد رکھتا ہے۔

جنوں کی دستگیری کس ہو کر ہو نہ عربانی گریباں چاک حق ہو گیا ہی میری گردن پر
فرماتے ہیں۔ میں اپنی عربانی کا منت پذیر ہوں کہ اس نے میرے جنوں کی مدد کی ہے ایسے
چاک گریبان کا حق یعنی احسان میری گردن پر ہو گیا ہے۔ اگر گریبان چاک نہ ہوتا تو میں
جنوں کی کچھ مدد نہ کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ آثار جنوں بغیر چاک گریباں کے ثابت نہیں ہو سکتے۔
بزرگ کا غبار آتش زدہ نیزنگ بیتابی ہزار آئینہ دل بانٹے ہے یہ بال یک طہیدین
فرماتے ہیں جس طرح جلے ہوئے کاغذ میں ستارے سے چمکنے لگتے ہیں اسی طرح شعبہ باز
بیتابی نے ہزاروں آئینے میرے دل کے بازوؤں پر باندھ دیے ہیں۔ ایک تڑپ کے ساتھ
ہزاروں نقطہ ہائے روشن نمودار ہو جاتے ہیں۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے متاع بردہ کو سمجھے مجھے ہیں قرض ہزن پر
متاع بردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل و قویعات میں سے ہے۔ جو لوگ
آسودگی کے بعد غفلت ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں
اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہو گا اور ہمارا
اقبال پھر عود کرے گا۔ (ان زیادہ کا راقالب)

ہم اور وہ بے سبب بچ آشنا دشمن کہ رکھتا ہے شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر
فرماتے ہیں۔ ہم کو اس بے سبب بچ آشنا دشمن سے کام پڑا ہے جو نقاب کی شعاع
کو دیکھ کر نظر کی تہمت چشم روزن پر رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے شعاع مہر جو روزن دیوار سے آتی ہے
اس کو دیکھ کر میرا مشوق مجھ سے لڑتا ہے کہ تو نے روزن دیوار سے مجھ کو تھما نکا تھا۔ یہ شعاع مہر
نہ تھی بلکہ تیری نظر تھی۔

فنا کو سوپ کر مشتاق ہو اپنی حقیقت کا فروغ طالع خاشاک ہے موتوں گلخن پر

فرماتے ہیں۔ ثنائی اسد جو کہ فروغِ معرفت حاصل کرنا چاہئے اور اسکی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ جس طرح گھاس وغیرہ بھاڑ میں جھونکے کے بعد شعلہ شکر روشن ہو جاتی ہے اسی طرح ثنائی اسد جو کہ حقیقت عرفان ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسدِ بطل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا
لہ مشعلِ نازِ خونِ دونی لم میری گردن پر
فرماتے ہیں۔ اسد کے حال پر تعجب نہ ہے کہ وہ ایسے انداز کا بس ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتا خود قاتل سے کہتا ہے کہ تو مشقِ ناز اسی طرح جاری رکھ اور لوگوں کو قتل کرتا رہ۔ خونِ دونی لم میری گردن پر ہو گا۔ تجھ سے اس کی باز ہو نہ ہو گی۔

سنگس مصلحت ہے ہوں کہ خوابِ تجھ پہ عاشق میں
تکلفِ برعزتِ مجاں لگا تجھ سے قریب تر
فرماتے ہیں۔ میں جو تیرے تمام افسار ہوں ایک مصلحت سے افسار ہو رہا ہوں اور وہ مصلحت یہ ہے کہ تجھ پر حینِ عاشق میں۔ اگر تو مجھے نہیں مانتا تو ان میں سے کوئی حینوں میں سے کوئی نہ کوئی تجھ سے قریب ضرور مجھے مل جائیگا۔

رازِ تم تھا کہ وہ جو مرا سے کوئی دن اور
یہ ساری نزلِ زمینِ العابدین خانِ مختلص بہ عارف کے فوجد میں ہے۔ عارف میرزا صاحب کی سالی کے بیٹے یعنی ان کی بیوی کے بھانجے تھے۔ زمینِ العابدین خانِ عارف سے میرزا صاحب کو نہایت درجہ کا تعلق تھا کچھ تو فراہمیت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور بڑی باطنیت رکھنے والے تھے۔ باوجود پُرگوئی کے نہایت خوش گو تھے۔ ان کو حد سے زیادہ غریزہ رکھنے تھے۔ جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو میرزا صاحب نے اُن کے مرنے پر یہ غزل بجا دی جس کے سخی ہے جو نہایت لطیف اور دردناک ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرزا صاحب ہی تم کو مرنے والے تھے۔ مگر تم مجھ سے پہلے مر گئے اور تم نے مراد عدم تمنا طے کی تو اب اور کچھ دن تمنا ہو۔

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ تیرے نہ صبیہ قریب کوئی دن اور
فرماتے ہیں۔ اگر تیرا سنگِ مزار نہ گھسے گا تو میرا سر ضرور مٹ جائیگا۔ تیرے مزار پر میری

نامیہ فرمائی ہمیشہ کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ چند دن کے لئے ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان دنوں باپوں میں سے ایک بات ضرور ہو جائیگی۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور فرماتے ہیں ہمیں دنیا میں آئے ہوئے زمانہ ہی کیا گزرا ہے گویا کل ہی تو آئے تھے اور آج ہی یہ کہہ رہے ہو کہ جاؤں۔ میں نے مانا کہ ہمیشہ یہاں نہ رہو گے لیکن کوئی دن تو اور بٹھرو مرنے میں ایسی جلدی کیوں کرتے ہو۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور فرماتے ہیں۔ تمہاری شخصیت کا وقت ہمارے لئے قیامت کا سامنا ہے۔ تم یہ کیا کہتے ہو کہ اب ہم قیامت کے دن ملیں گے۔ کیا قیامت کا کوئی دوسرا دن بھی ہے۔ بہت ہی بلیغ شعر کیا ہے۔

ہاں اے فلک پیر حواں تھا ابھی عارف کیا تیرا جگر تاجو نہ مریا کوئی دن اور میرزا صاحب نے مسطورہ بالا اشعار میں عارف مرحوم کو مخفی طب کیا ہے۔ اس شعر میں ہاں کا لفظ فلک کو مخفی طب کرنے سے پہلے بطور یاد دہانی استعمال ہوا ہے۔ اس ہاں کو اقرار سے کوئی تعلق نہیں، یعنی یہ ہاں نہیں کی ضد نہیں ہے۔ آسمان سے یہ شکایت کرنی منظور تھی کہ مرنے والا ابھی توجو نہ تھا عمر طبعی کو نہ پہنچا تھا۔ اگر وہ اور کچھ دن زندہ رہتا تو اس میں تیرا کیا نقصان تھا۔

تم باہ شب چار دم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور فرماتے ہیں۔ تم تو میرے گھر کے لئے چودھویں ات کے چاند کا حکم رکھتے تھے۔ تم سے میرے گھر میں اُجالا رہتا تھا۔ اگر میری یہ بات غلط ہے تو پھر وہ نقشہ گھر کا تمہارے بعد کیوں نہ رہا۔ چاروں طرف اندھیر کیوں بھا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بدر کمال رفتہ رفتہ کم ہو کر چھپا کرتا ہے۔ تم دفعتاً میری آنکھوں سے غائب ہو گئے۔ یہ کیا ستم ہوا۔

تم ایسے کہاں کے تھے گھر سے داد و ستد کے کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور فرماتے ہیں۔ تم لیں دین کے اتنے تو گھر سے نہ تھے کہ ملک الموت کے تقاضے پر فوراً ہی تم نے

انہی جان دیدی اسے اور کچھ دن تھا تاکہ دیتے۔

مجھ سے تمہیں نفرت تھی تیرے لڑائی بچوں کا بھی دیکھنا تھا کونئی دن اور

نیرتے مرادیاں ذاب ضیا الدین احمد خان بہادر المتخلص بنیر و خشاں میں لوہا و
میں جو عارف مرحوم کو میرزا صاحب بھی زیادہ عزیز کہتے تھے اپنی شہر صاحب ہے۔

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش کرنا تھا جو انہرگ گزرا کوئی دن اور
فرماتے ہیں جس طرح اب تک تم نے عمر کا حصہ زمانہ کی خوشی اور رنج میں گزارا تھا اسی طرح
اور کچھ دن دنیا میں بسر کرنے تھے جوانی کے عالم میں کیوں مر گئے۔

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب قسمت میں ہے مرنے کی تشا کوئی دن اور
فرماتے ہیں ہم لوگ نادان ہو جو یہ کہتے ہو کہ عارف سے جو انہرگ کا داغ اٹھا کر اسے
غالب ہم کیوں زندہ ہو مر کیوں نہیں جاتے میں اس لئے نہیں مرتا کہ میری قسمت میں ابھی کچھ
دن مرنے کی آرزو میں جاں لب رہنا لکھا ہوا ہے۔

ردیف

فانغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز
اس شعر میں چاک کفن کو صبح سے اور داغ عشق کو آفتاب صبح سے تشبیہ دی ہے مطلب
یہ ہے کہ میں مرجانے کے بعد بھی مصائب عشق سے فانغ البال نہیں ہوں۔

ہے ناز مخلصان ز راز دست رشتہ پر ہوں گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز
فرماتے ہیں سب طرح مخلص لوگ دولت اپنی برباد کر کے فخریہ اپنے اسرار کا بیان کیا کرتے
ہیں سب طرح میں اپنے داغ عشق کو کھوکھلا کر اس کا ذکر کیا کرتا ہوں۔

میں خائے جگر میں بیاں خاک بھی نہیں حیا زہ کھینچے ہے بت بیداد من ہنوز
فرماتے ہیں میں خائے جگر میں بیاں ب شراب عشق کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں خاک اڑ رہی ہے
یعنی سب خون صرف ہو چکا۔ مگر میرے خون کا پیاسا مستحق ابھی تک انگوٹیاں لئے جاتا ہے

کہ نشہ نہیں ہوا اور ملا۔

حریف مطلب مشکل نہیں سنو نہ تیار دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر و راز غزل
میرزا صاحب نے اس مطلع میں بالکل ایک نئی شوخی برتی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی
فرماتے ہیں کہ یہی شکل مقصد کے حامل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ ناچار اب
یہی دعا مانگیں گے کہ الہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو
(اقتباس از یادگار غالب)

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں وز دوہم وجود ہونے تیرے تصور میں نہیں نشیب و فراز
فرماتے ہیں وجود ماسوے اللہ میں بیکار کیوں شو کریں کھاتا پھرتا ہے معلوم ہوا ابھی تک
تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ابھی تک تیرا تصور نام تمام اور ناقص ہے۔

وصال جلوہ تماشا ہے پروانغ کہاں کہ دیکھے آئینہ انتظار کو پرواز
فرماتے ہیں یہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وصال یا جلوہ حسن کے لئے تماشے دکھایا کرتا
ہے لیکن ہم یہ دماغ کہاں سے لائیں کہ بیٹھے ہوئے آئینہ انتظار کو صقل کیا کریں مطلب یہ ہے
کہ تماشے جلوہ حسن کی تمنا کرتی تو آسان ہے۔ مگر انتظار کی نعمتیاں کھینچنی بہت کٹھن بات ہے۔

ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوئے پر ہوئے جلوہ تاز
فرماتے ہیں۔ عاشق کی خاک کا ایک ایک ذرہ آفتاب پرست ہے۔ خاک ہو جانے کے بعد
بھی جلوہ تاز کی آرزو نہ مٹی مطلب یہ ہے کہ جس طرح خاک کے ذرے آفتاب کی شعاعوں کے مقابل
چرک چکے لگتے ہیں۔ اسی طرح خاک عاشق کے ذرات آفتاب حسن یا اسے کسب ضیا کرتے ہیں۔

نہ پوچھ وسعت میخانہ جنوں غالب جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز
فرماتے ہیں اسے غالب میخانہ جنوں کی وسعت کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ مختصر تباہے دیتا ہوں
کہ یہ آسمان کا پیالہ نہاں ایسا ہے جیسے کوڑا پھینکنے کا برتن ہوتا ہے۔

وسعت سہی کرم دیکھ کہ سترتا سیر خاک گزرتے ہے آبلہ پا ابرگر بار ہونہ

میرزا صاحب نے اس شعر میں کرم کی شان کا اظہار کیا ہے بھٹبھٹ یہ ہے کرمیوں کو بڈیا
 اشارے کسی حالت میں دست بردار نہ ہونا چاہیے عجب کرم و بخشش کا شیوا بر گہر بارے سے لکھنا چاہئے
 باوجودیکہ برگہر بار آبدیا ہوتا ہے (پانی کے قطرہ کی رعایت سے جو بادل میں جوتے ہیں برکت آبدیا
 کہا گیا ہے) بھر بھی فیض رسانی کیلئے جھٹل جھٹل در شہر شرمینہ برساتا ہے۔

یک قلم کا غذا آتش زدہ ہے صفحہ نوشت
 نفقش پائیں ہے تپ گرمی رشت رہنوز
 فراتے ہیں میری گرمی رقا کا اثر بھی تم کیلئے نفقش پائیں سقد باقی ہے کہ صفحہ نوشت کا غذا تشرذہ بنگی۔

یہ ذکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
 کیا نہیں ہے مجھے ایساں عزیز
 اس کے فدا ہری سخی تو یہ میں اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایساں لے لیگا۔ اس سے چاہ
 کو عزیز نہیں کہتا۔ در دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کن تو عین ایساں ہے بھر
 اس سے نہان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے (از یادگار غائب)

دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے
 ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
 فراتے ہیں تیرے تیر کا پیکان بظاہر تو میرے دل سے نکلا گیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ بھی دل سے
 نہیں نکلا یعنی اسی جگہ سے محبت لیں اسی پیکان کی طرح کشک کشک کر لیں گے حق در تو نے سنے کہاں لہو ہے۔
 بے لائے ہی بنے گی محالبت
 واقعہ محنت ہے اور جان عزیز

میرزا صاحب کا نقطہ بھی عارف مرحوم کی موت کے انوکھ میں ہے۔ فراتے ہیں غالب میں سخی کو
 بڑھت کرنا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ واقعہ تو محنت ہے اور جان عزیز ہے یعنی واقعہ کی سخی تو یہ کہتی ہے کہ جان
 دیرینی چاہئے اور جان ایک ایسی عزیز شے ہے کہ انسان کچھ حال میں اس کا دنیا گوارا نہیں کرتا۔

غزل
 نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
 میں ہوں اپنی شکست کی آواز
 فراتے ہیں میری پردہ رولے گل نغمہ اور پردہ ساز سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ میں تو اک سر پودہ
 ہوں۔ میری آواز تو گویا میرے دل کے ٹوٹنے کی صدا ہے۔

تو اور آرائش حسنم کا کل
 میں اور ندریشہ ہائے دور و دوراں

فرماتے ہیں۔ تجھے تو صرف آرائش کی غرض سے کاکوں میں پیچ و خم ڈالنے سے کام ہے اور مجھ کو اس آرائش سے طرح طرح کے خوف اور اندیشے پیدا ہو رہے ہیں یعنی میں سمجھتا ہوں کہ دیکھئے اب کتنے نئے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم مجھ پر ہوتا ہے۔

لان ٹکیں فریب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
فرماتے ہیں۔ ہمارے یہ ٹکیں کے دعوے ہماری سادہ دلی کے فریب ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے سینہ میں تو ہزاروں رازِ دل گداز بھیرے ہوئے ہیں۔ ہم سے کب تک ان کا ضبط ہوگا۔ اور ہم کیونکر ان رازوں کو چھپا سکیں گے۔ یہ تو ایک نہ ایک ن ہشت از بام ہو ہی جائیں گے۔

ہوں گرفتار الفتِ صیاد ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
فرماتے ہیں۔ دنیا کی محبت نے مجھ کو اپنا اسیر کر رکھا ہے۔ اگر میں چاہوں تو ان تعلقات سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں۔

وہ بھی دن ہو کہ اُس شکر سے ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
فرماتے ہیں۔ خدا ایسا کرے کہ وہ بھی دن مجھے نصیب ہو جائے کہ بجائے حسرتِ ناز کھینچنے کے اس شکر سے میں بھی ناز کروں۔

نہیں ملیں مے وہ قطرہ خوں جس سے مڑگاں ہوئی نہ ہو گلاب
فرماتے ہیں۔ ایک خون کا قطرہ بھی میرے دل میں ایسا نہیں ہے جس سے بچہ مڑگاں نے گلابی نہ کی ہو۔ گلابی ایک قسم کا کیس ہے جو گلاب یا گندے کے پتوں سے کھیل جاتا ہے چنانچہ کسی کا شعر ہے:- رتبگل بازی کا دلا کاش تو پاتا۔ ہاتھوں سے جوڑتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا مطلب یہ ہے کہ خون دل تمام وکال جگہوں سے ٹپک گیا۔

اے تراغمرہ یک قلم انگیز اے تراظلم سرسبز انداز
فرماتے ہیں۔ تراغمرہ سرسبز انداز کا کام دیتا ہے۔ اور تراظلم سرسبز انداز کا۔
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ریزشِ سجدہ حبیبِ نیاز

فرماتے ہیں۔ تو آگیا لہجہ میں بچے دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا میرا سجدہ کن آنچہ کو تباہ ہو۔
 مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو غریب نواز
 اس شعر میں کچھ غضب نہ ہوا کے جملہ نے عجیب پڑ لطف معنی پیدا کر دئے ہیں ہل بان ہر بان
 کے موقع پر طنز اس کا استعمال کرتے ہیں۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔
 اسد اللہ حناں تمام ہوا اے دریا وہ زندہ شاہد باز
 فرماتے ہیں۔ اسد اللہ خان تمام ہوا یعنی مر گیا۔ اے انوس وہ زندہ شاہد باز کی پیش
 آدمی تھا۔

روایت (۳)

مرثوہ اے فوق اسیری کن نظر آتا ہے دام خالی نفس مرغ گرفتار کے پاس
 پرند جانور پکڑنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ چال لگا کر اس کے قریب نفس میں سی سم کے
 ایک طائر کو بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ طائر گرفتار کی آواز پر اس کے ہمیں طائر اک جمع ہو جاتے ہیں
 چال پر دانہ بکھا ہوا دیکھ کر کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مبادیہ چال کھینچ لیتا ہے۔
 جگر تشنہ آزار تسلی نہ ہوا جوئے خوں بہنے بہانی بن ہر خلیکے پاس
 فرماتے ہیں یاد وجود یک ہم نے لہو کی ندی ایک ایک کانٹے کے پاس لطف مجلس اٹھانے
 کے لئے اپنے تلواروں سے بیادی۔ لیکن جگر تشنہ آزار کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی اور تکلیف اٹھانے سے
 اسکا ہی نہ بھرا۔ لیکن شعر اسیر قیدی میر فرماتے ہیں۔ تسلی ہوا دل میاب نہ تھا چیم تر خون تاب
 منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے خوب وقت آئے تم اس عاشق بیاسے کے پاس
 تے کی روایت میں بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا جا چکا ہے اودہ یہ ہے۔

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب یار لائے مری یا میں آئے پھر کس وقت
 اس شعر میں مرزا صاحب یہ بیان فرماتے ہیں کہ صنف و مقامت کے سبب حالت انتظار میں جب آنکھیں کھلے رہنے
 سے معذور ہو گئیں۔ اس وقت تم اپنے عاشق یار کے پاس آئے۔ اب ہم جی بھر کر تم کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔

میں بھی رُک رُک کر مرتاجِ جویاں کے بلے دشنے لگتا تھا ہوتا مجھے غمخوار کے پاس
 فرماتے ہیں۔ غمخوار کے طعنوں اور ملامت و فحاشی نے کدِ خنجر سے مجھ کو قتل کر ڈالا۔ میں
 کیوں سک سک کر جان رہتا۔ اگر اسکے پاس اس زبان کے بدلے ایک تیز چھری ہوتی۔
 دہن شیر میں جا بیٹھے لیکن اسے دل نہ کھڑے ہو جئے خوابِ نل آزار کے پاس
 فرماتے ہیں۔ اسے دل شیر کے منہ کا لقمہ بن جانا اس سے بہت بہتر ہے کہ کسی معشوق
 دل آزار سے دل لگا جاوے۔

دیکھ کر تجھ کو چمن لکے ہو کرتا ہے خود بخود پیچھے گل گوشہ و ستار کے پاس
 فرماتے ہیں۔ تجھے دیکھ کر چمن کی قوتِ نامیہ اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ بھول خود بخود ڈیر ہر
 تیری دستار تک پہنچ جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ معشوق کے دیدار سے سب کے دلوں میں
 دلولہ شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس
 فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس اپنا سر پھوڑ کر غالبِ وحشی مر گیا۔ مگر ہم کو اب تک وہ اس کا
 تیری دیوار کے پاس شوق دیدار میں آکر بیٹھنا یاد آتا ہے۔ کیا بے نظیر مطلع لکھا ہے۔

روایت (س)

نہ لیوے گر حسن جو ہر طراوت سبزہ خط سے لکھائے خانہ آئینہ میں وئے نگار آتش
 فرماتے ہیں۔ آئینہ نولادی اگر تیرے سبزہ خط سے تروتازگی نہ حاصل کرتا رہے اور
 اس میں طراوت نہ پہنچتی رہے تو تیرے شعلہ رخسار کا عکس خانہ آئینہ میں ضرور آگ لگائے۔
 فروغِ حسن سے جوتی ہے جلِ مشکلِ عاشق نہ بیکلے شمع کے پاسے نکالے گرنہ خارِ آتش
 فرماتے ہیں۔ فروغِ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہو جاتی ہے اور شاہ یہ دیتے ہیں کہ پاپ
 شمع سے کانا کبھی نہ نکلے اگر آگ اس کو نہ نکلے شمع کے ڈورے کو خارِ شمع کہتے ہیں اور
 اس خار کا نکالنے والا شعلہ شمع کو بتایا ہے۔ بالکل نیا خیال ہے اور بڑی خوبی کیساتھ ادا کیل ہے۔

روایت (ع)

جاوہرہ زور کو وقت شام ہے تا شمع جریح و کرتا ہے ماہ نوے آخر پر وداع

مطلع ایک تہیہ کا طبع ہے تا شمع میرزا غائب اس خط کو لکھا ہے جو غروب آفتاب کے بعد و طلوع آفتاب کے پہلے ایک خط امین سماں پر دکھائی دیتا ہے اہل رمد کی اصطلاح میں اس کو قرآنی لٹریس کہتے ہیں مطلب شعر کا یہ کہ وقت شام آفتاب غرق کرنے کو آمادہ ہے اور آسمان ماہ و کوثر خوش راز ہمارا خستی معافیت کیسے تیار ہے۔

ریح بختارے۔ ہے سوزِ جاودانی شمع ہونے ہے آتشِ گل آتشِ بزدگانی شمع

فرماتے ہیں معشوق کے چہرہ انور سے شمع کو رشک پیدا ہو گیا ہے۔ توتی رنگ میں جل رہی ہے دوسرے صرع میں فرماتے ہیں کہ آتشِ گل جو معشوق کے چہرہ میں ہے۔ یعنی سرخی رنگ و ہمارا وہ شمع کے لئے آبِ حیات کا حکم کھتی ہے۔ فارسی میں بکھی ہوئی شمع کو شمع کشتہ کہتے ہیں اس لئے شمع روشن کو میرزا صاحب نے زندہ فرض کیا ہے۔ اکثر شعرا بھی لکھتے ہیں۔

زبانِ اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

فرماتے ہیں۔ اہل زباں کی زبان میں خاموشی کو موت کہتے ہیں۔ بزم میں یہ بات زبانی شمع کے روشن ہوئی یعنی ظاہر ہوئی ہے یا معلوم ہوئی ہے یہ مطلب یہ ہے کہ جب شمع بجھ جاتی ہے تو اس شمع کشتہ کہتے ہیں اور جب جلتی رہتی ہے تو شعلہ کو زبانِ شمع سے تعبیر کرتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اہل زباں کا خاموش رہنا اہل زباں کی موت سمجھا جاتا ہے۔

کرے ہے صرف باپائے شعلہ نقہ تمام بظریہ اہل فنا ہے فنا نہ خونی شمع

فرماتے ہیں۔ شمع نقہ شعلہ کے اشارہ پر اپنی زندگی کا نقہ تمام کر دیتی ہے یعنی شعلہ کی محبت میں شعلہ سے بولنگا کراڑ سرتاپا فنا ہو جاتی ہے جس طرح عاشقانِ الہی شعلہ و لنگا کراڑتائی لہذا جو طاعت ہیں اور اس سستی مودوم سے گزر جاتے ہیں۔

غم کو حسرت پر وانیہ کا ہے لے شعلہ تھے لڑنے سے ظاہر ہے نا توانی شمع

فرماتے ہیں۔ لے شعلہ تو جو کانپ رہا ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ شمع بہت نا توان اور کمزور

ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو محرومی و ناکامی پر روانہ کا اس قدر رنج و غم ہے کہ اپنے کو گھلاٹ
 دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعلہ شمع جو ہوا کی وجہ سے حرکت کرتا ہے اس کو میرزا صاحب کی ناکھیلی
 کمزوری کا سبب بتاتی ہے شعلہ سے مخاطب ہونے نے شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔
 ترے خیال سے رُوحِ احترار کرتی ہے بجلوہ ریزی بادوبہ پر فشانے شمع
 فرماتے ہیں تیرے خیال سے رُوحِ عاشق کو ایک حبش سرور حاصل ہوتی ہے جس طرح ہوا کے
 چلنے سے شعلہ شمع کو حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کو تیرے خیال سے سستی سرور پیدا
 ہو جاتی ہے۔

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ نغمہ گنگلی ہے شہید گل خزاں شمع
 فرماتے ہیں۔ داغِ غمِ عشق کی خوشی و سرور کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ وہ ایک فضل بہار کی
 کیفیت رکھتا ہے جس طرح گل سے شمع بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح عاشق داغِ عشق سے شہید ہو جاتا ہے
 مطلب یہ ہے داغِ عشق میں ایسی بہار پوشیدہ ہے کہ شگفتگی اس پر ہزار جان سے مٹی ہوئی ہے۔
 جسے دیکھ کے بالین یا پر مچھکو نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانی شمع
 فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمع بھی یارِ پناہ عشق ہے اور مچھکو پناہ قریب سمجھتی ہے اس لئے کہ یار کے
 پاس مچھکو دیکھ کر شک و حسد میں جلی جاتی ہے۔ مجھے شمع کی جانب سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی ہے۔

رولیت (ف)

بیمِ رقیب کا نہیں کرتے وداع ہوش مجبویاں تلک ہوئے لے اختیار حیث
 فرماتے ہیں۔ رقیب کے خوف سے میں بیہوش بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ بیہوش
 ہو جانے کی حالت میں رازِ عشق سے خبردار ہو جائیگا۔ افسوس ہے کہ مچھکو اپنے ہوش پر بھی
 اختیار نہیں۔ انتہا کی عبوری یہ ہے کہ میری خوشی پر یا راہ پر رقیب کا ڈر غالب آگیا
 مطلب یہ ہے کہ جی تو بھی چاہتا ہے اور موقع بھی ایسا ہی ہے کہ بیہوش ہونا ضروری سمجھا گیا ہے مگر
 انشاء راز کے خیال سے ایسا نہیں کر سکتا۔

جتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے اسے نامائی فتن شعلہ بار حیف
 فرماتے ہیں اس بات کے تصور سے دل جتا ہے کہ ہم بادِ چودا آہِ شعلہ بار رکھنے کے ایک با
 نہیں جل جاتے جو آگ سینہ میں شعل ہے اس کا وہی تقاضا ہے کہ ایک ہی دفعہ جل کر خاکستر ہو جائے
 لیکن نامائی اور نامرادی ایک بار جل جانے سے روکتی ہے۔

رویت (۱۷)

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نہک کیا مڑا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نہک
 فرماتے ہیں۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے ہیں اور ان پتھروں سے زخم بدن پر موجلتے ہیں
 لوگ اتنے بے پروا ہیں کہ زخموں پر نہک نہیں چھڑکتے اگر پتھر میں نہک ہوتا یا یہ پتھر نہک سنگ کے
 ٹکڑے ہوتے تو بڑا لطف آتا یعنی جسم پر زخم بھی پڑتا تو نہک بھی چھڑک دیا جاتا۔

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زحمتِ دل ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نہک
 فرماتے ہیں۔ زخمِ دل کے لئے باعثِ نازش گردِ راہِ یار ہے ورنہ تک تو دیا میں بہت کثرت
 سے پیدا ہوتا ہے اور بہت ارزاں ہوتا ہے لیکن زخمِ دل پر نہک سے وہ نصف حاصل نہیں ہوتا جو
 کے رستہ کی خاک زخموں میں بھر کر مزا دیتی ہے۔

مجھ کو ازانی نہ ہے تھک کو مبارک ہو جیو نالہ لیل کا درد اور خندہ محل کا نہک
 اس شعر میں لعل و نشر مرتب ہے یعنی تھک کو ازانی رہے نالہ لیل کا درد اور تھک کو مبارک ہو جو
 خندہ محل کا نہک۔

شورِ جلاں تھا کنارِ بحرِ کس کا کہ آج گردِ ساحل ہے زخمِ موجِ دریا نہک
 فرماتے ہیں کس گویہ دریا، لطافت نے دریا کی ریتی میں گھوڑے کو کا دے اڑن میرا تھا جسکے
 ناؤں کی گردِ موجِ دریا کے زخموں میں نہک کا کام دے رہی تھی مطلب یہ کہ میرے شوق کا گھوڑا
 موتِ دریا سے بھی تیز رفتا اور سب غماں جسکے رشک نے موجِ دریا کے زخموں میں نہک چھڑک دیا۔
 واد دیتا ہے مے زخمِ جگر کی واہ واہ یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس کا نہک

فرماتے ہیں۔ میرا مصروف جہاں کہیں تک کو دیکھتا ہے۔ مجھے یاد کر لیتا ہے یعنی بے اختیار دلوں
میں اور میرا زخم جگر یاد آجاتا ہے جس میں وہ تک بھرا کرتا ہے اور جب میں یاد آتا ہوں تو میرے زخم
جگر کی تعریف بھی کرتا ہے۔

چھوڑ کر جاتا ہوں مجروح عاشق حیف ہے دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگ میں اعضا تک
فرماتے ہیں۔ ایسے وقت میں تن مجروح عاشق کو چھوڑ کر تیرا جانا افسوس کے قابل ہے کہ
جیل تو زخم کا طلبگار ہے اور اعضائے جسم تک کے خواستگار یعنی نہ ابھی زخموں میں تک بھرا ہے
اور نہ دل میں کوئی زخم لگایا ہے۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گاسپے تو قیرو رو زخم مثل خندہ قاتل ہے سرتاپا تک
فرماتے ہیں غیر کا منت پذیر ہونا میں پسند نہیں کرتا اور وہ بھی درد کی رعایت سے میرا
زخم خندہ قاتل کی طرح سرتاپا تک ہے۔

یاد ہیں غالب جتھے وہ دن کہ وہ بد وقت میں زخم سے گرتا تو میں ہلکوں سے چٹتا تھا تک
فرماتے ہیں۔ اے غالب تو میرا قدیمی دوست و غمخوار ہے ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے تجھے وہ
دن بھی یاد ہیں کہ جب میرے زخموں میں سے تک کے درد سے گر پڑتے تھے تو میں ہلکوں سے چٹا کرتا
تھا۔ اس بیان میں دو خوبیاں پیدا ہو گئیں مایک یہ کہ میں اتنا ایدا دوست تھا کہ میرے زخم سے جو
حصہ تک کا کم ہو جاتا تھا میں اس کو شوق کے ساتھ چن کر پھر زخم میں بھر دیتا تھا۔ دوسری یہ خوبی ہے
کہ تک زمین پر گرے تو ہلکوں سے اٹھانا چاہئے اس مشہور بات کی طرف اشارہ ہے۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہوسنے تک کون جیتا ہے تری زلفت کے سرمونے تک
فرماتے ہیں۔ آہ کو ایک عمر چاہئے کہ اثر پیدا کرے اور جب تک آہ میں اثر پیدا نہ ہوگا اور تیری
زلفت ہمارے حال پریشاں سے خبردار ہوگی۔ ہم اس وقت تک کہ زندہ رہ سکتے ہیں۔

داس ہر موج میں ہے حلقہ صد کام ہنسنگ دیکھیں کیا گزرتے ہے طرے پہ گھر موندے تک
جو مطلب اس شعر میں لکھا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے

میں سخت شکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (از یادگار غامد)

عاشقی صبرِ طلب اور مستی بیتِ سبب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
فرماتے ہیں۔ عاشقی صبرِ طلب کا کام ہے اور فنا صبری کر رہی ہے کہ جہاں تک جد بکلی ہو گیا
ہونا چاہئے میں دل کو کیا کر صبرِ دوں اور دھڑکناؤں بھر بطلب یہ ہے کہ جب جگر خون ہو جائیگا
اس وقت آہ میں، شر آئیگا، ور کا میانی کی صورت نظر آئیگی۔ عشق ایسی شے نہیں ہے کہ آج
ہی آدمی عاشق ہو اور آرتھ ہی عشوق پر اس کا اثر ہو جائے۔

ہنسنے والا کہ تناسل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیگا ہم تم کو خبر نہ دے تک
اس زمین میں ایسا صاف و ربے مثل شعر نکالنا میرزا ہی جیسے کامل فن کا کام تھا۔ فرماتے
ہیں یہ تو ہم نے انا کہ تم غافل کو کام میں نہ لاؤ گے اور جلد چلے آؤ گے مگر تم تک خبر بھیجے بیٹھتے
تو ہم خاک ہو جائیں گے اس کا کیا عذاب ہے۔

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں یک عنایت کی نظر مچنے تک
فرماتے ہیں جس طرح آفتاب کی گرمی سے شبنم بجا پٹ پٹا جاتی ہے، میں بھی اسی طرح
تیری ایک نظر عنایت میں فنا ہو جاؤں گا۔ مطلب یہ ہے کہ میری ہستی شبنم سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتی نہ مجھے اس سے زیادہ قیام و ثبات رہ سکتا ہے۔

یک نظر بیشنس نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمی بزم ہے اک رقص شرع ہونے تک
فرماتے ہیں، اسے غافل فرقہ نشان۔ ایک نظر سے زیادہ ہستی کا وقفہ نہیں ہے اور
اس کی مثال پیش کرتے ہیں کہ گرمی بزم یعنی بزمِ ہستی کی گرمی اگر گرمی کے رقص شرع ہونے تک ہے جس طرح
شرع آتش چمک کر بجھ جاتا ہے اسی طرح انسان دم بھر میں فنا ہو جانے والی ہستی رکھتا ہے۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جہنمِ علانج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحرِ ہونے تک
اس شعر میں مرزا صاحب نے انسان کی زندگی کو اس کا خاک سے کہ جب تک موت نہیں آتی
اس کو غم سے نجات نہیں آتی شمع سے تشبیہی ہے کہ جب تک شمع بجھ نہیں آتی وہ برابر جھلکتی رہتی

ہے۔ ایسی بدیج و نادرتشیہات میرزا صاحب کے سوا دوسرے شخص کو سوجھتی
ہی نہیں۔

رویت (ک)

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دل سے مدعا نہ مانگ
فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو دعا قبول ہونے کا یقین ہے تو پھر دعائیں مانگ کر کیوں تضرع اوقات کرتا
ہے۔ بغیر کے معنی یہاں سوا کے ہیں یعنی ایک دل سے مدعا کے سوا اور کچھ نہ مانگ جب دل بے غل
عطا ہو گیا پھر کسی چیز کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اس دعا سے بڑھ کر اور کوئی دعا ہو ہی نہیں سکتی۔
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یا د مجھ سے مرے گناہ کا حساب آخدا نہ مانگ
اس شعر میں نئی طرح کی ترغیب ہے جو بالکل چھوٹی ہے۔ دیکھا ہر درخواست کرتا ہے کہ اسے خدا
مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور درپردہ الزام دیتا ہے گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب
کیونکر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کا شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں ملے
ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں ان کی گنتی یا د آتی ہے گناہوں
اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب
عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہتی مثلاً شراب
پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میرا یا تو شراب نہ ملی پس جتنے گناہ کئے ہیں اتنے ہی داغ
دل پر کھائے ہیں (از یادگار غالب)

رویت (ل)

ہے کس قدر ہلاک فریب و نائے گل بیل کے کاروبار میں زندہ ہائے گل
فرماتے ہیں بیل اس فریب اور دھوکے میں اپنی جان دے دیتی ہے کہ گل میں وفاداری
کی صفت کو ثبات و قیام ہے۔ بچوں کو دیکھو کہ وہ بیل کی اس غلط فہمی پر چندہ زن ہیں۔ مطلب
یہ ہے کہ ہر عاشق کی نگاہ میں ہر مشوق ایک غیر فانی ہستی ہے۔

آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پٹے میں حلقہ دام ہوا اے گل
ہوا اے گل شوق گل فرماتے ہیں۔ آزادی نسیم نسیم سے یہاں بڑے گل مراد ہے یعنی بڑے
گل کو آزادی مبارک ہو حلقہ ہائے دام گل ٹوٹے پڑے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ بچوں
کھل گیا اور بڑے گل قید سے آزاد ہو گئی۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا اے واہے نالہ لب خیزیں نوا اے گل
ہر شخص موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا یعنی فریفتہ ہو گیا۔ انوس ہے نالہ لب خیزی
نوا اے گل پر مطلب یہ ہے کہ رنگ گل درحقیقت گل کا نالہ خونچکاں اور فریاد و گھراش ہے
جس کو لوگوں نے غلطی سے موج رنگ سمجھ لیا ہے اور اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔

خوش حال اس حریف سب سے کا کہ جو رکھتا ہوشل سایہ گل سر بیائے گل
فرماتے ہیں۔ بڑا خوش نصیب ہے اس کا کیا کہنا ہے جو شرابخوار معشوق کے قدموں
پر سر رکھے ہوئے عرض تمنا کر رہا ہو۔ اس شعر میں عاشق بدست کو شاخ گل سے اور
معشوق کو گل سے تشبیہ کی ہے۔

ایجاد کرتی ہے اے تیرے لئے بہار میرا قریب نفس عطر سائے گل
فرماتے ہیں بہار نے بھولوں کو جن میں اس نے پیدا کیا ہے کہ یہ تیرے گلے کا ہار ہو
اور تیرے بستر پر تیرے ساتھ رات بھر سوتے رہیں اور میں دیکھ کر نلیوں معلوم ہوا کہ نفس
عطر سائے گل میرا قریب ہے۔

شرمندہ کستہ میں مجھے باد بہار سے میناے بے شراب دل بے ہوئے گل
فرماتے ہیں۔ اگر میرا شیشہ شراب سے خالی ہوتا ہے اور دل میں کبھی میرا شوق گل نہیں
ہوتا تو یہ دونوں باتیں مجھ کو یاد بہاری سے شرمندہ کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ بہار میں شراب
شیشہ میں ہونی لازمی ہے اور دل میں سیریاغ کا شوق ہونا ضروری ہے۔

سطوت سے تیرے جلوہ حسن عینور کی نولں ہے مری نگاہ میں رنگ اے گل

فرماتے ہیں۔ تیرے رعب جس غیور کے جلوہ سے میری نگاہ میں ابلنے لگی کانگ خون بنگیا
ہے مطلب یہ ہے چونکہ تیری غیرت نہیں چاہتی کہ میرا عاشق کسی دوسرے مشوق پر فریفتہ ہوا سکے
پھول کی رنگت میری آنکھوں میں خون کا حکم رکھتی ہے۔

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
فرماتے ہیں جب کوئی پھول کہتا ہے تو اور کلیاں یہ سمجھ کر کہ تو پھول کے پردہ میں جلوہ گر ہوا
ہے پھول بن کر سلسلہ دار کھلتی شروع ہو جاتی ہیں اور اس سلسلہ کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک
پھول کے پیچھے دوسرا پھول بھاگتا آ رہا ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوش آرزو جس کا خیال ہے گل جیب قبا سے گل
فرماتے ہیں۔ اے غالب مجھ کو اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو پھول نے
اپنا زیب گریاں بنایا ہے مطلب یہ ہے کہ جس شاعر حقیقی کے خیال میں پھول اپنی زیب و زینت
کرتے ہیں۔ میں اس سے ہم آغوشی کی تمنا رکھتا ہوں یعنی اس سے وصال کا خواہشمند ہوں۔

روایت (۴)

غم نہیں ہوتا ہے آزاد کو مہیش از یک نفس برق سے کہ تیرے میں روشن شمع ماتم خانہ ہم
فرماتے ہیں ہم آزاد لوگ ہیں ہم کو غم دنیا دم بھر سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ماتم خانہ
میں بجائے شمع کے بجلی کام دیتی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح بجلی ایک آن واحد میں چمک کر چھپ جاتی
ہے اسی طرح ہمیں غم کا خیال آ کر فزائٹ جاتا ہے یعنی اس کا اثر تھوڑی دیر بھی باقی نہیں رہتا۔

مختلین برہم کسے گنجھ باز خیال ہیں ورق گردانی نیزنگ یک تنخانہ ہم
فرماتے ہیں اب تک جو مختلین برہم ہو چکی ہیں ان کو گنجھ باز خیال یا دولہا ہے۔ ہم گویا نیزنگ تنخانہ
کی ورق گردانی میں مطلب یہ ہے کہ حسینوں کی مختلین جو برہم ہو چکی ہیں اب تک ہمارے خیال
میں ہیں اور ہر وقت خیال میں رہا کرتی ہیں۔ گنجھ کی ورق گردانی سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح گنجھ
کھیلنے والے پتوں کو بار بار انگلیوں میں پھیل کر دیکھتے رہتے ہیں وہ تمام بازیوں کے ورق شمار کرتے رہتے ہیں۔

ای سرج گزری ہوئی محافل نشاط کی تصویریں جن کو ہم نیزنگ تجنہ سمجھتے ہیں ہمارے پیش نظر ترقی ہیں۔ یہ تشبیہ ایک بالکل نئی تشبیہ ہے جو آج تک کسی کے کلام میں نہیں لکھی گئی۔

باد جو دیکھ جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں میں چراغانِ شبستانِ دل پر روانہ ہم
 دانتے ہیں کہ دل پروانہ میں جس تسمیے کے شوق سے روشن ہو کر اس قدر ہنگامہ آرائی کی ہے دایا
 ستوار و پوشیدہ ہے کہ اس کیلئے پیدائی اور تلوار کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا ہی حال ہماری مہستی کا ہے کہ شگہ نہ
 بہت کچھ ہے مہستی کا کہیں نشان بھی نہیں ہے یعنی حقیقت میں مہستی اگر ہے وہ ایک ہی ہے۔

ضعف سے بے نفعیت کا یہ ترک جستجو میں بال تحیہ کا وہ مہبت مردانہ ہم
 فرماتے ہیں ہم نے جو جستجو ترک کر دیا ہے یہ قوت کے سبب نہیں کیا ہے بلکہ جو قوت
 ہم میں آتی نہیں ہی ہے۔ اس واسطے ہم مہبت مردانہ کی تحیہ گاہ کیلئے وبال بن گئے ہیں مطلب یہ
 کہ مردوں کا یہی کام ہے کہ مہبت کو اپنا نگاہ بنائیں۔ لیکن یہاں برعکس معاملہ پیش آیا ہے۔
 و اٹھم کھس اس میں لاکھوں تمنایں اسد جانتے ہیں سینہ پر خون کو زنداںِ خانہ ہم
 فرماتے ہیں ہم اپنے سینہ پر خون کو جیل خانہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے سینہ میں لاکھوں
 تمنائیں عمر بھر کیلئے قید ہو گئی ہیں ایک کنبی بھلیں آئندہ زندگی جہاں کے بھلنے کی امید کی جا سکتی ہے
 مطلب یہ ہے کہ مہبت ہی آرزوئیں ہمارے دل پر ایسی ہیں جن کا ٹکنا صرف خدا کے فضل پر منحصر ہے۔

بنالہ حاصل دل بستگی فراہم کر متاعِ حاشائے زنجیرِ حزنِ صدام معلوم
 میرزا صاحب تعلقات دنیا کی خدمت ان غفلتوں میں فرماتے ہیں کہ اگر تجھے دنیا سے دل بستگی
 ہے تو نالہ کشتی اختیار کر۔ اس لئے کہ خانہ زنجیر میں جو کچھ مال و دولت ہے وہ فقط مسدا شین فرما
 ہے اور کچھ بھی نہیں۔ قلع خاطر کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔

مقلد مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دو رکھ لی مر سے خدا نے مری بجی کی شرم
 پردیس میں مرنا جو شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں
 بے گور کفن پڑے ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس واسطے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کس رتبہ کا

ہوئی تھا لیکن وطن میں جہاں ایک زمانہ واقعہ حال ہو۔ مگر خریدار و غنچہ دار ایک بھی نہ ہو وہاں
مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے
پر دس میں مار کر میری یکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گونپا ہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر
اہل وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا ہے (از یادگار غالب)
وہ حلقہ ہائے زلف کب میں ہیں آخذا رکھ لیجو میرے دعویٰ و راستگی کی شرم
فرماتے ہیں اس کی گونگدالی زلفیں میری گھات میں ہیں۔ ایذا اب میرے دعویٰ و راستگی
کی شرم تیرے ہاتھ ہے۔ تو میری شرم رکھ لینا مطلب یہ ہے اگر زلفوں میں اسیر ہو گیا تو میرا دعویٰ
آئندہ آگے دو راستگی باطل ہو جائیگا۔

روایت (ن)

لوں و ام بخت خفتہ سے یکے کا رخ و دلے غالب یہ خون ہے کہ کہاں سے ادا کر دوں
فرماتے ہیں۔ بخت خفتہ سے ایک رات کی تیند قرض لے لوں لیکن اسے غالب یہ خون ہے
کہ اس قرضہ کو ادا کہاں سے کرونگا مطلب یہ ہے کہ قسمت تو سہی ہے اور میری آنکھوں میں نیند
نہیں ہے۔ اگر اپنے مقدر سے ایک گہری تیند قرض لے لوں تو لے سکتا ہوں لیکن یہ قرضہ ادا کیونکر
ہوگا یعنی میں تو دولت خواب سے محروم ہی ہوں۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب روز و ماہ و سال کہاں
فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ ہمارا باقی نہ رہا اور وہ فراق کی راتیں بھی کٹ گئیں جن کا کاشٹا
پاڑ کاٹنے سے زیادہ دشوار تھا اور وہ وصل کے لطف بھی مٹ گئے جواب یاد آتے ہیں وہ راتیں
وہ دن، وہ جینے، وہ سال کہاں چلے گئے جس میں فراق و وصال کے رنج و عیش اٹھائے تھے اور
وہ شوق بھی باقی نہیں رہا۔ یہ ساری غزل مسلسل اسی مضمون میں نظم کی گئی ہے۔

فرصت کار و بار و ذوق کسے ذوق نظارہ جمال کہاں
فرماتے ہیں۔ وہ شوق کی شہسوار کسے اور وہ نظارہ جمال کا ذوق و شوق اب

کہاں ہے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا شوہر سو داسے خط و خال کہاں
فرماتے ہیں۔ وہ دل جس میں عشق سما گیا تھا وہ اگر مٹ گیا تو مٹ جائے۔ لیکن افسوس تو
یہ ہے کہ وہ دماغ بھی باقی نہ رہا جس میں سو داسے خط و خال تھا۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں
فرماتے ہیں۔ یہ ساری باتیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ ایک شخص کے تصور سے تھیں
اب وہ خیال کی بلند پروازیاں اور رنگینیاں کہاں باقی ہیں۔

ایسا آساں نہیں لہو رونا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
فرماتے ہیں۔ اب لہو رونا کوئی آسان بات نہیں ہے یعنی عشق کے مصائب کی انتہا
ہو چکی اور خون دل جگر تمام و کمال صرت ہو جانے سے نہ دل میں طاقت باقی رہی نہ جگر میں حالت۔
ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق والے جو جائیں گہ میں مال کہاں
فرماتے ہیں۔ ہم سے قمار خانہ عشق ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ اب دہاں جا کر کیا کریں جب
جب گہ میں مال ہی نہ رہا یعنی نقد دل سکے داغ و دلت صبر کچھ بھی پاس نہ رہا اب داؤں کس مال
پر لگائیں ماور جو اکس برتے پر کھیلیں۔

فکر دنیا میں سرکھپاتا ہوں میں کہاں اور یہ وبال کہاں
فرماتے ہیں۔ میں تو عشق کا بندہ تھا عجم عشق سے کام چڑتا تھا۔ ہجر کے مصائب اٹھاتا
تھا۔ وصل کی لذتیں لوٹتا تھا۔ مجھ کو عجم دنیا سے کیا سروکار۔ میں اس دباں کو کیا سمجھتا تھا۔
مصفحل ہو گئے قوائے غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں
فرماتے ہیں۔ جوانی کا زمانہ گزر گیا۔ اعتدال عناصر کا وقت کہاں رہا۔ شباب کی مدت
اب ختم ہو گئی۔ قویٰ میں مہملاں شروع ہو گیا۔

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

فرماتے ہیں معشوق نے جو ہم سے وفاداری کا برتاؤ برتا ہے تو قریب اُسکو خاکتے ہیں یہ تو قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اچھے لوگوں کو دشمن یا حاسد بُرا کہا کرتے ہیں۔

آج ہم اپنی پریشانی حنا طراں سے کتنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں فرماتے ہیں۔ آج ہم اپنے دل کی پریشانی کا حال اُن سے کتنے کے ارادہ سے اُن کے پاس جاتے ہیں۔ مگر دیکھنا چاہئے کہ وہاں جا کر کیا کہتے ہیں۔ اس شعر میں دو معنی پیدا کئے گئے ہیں ایک یہ کہ ان کے سامنے پہنچ کر ہم کچھ کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ یعنی عجب جس سے ہم میں طاقت گویائی باقی رہی ہے یا نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارا حال سن کر دیکھئے اس کے جواب میں کیا فرماتے ہیں۔ مگر زیادہ لطیف پہلے ہی معنی میں ہے۔

اگلے دھنوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کو جوئے و نغمہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں! فرماتے ہیں۔ وہ لوگ جو شراب اور کھانے کو غم غلط کرنے والے سامان میں شمار کرتے ہیں وہ پُرنے زمانے کے بھولے بھالے آدمی ہیں۔ سے و نغمہ اندوہ رہا نہیں ہے بلکہ اندوہ فرما ہے۔ اسلئے کہ جب کوئی سامان نشاط آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یا دیار تازہ ہو جاتی ہے۔ بجائے غم غلط ہونے کے رنج جان گسل کا سامنا ہو جاتا ہے۔

دل میں آجائے ہی ہوتی جو فرصت عشق سے اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟ فرماتے ہیں جب مجھے عشق سے افات مل جاتی ہے تو میرا معشوق میرے دل میں آ جاتا ہے اور یہ میرے نالہ کے اثر سے ہوتا ہے مجھے معلوم نہیں اور کون سے نالہ کو رسا کہتے ہیں اس سے زیادہ رسائی نالہ کو کیا ہوگی کہ فوراً ہی معشوق کو کھینچ کر دل میں لے آتا ہے۔

ہے پرے سرحد اور اک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں قبلہ پر قبلہ نما کا اطلاق کرنا میرزا صاحب کے حصہ کا مضمون ہے۔ میرزا صاحب پہلے کسی نے نہیں کہا۔ یہ شعر ان لوگوں کے اعتراف کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سلمان بھی دیوار کعبہ کے پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ہمارا مسجود مطلق۔ اور اک کی سرحد سے بہت دُور ہے

یعنی کعبہ کو دیکھ کر یا بغیر دیکھے یہ سمت کب سجدہ کرنا اس غرض سے نہیں ہے کہ ہم کعبہ کے چہروں کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ ہم اُس کو سجدہ کرتے ہیں جو جہات سے منتر ہے۔ البتہ سجدہ کے لئے جہت لازمی ہے۔ اس لئے جہت کعبہ کو معین کر لیا اور وہ جہت مثل قبلہ خاکے ہے۔

پائے انگار پہ جب سے تجھے جم آیا ہے ظاہرہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
فراتے ہیں۔ ہمارے پاؤں جو رستے کے کانٹوں سے زخمی ہو گئے ہیں اُن پر تجھ کو جم گیا ہے
اس لئے ہم تیری راہ کے کانٹوں کو کاٹتے نہیں کہتے بلکہ ہر گیا کہتے ہیں۔ ہر گیا۔ ایک بڑی کاناہ
ہے۔ اس بولی کی جڑ انسان کی کلر کی ہوتی ہے مشہور ہے کہ جو آدمی اپنے پاس اس جڑ کو رکھتا ہے
اس پر لوگ ہر بان ہر جانب میں مین وہ حسب کمال اثر رکھتی ہے۔ اس لئے اس کے راہ کے کانٹوں کو
ہر گیا ہے تعبیر کرتے ہیں۔

اک شرادل میں ہے افسانہ لونی سیرت کا کیا آگ منسوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
فلسفہ جدید کے ہاں (مسند دود، ابن خلدون، جواب ثابت ہوا ہے) اس شعر میں نظم باقیات
جس حضرت مصنف کی فلسفیانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ شر سے مراد روح حیوانی ہے انسان
میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں روحانی حیرت سے انسان کو سانس لینے کی ضرورت نہ تھی
جوتی بلکہ ہر سانس کی ہوا روح کو مستقر کرنا مقصود ہوتا ہے۔

دیکھئے لاتی ہے اشخ کی نخوت کیا رنگ اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں
فرماتے ہیں۔ ہم اس کی ہر بات پر نام خدا یا ماشاء اللہ چشم بدور کہا کرتے ہیں گو اس کی
نخوت کو ترقی ہمارے اسی قسم کے جلوں سے ہوتی رہتی ہے۔ انجام کو دیکھئے ان دونوں
کی نخوت کا کیا ہوتا ہے یعنی معلوم نہیں یہ اونٹ کس کل بیٹھے۔

وحشت و شیفۃ اب مرثیہ لکھیں شاہد مر گیا خالک آشت
شیفۃ سے مراد خواب مصلیٰ خان بہار شیفۃ میں جو اگلا آدیں آشت سے مراد
غالباً غلام علی خان صاحب آشت میں دیکھ دوں گا کہ کیا ہے۔

زیادہ میرزا صاحب کے ماننے والے تھے۔ مومن خاں صاحب کے انتقال کے بعد بیرونوں صاحب مشورہ سخن میرزا صاحب ہی سے کرتے تھے۔

آبر کیا خاک میں گس کی کہ گلشن میں نہیں ہے گریباں رنگ پرین جو دامن میں نہیں فرماتے ہیں۔ اس پھول کی آبر کچھ نہیں ہے جو گلشن سے باہر نکل گیا۔ گریباں پھول کا بازار میں جا کر بجا غلام بن کر آبر کا کھو دینا۔ گریباں یہ مضمون دوسرے معنی پر ہستمال ہو سکتا ہے۔ گریباں رنگ پرین ہے جو دامن میں نہیں ہے۔ یعنی جب گریباں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دامن میں جا بیگا تو پھول بن جائے گا۔

ضعف کے گریہ کچھ باقی مسے تن میں نہیں رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کے دامن میں نہیں فرماتے ہیں۔ اسے گریہ تیرا غلام یہ ہوا کہ میرے جسم میں کوئی حالت ہی باقی نہیں رہی۔ تو نے خون کو آنسوؤں کے رستہ بنا کر میرے جسم میں ایک قطرہ بھی لو کا باقی نہ رکھا اور جس قدر رہ گیا تھا وہ اتنا کم تھا کہ ہمارے آنکھ سے ٹپکنے سے چہرہ کا رنگ نکل اڑ گیا اور جو چہرہ کا رنگ نکل اڑا ہے وہ دامن کے حصہ کا تھاب دامن بے لہو کے رہ گیا۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب فتنے اسکے گھر کی دیواریں کے روزن میں نہیں فرماتے ہیں۔ اس کے شوق وید میں نگاہ آفتاب کے اجزا جمع ہو کر ذرات کی شکل میں ظاہر ہو گئے ہیں۔ روزن دیوار یا ریں خاک کے فتنے نہیں ہیں۔

کیا کہوتا رہی زندانِ غم اندھیر ہے چنیدور صبح سے کم صبح کے روزن میں نہیں فرماتے ہیں۔ زندانِ غم کی تاریکی کا حال کیا بیان کروں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ (قاعدہ ہے کہ جس جگہ تاریکی زیادہ ہوتی ہے وہاں بخود ہی سی روشنی بھی بہت معلوم ہوتی ہے) ادا ایسا اندھیرا ہے۔ روزن دیوار میں جو مدنی کی گولی بنا کر رکھی ہے وہ سپیدہ سحری کی طرح سے چمک رہی ہے۔

روشن ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے انجن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں

یعنی دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو خواہ ماں و دولت کی۔ خواہ ملک و ملت کی خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمی میں برقی یعنی دلوں میں محبت میں واسطی شامل اس نغمہ کی ہے جس میں شمع کی روشنی میں۔ (ازید و گالیاں) بے مثل شعر لکھا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوی کی طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں فرماتے ہیں۔ زخم میں ٹانے روانے سے غیر مجھ کو علاج کرنے کا طعن دیتا ہے۔ وہ نازان پیش تھکتا کہ سوئی کے زخم میں ہی وہی تکلیف ہے جو زخم ڈالنے وقت تلوار یا تیر یا کسی اور وحار دار آلہ سے ہوتی ہے۔ لذت کا لفظ تکلیف کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ شعر کی عمرگی میں کیا کلام ہے۔

بسکہ ہں چمک بہار ناز کے ماسے ہوئے جلوہ گل کے سوا اگر واپسے دفن میں نہیں، فرماتے ہیں۔ ہم ایک بہار ناز کے کشہ حسن ہیں۔ دفن میں بھی اسی بہار ناز کے تصور سے جلوہ گل کا سماں ماسے پیش نظر ہے۔

قطرہ قطرہ اک ہیولی ہے نئے تاسور کا خوں بھی ذوق و رنگ ناز کے تن میں نہیں فرماتے ہیں۔ میرے خون کا ایک ایک قطرہ تاسور کی صورت پیدا کر رہا ہے جس طرح ہوسلے پر سے ایک صورت معدوم ہوتی ہے اور دوسری صورت طاری ہوتی ہے۔ اسی طرح خون کی ہر وہ سے لہو کے قطرہ کی صورت فنا ہو کر تاسور کی شکل پیدا ہو جائیگی اور جسم میں جس میں مقام پر لہو کی بوندیں ہیں وہاں تاسور پڑ جائیگے۔

لیکن ساقی کی نخوت قلم آشامی مری معجزے کی آج رگ جینا کی گردن میں نہیں فرماتے ہیں۔ ساقی کو شرب پلانے پر بہت غور تھا لیکن میری قلم آشامی نے آج اس کے غور کو ڈھادیا میں نے اس کثرت سے شراب پی کہ کسی شیشہ میں سوجے باقی نہ رہی۔

ہو فشا صنعت میں کیا ناتوانی کی نمود تدر کے جھکنے کی بھی آسائش کے تن میں نہیں فرماتے ہیں صنعت مجھ کو ایسا بچہ ہے کہ اظہار ناتوانی کا موقع بھی نہیں ملتا۔ یعنی تدر کا جھکنا

ضعف کی علامت ہے۔ مگر ضعف نے مجھ کو چاروں طرف سے بھینچ رکھا ہے۔ اب کسی طرف سے قدرت کے ٹھیکنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ موغرت میں قدر بے تکلف ہوں و مُشبت خس کہ گلخن میں نہیں اپنے تئیں پھوس غیر سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح پھوس گلخن میں ہوتا ہے تو جتنا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

عہدے سے مریح ناز کے باہر نہ آ سکا گراک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں فرماتے ہیں۔ اس کے ناز و افلاز کی تعریف جیسی ہوتی جائے تھی مجھ سے نہ ہو سکی اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر صرف ایک ہی ادا ہو تو میں اُسکو قضا کہہ کر عہدہ مداحی سے سبکدوش ہو سکتا تھا۔ وہ تو سراپا ادا ہے کس کس ادا کی تعریف کروں۔

حلقے میں چشمہائے کشادہ بسوئے دل ہزار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں فرماتے ہیں۔ تیری لغویں کے گھونگر چشمہائے کشادہ بگردل کی تاک میں صدف ہیں سائے مجھے مناسب ہے کہ ہزار زلف کو نگہ سرمہ ساسے تعبیر کروں۔

میں اور صد ہزار نواسے جگر فریاش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں فرماتے ہیں۔ میں ہوں اور ہزاروں لاکھوں جگر خراش ناسے ہیں۔ تو ہے اور ایک سُنی آن سُنی کہ جس کا میں بیان نہیں کر سکتا۔

ظالم کے گماں سے مجھے متفضل نہ چاہا ہے ہے خدا نہ کردہ بچے بے وفا کہوں فرماتے ہیں۔ اسے ظالم میرے گماں سے مجھ کو متفضل ہونا پڑے ایسا نہ کرنا۔ خدا نہ کہے کہ میں تجھ کو بے وفا کہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میرا گمان تو تجھ کو بے وفا کہتا ہے اور میں وفا دار کہہ رہا ہوں۔ ایسا نہ کرنا کہ مجھ کو اپنے گماں سے شرمندہ ہونا پڑے۔ یعنی بے وفائی نہ کرنا کہ خدا نخواستہ مجھ کو بھی بے وفا کہنے کی ضرورت واقع ہو۔

تو مہربان ہو کے بدلو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
 فرماتے ہیں بختری سی بخشش کے بعد تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ہمیشہ کیلئے تم سے روٹھ بیٹھا ہوں نہیں
 یہ بات نہیں ہے۔ مہربان ہو جس وقت چاہو مجھ کو بدلو۔ میں گزرا ہوا وقت نہیں ہوں کہ پھر
 دوبارہ نہ آ سکوں۔

ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ نہ تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
 فرماتے ہیں ضعف کی حالت میں طعنہ اغیار کا شکوہ دینے ہوئے تم کیوں ڈرتے ہو۔ بات
 کی برداشت نہجو کو ضعف کی حالت میں یہی ہے تمہاری بات کچھ میرا سر نہیں ہے کہ جس کو میں ضعف
 کی وجہ سے نہیں اٹھا سکتا۔

زہر ہلتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں
 جب کہتے ہیں کہ اس کو فداں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہی جوتے ہیں کہ اس کو اس
 کام کے کرنے سے انکار ہے پس عاشق مشوق کے ملنے کی قسم کو بکر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر
 کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھانا سکوں مگر جو کچھ وہ لٹا نہیں اس لئے نہیں کھا سکتا
 (از یادگار غالب)

ان ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھپرے نیکے رکھ کر غدر پرستی ایک دن
 فرماتے ہیں۔ شرابخواری کے وقت کسی دن ہم سے بے تعلق ہو جاؤ۔ اگر ایسا نہ کر دے تو
 ہم تمہیں کسی دن چھپرے لگے۔

غزوة اوج بٹائے عالم امکاں نہ ہو اس بلندی کے نصیب نہیں ہے پستی ایک دن
 فرماتے ہیں۔ اس دنیا کی ترقی کے اس قدر ذریعہ نہ ہو۔ اس بلندی کی قسمت میں پستی
 بھی ہوئی ہے یعنی ایک دن قیامت آتی ہے۔

قرض کی پتہ تھے لیکن سمجھتے تھے کہاں رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن
 میرزا صاحب کے اس شعر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ مشہور سے پہلے میرزا صاحب

پر کسی دوکاندار نے قیمت شراب کی بابت ناش وائر کر دی تھی۔ مقدمہ مفتی صد الدین خاں صاحب
صد الصد کی عدالت میں پیش ہوا۔ جواب عوے میں میرا صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر دیا۔
مفتی صاحب نے مدعی کو روپیہ اپنے پاس سے دیدیا اور میرا صاحب کو عدالت سے رخصت کر دیا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی لے دل غنیمت جانئے بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن
فراتے ہیں نغمہ شادی اور نغمہ غم دنیا میں تو ام ہیں کبھی غم ہے تو کبھی شادی اور ساز ہستی
کی یہ دونوں صدائیں ہیں۔ ساز ہستی کے مٹ جانے سے پہلے دونوں کو غنیمت سمجھنا چاہئے
مطلب یہ ہے کہ غم کے بعد شادی لازمی ہے۔

دھول دھپا اس سر پر باز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشہ سی ایک دن
فراتے ہیں۔ اس بے تکلفی کہ مذاق میں پہل ہماری طرف سے ہوئی تھی۔

ہم پر چھائے ترک و فنا کا گماں نہیں ایک چھیرے دگر نہ مراد امتحاں نہیں
فراتے ہیں ہم پر اُن کو یہ گمان نہیں ہے کہ جتنا سے ڈر و فنا ترک کر دیں گے۔ ان کی خجائیں صرف
ہمیں چھیرنے کی غرض سے ہیں۔ ان سے امتحان و فنا مراد نہیں ہے۔

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا پرسش ہے اور پائے سخن ریاں نہیں
فراتے ہیں۔ اسکی نگاہ لطف کا کس منہ سے شکر کیجئے یعنی نگاہ لطف پرسش حال تو کرتی
ہے مگر زبان سے میرا حال نہیں پوچھا جاتا۔

ہم کو ستم عزیزہ۔ شکر کو ہم عزیزہ نامہ ریاں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
فراتے ہیں ہم کو شکر اس لئے عزیز ہے کہ اس کا ستم قوت برداشت کے موافق ہوتا
ہے۔ ابنا ظلم وہ نہیں کہنا کہ جس کا ہم ماں بلب ہو جائیں یا اپنی جان سے گزر جائیں۔ اس ستم کو ہم کہتے
ہیں کہ ہم بھی اس شکر کو عزیز ہیں۔ اگر عزیز نہ ہوتے تو ستم سے وہ ہماری جان لے لیتا۔ اس بیان سے
یہ ثابت ہو گیا کہ وہ یعنی شکر اگر ہم پر مہربان نہیں ہے تو نامہ ریاں بھی نہیں ہے۔

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی آخر زباں تو رکھتے ہو تم گروہاں نہیں

فرماتے ہیں، اگر بوسہ دہن دینے میں تم کو یہ عذر ہے کہ میرا دہن معدوم ہے میں بوسہ کیونکر
دوں تو نہ دو میں تمہارے اس عذر کو تسلیم کرتا ہوں لیکن گالی تو مجھے دو۔ اس لئے کہ زمین تو تم
رکھتے ہو گالی دینے میں کیوں عذر دیتے ہو۔ ہے یہ مثل کہ بھول نہیں بچھڑی سی۔

قطع

ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے ہر چند پشت گرمی تاب تو انہیں
باوجودیکہ اس کا قہر و عتاب میری جان کو گھٹا رہا ہے اور باوجود اس کے کہ تاب و وقت
نے مجھ کو جواب دے دیا ہے۔

جاں مطرب ترانہ دل من مزید ہے لب پر وہ سنج زمزمہ الاماں نہیں
فرماتے ہیں۔ اس پر بھی میری جان زار ہی تقاضے کر رہی ہے کہ اگر کوئی ظلم و ستم
باقی رہ گیا ہو تو اس کو بھی کام میں لے آنا چاہئے۔ میں تو اب بھی یعنی اس صورت میں بھی
امان کا خواہشمند نہیں ہوں۔

خجیر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو و نیم دل میں چھری چھوثرہ گرنچکاں نہیں
فرماتے ہیں۔ اگر دل و نیم نہ ہو تو خجیر سے دل کو دو ٹکڑے کر دے اور اگر مرگان خوشکلاں
نہ ہو تو عشق کی چھری سے دل کو زخمی کر دے تاکہ مرگان خوشکلاں ہو جائے اور یہ دونوں
عاشق کو حاصل ہو جائیں۔

ہے ننگ سینہ دل اگر آتشکدہ ہو ہے عابد نفس اگر آذر فشاں نہیں
فرماتے ہیں وہ سینہ ہی کیا ہے جس سینہ میں دل سوزاں نہ ہو اور وہ دل ہی کیا ہے جسکا
نفس آتش فشاں نہ ہو۔

نقصاں نہیں جنوں بلا سے ہو گھر خراب سو گز زمین کے بدلے بیا بیاں گراں نہیں
فرماتے ہیں جنوں نقصان دینے والی چیز نہیں ہے اگر گھر مت نکل جانے کے بعد گھر خراب
ہو جائیگا تو بلا سے ہو جائے مگر مٹی یا دہ سے زیادہ سو گز زمین ہوگی۔ اس سو گز زمین کے بدلے تانا

بڑا جنگل ہاتھ آتا ہے یہ کیا منگا ہے عالم وحشت میں سرسبز اٹکل جانا چاہئے۔
 کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سر نوشت میں گویا جہیں پہ سجدہ بت کا نشان نہیں
 فرماتے ہیں کیا سوال کرتے ہو کہ تیرا نوشتہ تقدیر کیا ہے۔ اس سوال سے تو یہ پایا گیا
 گویا میری جہیں پہ سجدہ بت کا نشان نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ میرے ماتھے پر سجدہ بت
 کا گنگ نظر آ رہا ہے اور یہی میرا نوشتہ قسمت ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں
 یہاں ہم زبان کے نقطہ میں ابہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی
 زبان ایک نہیں ہوتی اور پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے جیسی
 روح القدس کی نہیں (از یادگار غالب)

جہاں ہے بیادِ بوسہ دے کیوں کچھ ابھی غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں
 فرماتے ہیں یہ بات تو سلسلہ ہے کہ بوسہ کی قیمت جان ہے لیکن وہ ابھی اس بات کو
 کیوں ظاہر کر رہا ہے گا وہ تو ابھی تک غالب کو یہی جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے
 کہ جس وقت وہ یہ سمجھ لیا کہ غالب نیم جاں ہو گیا اس وقت بوسہ کی قیمت میں جان طلب کر گیا کہ
 غالب جان دیکر بوسہ نہ خرید سکے

مانع و رشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں بنجیر نہیں
 اسی مطلب کو جو پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے مصرع میں نئے رنگ سے
 کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ رشت نوردی کے مانع کوئی تدبیر نہ ہوتی۔ اس کو اس طرح
 ادا کرنا کہ پاؤں میں پڑے گزر بنجیر نہیں۔ کمال بلاغت ہے۔

شوق اس رشت میں ڈٹے ہو چھو کہ جہاں جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں
 فرماتے ہیں۔ شوق عرفان مجھ کو اس دیرانہ کی طرف کھینچ کر لے چلا ہے جہاں جادہ یعنی ثبوت
 نگاہ دیدہ تصویر کی طرح معدوم ہے۔ گویا اس رستہ پر قدم رکھ کر ہر شخص کو حیرانی پیدا ہو جاتی ہے

مطلب یہ ہے کہ لذت الہی کی شہزادی کیسی کنسن ہے کہ جہاں نشان سراپا حیرت بن جاتا ہے۔
 سر پہ لذت آزار بھی جاتی ہے جادو راہِ وفا جز دم شمشیر نہیں
 جادوہیقی میاں کرم شمشیر سے تنبیہ دی ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف
 میں جو لذت سجدہ ہی تو یہی جانتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں مگر چونکہ وفا
 کی راہ میں ستر لاکھ دھار ہرے اسٹے بیٹھے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے پس انوس ہے کہ لذت آزار
 کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے رشتہ دگا رہا غالب

رنگِ نو صیدیٰ حسبِ دید گوارا رہو خوش ہوں گزند زبونی کیش تا شیریں
 فرماتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نامیدی کا رنج ٹھکوار رہے یعنی میں اس بات سے بہت
 خوش ہوں اگر میرزا صاحب کا منت پذیر نہیں ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرزا صاحب بلکہ ایک
 دانا امید کی فریادوں سے کامیابی حاصل ہونے میں ذلت اور ہنگ بھگتے ہیں اور یہی
 کامیابی کے ستارے ہیں بے ختم دردست ہونے پر محفوظ ہونے میں۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے لذت سنگ باندازہ تقریر نہیں
 ذرا سے ہیں زخم سر جس دلت اچھا ہو جاتا ہے پھر سر میں کبھی ہونی شروع ہو جاتی ہے
 پھر کھانے کا مزا احاطہ تقریر سے باہر ہے۔ لہذا اس شعر میں یہ ہے کہ ہمیشہ اندامی زخم کے بعد
 زخم میں کبھی ہوتی ہے۔ اس کو میرزا صاحب نے دوبارہ زخم کھانے کے شوق سے تعبیر کیا ہے۔

جب کرمِ بخشیتِ میاں کی دستاخی ہے کوئی تفسیر بجز خجلیتِ تقصیر نہیں
 فرماتے ہیں جب دوست کی عنایت گستاخی و بیباکی کی اجازت دے تو اس وقت
 از کبابِ گناہ میں جھپکنے سے زیادہ کوئی گناہ نہیں۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
 اس قطع کا نسخہ ثانی ناسخ کی تصنیف ہے۔ میرزا صاحب نے اس پر مصرع لگا کر
 اتفاق رائے ظاہر کیا ہے۔

مست مردک یہ ہیں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں
 فرماتے ہیں۔ آنکھ کی تپ میں یہ نگاہیں نہ سمجھو یعنی نگاہیں نہیں ہیں بلکہ نگاہوں کی جگہ دل چشم
 میں ایسی آنکھ کے بیچ میں آہیں جمع ہو گئی ہیں سویدائے اس سیاہ نقطہ کا نام ہے جو دل پر ایک غزال
 کی صورت میں ہوتا ہے یہ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میری آنکھ کے تل میں یہ نگاہیں نہیں ہیں بلکہ دل چشم
 میں آہیں ہیں یعنی میری آنکھیں اور نگاہیں دونوں حسرت آلود ہیں۔

برنگال ویدہ عاشق ہے دیکھا چاہئے کھل گئی مانند گل سو جاے دیوارِ حرمین
 فرماتے ہیں۔ ویدہ عاشق کی ہر بات دیکھنے کے قابل ہے پھول کی طرح سے دیوارِ حرمین کھل گئی
 (خون ہو گئی) جب دیوارِ حرم پھولوں کی طرح سے کھل ہے تو کثرتِ غنچہ و گل گریہ عاشق کے اثر سے
 دیکھا چاہئے کہ کس مدت تک پسینہ ہے۔

الفت گل سے غلط ہے و غولے واری سحرے باوصف آزادی گرفتارِ حرمین
 فرماتے ہیں۔ کیا ہی کوئی آزاد و ارستہ مزاج ہو۔ دنیا میں تو کر عیش و محبت کے پھندے سے
 نہیں نکل سکتا اور اسکی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ سر و آزاد باوصف آزادی گرفتارِ حرمین ہے (ایک
 قسم کا سر دھوتا ہے جسکو سر و آزاد کہتے ہیں)

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجرِ بید نہیں
 فرماتے ہیں۔ عاشقی تاثیر سے ناامید نہیں ہے جاں بازی بید کا درخت نہیں جو غم سے
 محروم رہے مطلب یہ ہے کہ عشق اگر صادق ہے تو اثر سے محروم رہ نہیں سکتا۔

سلطنت دست بدست آتی ہے جامِ مے قائم جمشید نہیں
 فرماتے ہیں سلطنت تو چلتی پھرتی چھاؤں کا حکم رکھتی ہے۔ ایک خاندان سے دوسرے
 خاندان میں منتقل ہو جاتی ہے جمشید سے ہاتھوں ہاتھ رندوں تک پہنچ گئی ہے۔ وہ گویا جامِ مے کی طرح
 ایک سے دوسرے کو پہنچتی ہے۔ قائم جمشید نہیں کہ جو دوسرے کے پاس آ ہی نہیں سکتی مطلب یہ ہے
 کہ جمشید کے پاس جامِ جم تھا جس میں شراب پی جاتی تھی۔ اسکے مستی رندوں کے سوا اور لوگ نہیں

قرار پائے۔

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پر تو خورشید نہیں
اس شرمیں۔ میرزا صاحب اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر عرض کرتے ہیں کہ تیری تجلی وجود عالم کا
سبب ہے جس طرح آفتاب کا طلوع باعثِ ظہور ذرات ہے۔

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں
بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں۔ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قیامت ہو۔ یہاں
پوشیدہ قیامت مراد ہے۔ اگر مرجانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے
(از یادگار غالب)

گردشِ رنگِ طرب سے ڈسے غمِ محرومیِ حیا وید نہیں
فرماتے ہیں۔ رنگِ طرب سے منتقب ہو جانے کا خون ہے ورنہ محرومیِ حیا وید کا غم نہیں ہے
مطلب یہ ہے کہ جب انسان زمانہ اقبال مندی کے بعد کسی سبب سے غم سے بے زر ہو جاتا ہے تو اس کو
بسیبِ محنت آدمیوں کے زیادہ صدمہ اور۔ بچ بچتا ہے۔ اگر انسان اول ہی سے محنت ہوتا تو
تو اس کو بے زری کا اتنا صدمہ نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں
یہ شعر سہل فہم ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعرا کا نہ مشکل ہے زیادہ دگر غالب
مطلب یہ ہے کہ امید شرطِ زندگی ہے اور جب کوئی امید نہیں، تو زندگی سے ناامید ہونا ہی لازمی ہے۔
جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں! خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
فرماتے ہیں جس جگہ زمین پر ہم تیرے نقش قدم کو دیکھ لیتے ہیں ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
گویا ہشتوں کا سامنا ہو گیا۔

دلِ آشفٹ کاں خالی گنجِ دہن کے سو یہ ایں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
شہزادِ دہن دگر معشوق کو عدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ جو لوگ دہن بے نشان پر

لائی

ماشت جو گئے میں اپنے سویدائے دل میں عدم کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔
 ترے سرو قیامت سے اک قبر آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
 اس کے ایک حسنی تو یہی ہیں کہ سرو قیامت سے فتنہ قیامت کتر ہے اور دوسرے حسنی یہی ہیں
 کہ تیرا قیامت میں سے بنایا گیا ہے۔ اسلئے وہ ایک قبر آدم کم ہو گیا ہے (از یادگار غالب)
 تماشا کہ اسے محو آئینہ داری تجھے کس متن سے ہم دیکھتے ہیں
 فرماتے ہیں۔ اسے محو آئینہ داری تو ذرا یہ تماشا تو دیکھ کہ ہم مجھ کو کس رزد کے ساتھ دیکھ رہے ہیں
 یہ خطاب معشوق کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو آئینہ دیکھنے میں ایسا محو ہو گیا ہے کہ ہماری تمنا سے
 دیکھنے کا بھی تماشا نہیں دیکھتا۔

سراغِ نفثِ نالہ دایعِ دل ہے کہ شبر و کافقش قدم دیکھتے ہیں
 اس شعر میں میرزا صاحب نالہ کشی کے وقت کورات کا وقت قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے
 نالے کو شبر و لکھا ہے۔ فرماتے ہیں جس طرح رات کے آنے جانے والوں کا نفث قدم صبح کو دیکھ کر
 پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں سمت سے کوئی شخص آیا اور فلاں سمت کو چلا گیا۔ اسی طرح دایعِ دل
 سے نالہ شب کی گرمی دسوز کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بناکر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشا ہے اہل کرم دیکھتے ہیں
 فرماتے ہیں۔ اے غالب ہم فقیروں کا بھیس بدل کر اہل کرم کی خصوصیت کا
 امتحان لیتے ہیں کچھ خدا خواستہ ہم کو احتیاج سوال نہیں ہے۔

ملتی ہے خوشے یار سے نارِ التہاب میں کافروں گرنہ ملتی ہو راحتِ عذاب میں غل
 فرماتے ہیں آگ اپنی گرمی کی وجہ سے یار کی عادت سے ملنے لگی ہے۔ یعنی بات بات
 پر چلانا غصہ سے آگ بھبھو کا بنجانا یہ خاص میرے معشوق کی عادت ہے اور آگ میں بھی یہ
 خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اسلئے عذابِ نار میرے واسطے لذتِ وہ ثابت ہوا ہے۔

کسے ہوں کیا تباؤں جہاںِ خراب میں شہائے ہجر کو بھی رکھوں حساب میں

فرماتے ہیں۔ میں اپنی عمر کا ٹھیک اندازہ نہیں بنا سکتا۔ بہت سی جہر کی راتیں ایسی بسر چکا ہوں
جہ میں کی ایک ایک رات ہزار ہزار برس کے برابر تھی اگر ان سب راتوں کو شمار میں لاؤں اور
ان کا حساب لگاؤں تو اتنے برس سے جی رہا ہوں کہ وہ گنتی ہی میں نہیں آسکتے

تایمزہ آئرلینڈ میں منید آئے عمر کھبر آئے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں
فرماتے ہیں دل بہ نظر میں یہ سمجھ کر کہ اب وہ نہ ٹھیکے۔ بد قسمتی سے ہماری آنکھ لگ گئی
تھی۔ وہ خواب میں تشریف لائے اور اپنے وعدہ پر آنے کا وعدہ کر گئے۔ یعنی یہ کہہ گئے کہ تو ہمارا منتظر
ہم ضرور آئیں گے اور یہ وعدہ سننے والے انہوں نے کیا کہ ہم کو زندگی بھر پھر دوبارہ زندہ نہ رہے۔
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ کر کھولے میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے یعنی وہ کچھ
نہیں لکھیں گے اسلئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں (از یادگار غالب)

مجھ تک کب آنی بزم میں آتا تھا دور جاں ساقی نے کچھ مل نہ دیا جو شراب میں
اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے (بہر آج جو خواب عادت جام کی فوجت بچ
تک پہنچی ہے) اس محذوف نے شعر کا رعبہت بند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور
جو الفاظ محذوف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہیں محضات شعر
میں شمار کیا جاتا ہے (از یادگار غالب)

جو منکر و ناپا ہو فریب اس یہ کیا چلے کیوں بگمان دل دوست کے دشمن کے باب میں
فرماتے ہیں۔ جو شخص وفا کے وجود ہی سے منکر ہو اس پر فریب و ناپا کیونکر چل سکتا ہے یہ
کیوں دوست سے بدگمان ہوں دشمن کے باب میں مطلب شرکا یہ ہے کہ میرا دوست منکر و ناپا
ہے اس پر بغیر کا فریب و ناپا نہیں چل سکتا میں دشمن کے باب میں دوست سے کیوں بدگمان ہوں
کہ یہ فریب و ناپا دشمن میں مبتلا ہو گیا ہے۔

میں مضطرب ہوں وصل میں حق بن فریب کے ڈالا ہے تم کو دہم نے کس بیچ و تاب میں

فرماتے ہیں۔ میں تو صل میں اس وجہ سے مستطرب ہوں کہ میں تہا را دوسرا ملنے والا یعنی میرا قیب نہ آجائے۔ تم کو شاید اس مہم کی وجہ سے سچ دتا ہے کہ اس کا کئی دوسرا معشوق میرے علاوہ ہے اور یہ اس سے چھپ کر میرے پاس آیا ہے اس لئے گھرایا ہوا ہے۔
 میں اور خط وصل خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 خطا وصل وہ خط جس میں وصل کا وعدہ تحریر ہو۔ فرماتے ہیں۔ سیری قسمت کہ وہ مجھے خط
 میں وصل کا وعدہ لکھ کر بھیجے۔ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے سیری بات بنادی۔ اس خط پر مجھے جان
 قربان کر دینی چاہئے۔ یہ بات میں جوش خوشی میں بھول گیا۔

سہ تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک کن پری ہوئی طرف نقاب میں
 فرماتے ہیں۔ نقاب کے اندر بھی غصہ سے اسکی تیوری چڑھی ہوئی ہے اور اس کا غصہ میں غضب کا
 ہے کہ اس غصہ کا اثر نقاب پر بھی ہو گیا ہے یعنی تیوری کے مقام پر نقاب میں شکن واقع ہو گئی ہے۔
 لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
 یہاں لگاؤ سے مراد لگاؤٹ ہے۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اسکا
 اسفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاؤ میں ایک طرف اور
 ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگھار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک
 طرف۔ یہ شعر بھی سہل متنب ہے۔ اگر اتفاقاً کی طرف دیکھے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم تپ مصرعے
 ہم پہنچ گئے جس میں حسن ترجیح کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرعہ
 میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے
 معشوق کی لگاؤٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور اس کا آنکھ چڑا بول لگاؤٹ کی ضد ہے
 وہ عاشق کی نظر میں لگاؤٹ سے بہت زیادہ دلفریب اور دل آویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگھار
 معشوق کا حسن بیشک دو بانہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا غصہ میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ
 خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور ادبی باتیں ہیں جو ہم لکھ

رہتے ہیں، اسکی اصل خوبی و عبادانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک روز مولانا آزاد مدظلہ کے رو بہ کسی نے یہ شعر شہ جاہ چونکہ مولانا نہایت صاف اور سیرتِ بھنگہ اشعار کو پسند کرتے تھے اس لئے میرزا کا کلام سن کر انثر تہتے تھے وہ ان کی طرز کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ مگر اس روز میں شعر کو سُروہد کرنے لگے اور تعجب کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے کہا گیا کہ میرزا غالب کا چونکہ وہ میرزا کے شعر کی ہی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس روز لا علی میں میا ختمہ اُن کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے جیسی کہ اُن کی عادت تھی فرمایا اس میں میرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہمارے طرز کا شعر ہے مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی سننا و لفظا و بیا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ میرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ سلوب بیکار آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا (از یار کار غالب)

وہ نالہ دل میں حس کی برابر جگہ نہ پاتے جن نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
فرماتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے وہ نالہ دل معشوق میں ایک پیاس کے برابر بھی جگہ نہیں پاتا جس نالہ سے آفتاب میں وراثہ آجاتی ہے۔

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو شراب میں
فرماتے ہیں۔ وہ جادو مدعا طلبی میں معشوق کے دل میں نہ کام نہیں دیتا جس جادو کے کشتی شراب میں رواں ہو جاتی ہے۔ (شراب اپنی پکنے والاریٹ کا دریا جس پر دور سے پانی کا دھوکا ہو کر تہاڑا)
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روزا بر و شب را ہتاب میں
سننا جاتا ہے کہ شراب ابر و ماراں کے دن یا شب را ہتاب میں زیادہ لطف دیتی ہے میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ شراب چھوڑ دینے کے بعد بھی ان دنوں موقعوں پر یعنی ابر کے دن اور چاندنی رات میں بے پئے مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

کل کیلئے کر آج نہ خست شراب میں یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
فرماتے ہیں۔ کل یعنی فردائے قیامت کے لئے آج شراب دینے میں خست نہ کر (مشہور ہے کہ جو بڑا

میں شراب پئے گا وہ آخرت میں شراب طور ہی سے محروم رہے گا (یہ سمجھنا کہ ساقی کو شراب طور سے نہ دینگے یہ بات ساقی کو شرکی قیاضی پر موقوف ہے نہیں یا نہیں چن سکتا یعنی دہاں بھی ضرور ملے گی۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ جوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی ایک نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خوریزی کرے۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں اور پھر آدم سے ان کو زک و لوائی اور حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں۔ کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔ (از یادگار غالب)

جاں کیوں بھلنے لگتی ہے تن سے دم سماع گروہ صدا سماعی ہے چنگ و باب میں

فرماتے ہیں۔ گانا سن کر جان کیوں ہم سے بھلنے لگتی ہے یعنی ایسی حالت کیوں طاری ہو جاتی ہے کہ جو ترپا دیتی ہے۔ اگر وہ صدا یعنی شادی کی آواز چنگ و باب میں سماعی ہوئی ہے تو اس سے جان بخشی کا فعل کیوں نہیں سرزد ہوتا۔

رو میں ہے خوش عمر کہاں دیکھئے تھے نے ہاتھ باگ پر ہے۔ پاسے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے اقتدار سے باہر ہونا چاہک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینی حسن تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے (از یادگار غالب)

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُد ہے جتنا کہ دہم غم سے چوچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوے اللہ مراد ہے جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے اسلئے کہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجود ماسوا کے دہم سے راندن چوچ و تاب

میں بتا ہوں اُتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب سے بعد ہے۔ (اذا یاد کا زمانہ جب
 نسل شود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہونے مشاہدہ ہے کس سے یہ
 سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو مشہود کہتے ہیں۔ مثلاً ہمارے معنی
 ہیں دیکھنے والے کے اور مشہود اس کو کہتے ہیں جس کو دیکھا جائے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں مشہود و
 شاہد و مشہود کی اصل ایک ہی ہے نیز کو حیرت ہے کہ جب یہ تینوں چیزیں ایک ہیں تو شاہد و شاہد
 صاحب میں داخل ہے۔

ہے شغل نمود و صورت پر وجود کبریا یاں کیا و حیرا ہے قطرة دولت و حجاب میں
 و صورت وجود اور کثرت مہیوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حجاب کے یہی وجہ ہونے کو ایک
 عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ یہاں کیا و حیرا ہے غمناک ہے (اذا یاد کا زمانہ غالب)
 شرم اک و آواز ہے اپنے ہی سے سہی میں کہتے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
 فرماتے ہیں۔ شرم اک و آواز مشوقانہ ہے اگر اپنی ذات سے بھی بہت تو بھی میں وادائے
 مشوقانہ ہی کہا جائیگا۔ لیکن اس کا ہستمال ہمیشہ بے حجابی کے موقع پر جو گھائیسی حجاب کی حالت میں
 ادا ہے ناز برقی نہیں جاسکتی اور جس حالت میں اس کا استعمال روادار کھائیسی ہے تو وہ حجاب عین
 بے حجابی ہے۔ یہ شعر بھی تصوف میں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یہ حجاب جو نظر آتے ہیں
 ایسے ہیں کہ جن سے جلوہ یا نظر آتا ہے۔

آرائش جمال سے فایغ نسیم منور پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
 نقاب، ستارہ ہے حجاب قدس کا امد آئینہ اس میں علم مایکون و ماکان کا حکم رکھتا
 ہے اور آرائش جمال سے فایغ جو نا تفسیر ہے کل دیون جونی شان کی۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم مشہود میں خواب میں منور جو چمکے ہیں خواب میں
 سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو مشہود کہتے ہیں اور غیب غیب کے
 مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصیرت سے ورا و الورا ہے۔ کہنا ہے جس کو

ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ حقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہماری
ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے
مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون
کے لئے مثال نہیں ہو سکتی (از یادگار غالب)

غالب ندیم دوست سے آتی ہے دوست
فرماتے ہیں۔ اے غالب ندیم دوست سے دوست کی بویا کرتی ہے اس لئے میں

حضرت علی اکرم اللہ وجہ کی محبت کو عبادت تصور کرتا ہوں۔
حیراں ہوں لکڑیوں کے پیٹوں پر گریں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں فوج گر کو میں
فرماتے ہیں۔ در عزیز مرنے والوں کا ماتم دار اگر ایک شخص ہو تو مرنے والوں کی کشتی ہے ان
کے اعزاء میں فرق آتا ہے۔ اس لئے اگر کھجور مقدور ہو تو ایک فوج گراہے ساتھ رکھوں یعنی ہائے
کھمر میں روتا ہوں اور ہائے جگر کہہ کر وہ پیتا ہے یا ایک کامرشیہ میں پڑھوں اور
ایک کا زحہ وہ۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لو ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
فرماتے ہیں۔ رشک نے مجھ کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ کسی غیر سے تیرے مکان کا پتہ دریافت
کر سکوں اور پتہ نہ ملنے سے اس قدر اضطراب قلق بڑھ گیا ہے کہ بغیر دریافت کئے رہ نہیں سکتا
اس لئے ہر راگمیر سے دریافت کرتا جا رہا ہوں کہ میں کدھر جاؤں۔ ممکن ہے کہ کوئی مجھ جیسا تیرا طالب
محقق مل جائے اور وہ تیرے مکان سے بھی واقف ہو اور میرا ہم سفر بھی بن جائے۔

جانا پڑا قریب کے درمید ہزار بار لے کاش جانتا نہ تیری رنگہ ز کو میں
فرماتے ہیں۔ تیرا رستہ قریب کے گھر کے آگے سے ہو کر ہے۔ اس لئے مجھ کو ہزار ہزار مرتبہ قریب
کے دروازہ پر جو کرتیری تلاش میں گزرتا پڑتا ہے۔ کاش میں تیرے گھر کے رستہ سے واقف نہ ہوتا۔
بے کیا جو کس کے باندھی ہے میری بلانے کیا جانتا نہیں میں تمہاری کمر کو میں

فرماتے ہیں ہم نے جو میرے والدہ قتل پر کمر کسی ہے اور یہ کہلڑا رہے ہو کہ اب میں تجھے قتل کرتا ہوں۔ اس دسکلی سے میری جا ڈرتی ہے کیا میں تمہاری لڑکھو جانتا نہیں کہ اس نے درخت پر نہ اترے گا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے تنگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں فرماتے ہیں۔ لو اور سنو میں نے جن کے خوش کرنے کی غرض سے پنا تمام مال و درختا دیا اب وہ بھی یہ فرماتے ہیں کہ تو بے تنگ و نام ہے ہم تجھ سے نہیں منے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ پہچا تانہیں ہوں ابھی راہبر کو میں طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا دھند سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے لئے صحبت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے و ملہ جڑا۔ اور وہ اس تذبذب اور تزلزل کی ہی ہوتی ہے کہ وہ گمان کو پہچان نہیں سکتا (زیادہ کار غالب)

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوچھا ہوں اس بُت بیدار اگر کو میں اس شعر میں خیال نہایت نازک واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ بے وقوف لوگوں نے میری خواہش یعنی طلب معشوق کو پرستش قرار دے لیا ہے۔ اسی خیال کے عالم میں دریافت فرماتے ہیں کہ کیا میں اس کو پوچھا ہوں۔ خود بدولت کو یہ خبر نہیں ہے کہ اس بیدار کے سامنے جا کر نظام بنیاد پرستش کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

پیر بخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار جانا و گرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں فرماتے ہیں بخودی عشق میں گم ہو کر میں اپنے کو بھول گیا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئے یار میں چکر سپرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے یعنی میں اپنے آپ سے گزر گیا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ میں میں نہیں مئے کوئے یار کے رستہ کو بھی بھول گیا ہوں اب اپنی خبر کو بھی وہیں نہیں جاسکتا۔

اپنے پر کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا سمجھا ہوں دلپذیر متاع مہتر کو میں
 فرماتے ہیں۔ میں سائے زمانہ کو اپنی طرح کا ہنر دوست سمجھ رہا ہوں اور اسی غلطی کی وجہ
 سے متاع مہتر کو دلپذیر سمجھتا ہوں حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی موجودہ زمانہ میں ہنر کو
 لوگوں نے متاع کا ضد سمجھ رکھا ہے۔

غالب خدا کرے کہ سوار سمت بہ ناز دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں
 سمندرِ ناز وہ گھوڑا جو نازِ داد سے زمین پر قدم رکھے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔
 ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دو نہیں
 فرماتے ہیں اس کو میرے نام سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے
 مجھے برا کہنے کی غرض سے بھی میرا نام لیتا ہے تو وہ اس سے خفا ہو جاتا ہے۔ غیر اس بات کا عادی
 ہے کہ ہمیشہ اس سے میری بدگولی کرتا رہتا ہے۔ تعجب نہیں کہ اس وجہ سے دشمن میں اور اس
 میں بگاڑ کی صورت پیدا ہو جائے۔

وعدہ سیرِ گلستان کے خوش طالع شوق مردہ قتلِ مقدر ہے جو مذکور نہیں
 فرماتے ہیں۔ باغ میں سیر کے واسطے میرے ساتھ چلے گا اس نے وعدہ کیا ہے اس وعدہ
 سے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ کو قتل کرے گا۔ میرے یہ نصیب کہاں کہ میں اس کے ہمراہ جا کر تماشائے لالہ
 دیکھ دوں دیکھوں مطلب شعر کا یہ ہے کہ وہ پھولوں کو قند کی نگاہوں سے دیکھے گا اور ان کو قریب
 سمجھ کر رشک سے قتل ہو جاؤں گا۔

شاہِ بہستی مطلق کی کسر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر مہرِ منظور نہیں
 فرماتے ہیں بہستی کے ساتھ عالم کو اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کہ مرشدِ شوق کے ساتھ۔
 گویا ہے اور نہیں ہے ہم کو یہ بات بھی منظور نہیں ہے کہ عالم بہستی کے ساتھ کیرا کی طرح بھی
 منسوب کیا جائے مطلب یہ ہے کہ عالم کی بہستی برائے نام بھی نہیں ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلیدِ تسک ظرفی منظور نہیں

فراتے ہیں۔ ہم بھی وہ ہی قطرہ ہیں جو دیامیں مل کر دیا بن جاتا ہے یعنی فنا فی لذات جو جائیگا مرتبہ ہم کو بھی حاصل ہے مگر زبان سے ایسا کہنا منصور کی تقلید سمجھا جائیگا اور ہمیں تنگ نظر فی منصور کی تقلید کرنی منظور نہیں ہے۔

حسرت اے ذوقِ شرابی کہ وہ طاقت رہی عشقِ پُربہ کی گوں تن رنجور نہیں
فرماتے ہیں بنگامہ عشق و محبت کی سوزشوں کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہے اور ہمارے
تن رنجور میں تاب و توان باقی نہیں رہی ہے۔ اس لئے ہم حسرت کو مخاطب کر کے اظہارِ حسرت
و یاس کرتے ہیں

ہم جو کہتے ہیں کہ ہم لٹیکے قیامت میں نہیں کس عورت سے کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
مشتوق کی حاضر جوابی نے اس شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں میں نے جو
اس سے یہ کہا کہ تم یہاں تو ہم سے نفرت کرتے ہو اور دور دور رہتے ہو۔ ہم قیامت کے دن اللہ
تعالیٰ سے تم کو مانگ لیں گے۔ یہ سکرِ نہایت غرور کے ساتھ اُس شوخ نے ہم سے یہ کہہ دیا کہ
ہم حور نہیں ہیں جو تم کو مل جائیں گے۔

ظلم کر ظلم اگر لطف در بیخ آتا ہے تو تغافل میں کسی رنگ سے معذوریں
فرماتے ہیں اگر تو مجھ کو لطف کے قابل نہیں سمجھتا تو میں تاکہ سے کہتا ہوں کہ مجھ پر ظلم کر ظلم
تغافل تو اُس حالت میں زیادہ تھا کہ جب تو ظلم کرنے سے معذور ہوتا۔

صاف دردی کش پیانہ جہم میں ہم لوگ وائے وہ بادہ جوافشردہ انگور نہیں
فرماتے ہیں یہ بات تقلیدِ جہم کے ظلمات ہے کہ اونٹنے درجہ کی شراب پی جائے وہ شراب
پنصیب ہے جو انگور سے نہ ہو یعنی شرابِ ناب جو ہم لوگ ایسی کم تر تہ شراب کو منہ بھی نہیں لگاتے۔
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب میرے دعوے پر یہ حجت ہے کہ مشہور ہیں

فرماتے ہیں میں ظہوری کے مد مقابل ہوں اور میرا یہ دعویٰ اس دلیل سے ہے کہ وہ
ظہوری تھا اور میں خفاں ہوں یعنی وہ مشہور تھا اور میں مشہور نہیں ہوں اور اس تقابل کا ہونا میرے

دعوے پر دلیل ہے۔

نالہ جز حسن طلب لے ستم ایسا نہیں ہے تقاضائے جفا شکوہ بیدا نہیں ہے
 فرماتے ہیں۔ میرے نالہ شکوہ بیدارے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی میں ظلم و ستم کی شکایت
 میں نالہ کشتی نہیں کرتا ہوں بلکہ حسن طلب ہے تقاضائے جفا کا مطلب یہ ہے کہ تم یوں تو ہم پر ظلم
 و ستم نہیں کرتے مگر ہمارے نالوں سے ننگ آکر تو ہم پر جفا کرو گے۔

عشق و مزدوری عشرت گاہ خیر کیا خوب
 ہم کو تسلیم نکو نام ہے فرما دہیں
 فرماتے ہیں۔ مرتبہ عشق سے یہ بات بعید ہے کہ وہ مزدوری کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھے یعنی
 فرما دے جو کہ بے ستوں کا نام وہ اس غرض سے کاٹا کہ عشرت گاہ حشر داں پتھروں سے تعمیر
 کیا جائیگا۔ یہ ایک مزدور پیشہ کا کام تھا عشق کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے اس
 لئے ہم کو فراد کی نیکنامی میں کلام ہے ہم اس کو دفتر عشاق میں نامزد نہیں کر سکتے۔
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں قسوت معلوم وشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا دہیں
 فرماتے ہیں۔ ویران ہونے میں میرا گھر بھی صحرا سے کم نہ تھا مگر اس میں یہ وسعت کہاں
 تھی جو جنگل میں ہے۔

اہل سبیش کو ہے طوفان حوادث مکتب
 لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں
 فرماتے ہیں۔ اہل نظر کیلئے طوفان حوادث مکتب کا حکم رکھتا ہے۔ موج حوادث کے
 تاجے سیلی استاد سے عبرت کا سبق حاصل کرنے کے لئے کم نہیں۔

وائے محرومی تسلیم و بد حال ونا
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فرما دہیں
 فرماتے ہیں۔ ہم اپنی عادت تسلیم و ناکہ سبب سے نالہ و فریاد کرنے سے مذر کرتے ہیں لیکن
 ہمارا معشوق یہ جانتا ہے کہ ہم کو طاقت فرما دہیں ہے۔ اس سبب سے ہم نے خاموشی اختیار
 کر رکھی ہے۔ انوس ہے کہ ہمارے ضبط کی داو بھٹی ہم کو نہیں ملتی۔

زنگ مکین گل دلالہ پریشاں کیوں ہے
 گر چراغان سیرر مگر برباد نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر گل درلہ چرخان رہگزیہ یاد نہیں ہیں تو ن کارنگ تکلیں اس قدر بے ثبات
کیوں ہے مطلب یہ ہے اگر ہوا کے مقام پر چراغ جلا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ تو وہ جلد بجھ جاتا ہے اور
گل و لہ بھی نابا رہ جاتے ہیں۔ یعنی بھول ایک دو دن سے زیادہ قیام پذیر نہیں ہوتے
سب گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں مژدہ لے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
بد گل وہ نوگری جس میں تھیں بھول تو ڈگریا جن کر جمع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں گل کی نوگری
کے نیچے تلچیں نے بند کیا ہے۔ اسے مرغ رنہ تھکوا مبارک جو کہ گلزار میں صیاد نہیں۔ اگر وہ عالم
ہوتا تو مرغ چمن کو گل سے اتنا قرب حاصل نہ ہوتا۔

دنی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں
فرماتے ہیں۔ نہیں ہے گویا اثبات تراوش کرتی ہے (دنی سے مراد یہاں لفظ نہیں ہے اور اثبات
سے مراد لفظ دل ہے۔ ہاں تائید ہے۔ اس لئے میرزا صاحب نے اثبات کو بھی تائید لکھا ہے)
تراوش کے معنی یہاں ظاہر ہونے کے لئے ہیں۔ دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں مطلب
یہ ہے دہن کو شعرا معدوم لکھتے ہیں اور معشوق کو روزی ازل میں بجائے دہن کے نہیں کا لفظ عطا
ہوتا یعنی ہر بات پر معشوق نہیں کہہ دیتا ہے اور نہیں کہہ دینے سے دہن کا ثبوت ملتا ہے۔
کم نہیں جلوہ گری میں تھے کوچہ سے بہشت یہی نقشہ ہے لے اس قدر آباد نہیں
فرماتے ہیں جلوہ گری میں تیرا کوچہ اور بہشت دونوں کا رتبہ ساوی ہے اس کا بھی
یہی نقشہ ہے یعنی دہاں خدا کا دیدار ہو گا تو یہاں تیرا دیدار ہوتا ہے لیکن دونوں میں صرن
اتما فرق ہے کہ وہ تیرے کوچہ کے مقابلہ میں آباد کم ہے۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت لہذا تم کو بے ہری یاران وطن یاد نہیں
فرماتے ہیں۔ اسے غالب کس منہ سے تم غربت کی شکایت کرتے ہو۔ کیا تم کو بے ہری یاران
وطن یاد نہیں ہے یعنی مسافرت میں اگر کوئی شخص تمہارا پرسان حال نہیں تو وطن میں کون تمہاری
بات پوچھتا تھا۔

دو دنوں جہان لیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
اپنی ذراخ و مسلکی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار ہے یعنی میں جو دونوں جہان لیکر
خاموش ہو رہا ہوں اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہو گیا۔ بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے
سے شرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی (از یادگار غالب)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناحیاں کیا کریں
مقام سے متاثر نہ ہو کر دوسرے مقام پر تیرا پتہ نہ پائیں تو ناحیاں کیا کریں۔
دوچار طلبگار تھک تھک کر بھر بھر گئے تیرا پتہ تو کہیں ملتا ہی نہیں ناچار ہو کر بھر بھر جائیں تو کیا کریں۔
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بیم ہو غم ہی جائیگداز تو غمخوار کیا کریں
فرماتے ہیں۔ اہل بیم شمع کے ہوا خواہ ہیں۔ اس کا جلتے جلتے فنا ہو جاتا کب چاہتے ہیں
اس بیان سے اپنے حال کی تکمیل مراد ہے۔ دوسرے مصرع کا یہ مطلب کہ غم عشق ہی جائیگداز
ہو تو ہائے غمخوار ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔

جو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کا سرگھر عشق کا اس کو گماں ہم بے نیازوں پر نہیں
فرماتے ہیں۔ غیر کی لاف زنی سے وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ یہ شخص مجھ پر عاشق ہے اور اس کے سارے
دعوے سچے اور درست ہیں۔ ہم بے زبان بنی کم سخن ہیں ہماری محبت کا اس کو یقین نہیں ہے۔
قیامت کے لئے لیلے کا دشت تیس میں آنا تعجب ہے وہ بولایوں بھی ہوتا ہے زمانہ میں
فرماتے ہیں۔ کیا قیامت ہے کہ دشت تیس میں لیلیٰ کا بیابان نہ چننا نہ ستر تعجب ہے وہ کہتا ہے
کہ جلا ایسا غضب بھی کہیں زمانہ میں ہوتا ہے کہ محشوق شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر عاشق
کی پیشکش حال کے لئے اس کے مسکن پر پہنچ جائے۔

دل نازک اس کے چم آتا ہے مجھے غالب نہ کر سرگرم اس کا فر کو الفت آزمائے میں
فرماتے ہیں۔ وہ دل کا نازک یعنی بولے دل کا آدمی ہے۔ لے غالب مجھ کو اس پر چم آتا ہے اگر تو
استحسانِ الفت لینے کیلئے آمادہ کر گیا تو کہیں ایسا ہو کہ تیرے جان قربان کر دینے کے بعد اس کا

دل اس صدمہ سے تکلیف اٹھائے ۔

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھتے
بے اپنی بکسی کی تنہا پائی راویاں
فرز تے ہیں کسی پر عاشق ہو کر وہ بھی تنہا پسند ہو گئے بنے اپنی بیسی اور تنہائی کی داد دینا ہی
میں ان بیٹی ہماری بکسی کا صبر ان پر پڑ گیا۔ جو حالت ہماری ان کے عشق میں تھی۔ وہ حالت ان
کی فیر کی محبت میں ہو گئی۔

ہیں نہ دل آنا وہ اجزا آفرینش کے تمام
سوت کو اس کی طے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آوازوں
وہ ہیں۔ رہز بادی سے تشبیہی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے (از یادگار غالب)

یہ ہم جو بحر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بہ کو دیکھتے ہیں
فراتے ہیں۔ بحر میں ہم کو قاصد کا انتہا ہے۔ شاید اس کی طرف سے کوئی حسبِ دلجو ہو گیا
یا ہر بار کا جواب آتا ہے دیوار کو دیکھنے سے یہ مدعا ہے کہ شاید صبا پیغام لیکر آئے تو وہ دیوار پر
آئیگی اور دروازہ کے دیکھنے سے یہ مطلب ہے کہ اگر نامہ بہ جواب لیکر آیا تو وہ دروازہ سے آئیگا۔

وہ آئیں گھر میں مائے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
اپنے گھر میں معشوق کے آنے۔ جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرعے میں اس کی کیا غم
نصویر کھینچی ہے یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا
شخص وارد ہوا (از یادگار غالب)

تظن لگے کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کہوں سے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
زخمِ جگر کی گہرائی اس سے بہتر لفظوں میں راہی نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں۔ لوگ حیرت سے
میرے زخمِ جگر کی گہرائی دیکھ رہے ہیں اور مجھ کو یہ خون ہے کہیں اس کے دست و بازو کو نظر نہ پڑا
بے مثل شعر کہا ہے ۔

ترے جو ہر طرف نگاہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالبِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہم اُن جاہرات کو کیا دیکھیں جو تیری ٹوپی پر ٹکے ہوئے ہیں۔ ہم تو لعل و گوہر کے
نقیبے کی بلندی کو دیکھتے ہیں کہ ان سنگریزوں اور پانی کے قطروں کو خوش نصیبی سے یہ راج
حاصل ہو گیا ہے۔

غزل نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
فرماتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھ کو قیامت کا یا اس کے آنے کا اعتقاد نہ ہو لیکن ضرور
کہوں گا کہ اس کی مصیبتیں شبِ فراق کی تکلیفوں سے زیادہ نہ ہوں گی۔

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے بلا سے آج اگر دن کو ابرو باد نہیں
چاندنی راتیں اور برسات کی گھٹائیں شرابِ خوار کے واسطے لطف افزا باتیں ہیں فرماتے ہیں
اگر آج دن کو اودی اودی گھٹائیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں نہیں ہیں تو ہوں شبِ ماہ تو ہے
ہم رات کو چاندنی میں بیٹھ کر شراب نہیں گئے۔

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرجھانے لگیں جو جاؤں اُن سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
میرزا صاحب اس شعر میں مشق کی بے انتہائی اور کم توجہ کی شکایت فرماتے ہیں مطلب
یہ ہے کہ ان کی ملاقات کو جاتا ہوں تو وہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے اور خلعت ہوتا ہوں تو خیر باد
نہیں کہتے دونوں موقعوں پر بے پروائی برتتے ہیں۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں لے کتے ہیں کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
فرماتے ہیں۔ اگر کبھی کسی وقت میرا خیال ان کو آ جاتا ہے تو اہل بزم سے مخاطب ہو کر یہ کہتے
ہیں کہ آج ہماری محفل میں کچھ فتنہ و فساد نہیں ہے۔ یعنی حضرت غالب تشریف نہیں لائے جو
بات بات پر رشک کی بدولت اہل بزم سے اٹکے اور اُچھٹے تھے۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی تشراب گدائے کوچہ میں نہاتا نامراد نہیں
عید کے دن محتاج و مساکین کو خیرات زیادہ دی جاتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ دی
جاتی ہو رہتے ہیں میخانہ میں عید کے دن کی کچھ قید نہیں ہے۔ پیربغاں کا فیض روز جاری رہتا ہے

جہاں میں ہو غم و شادی ہم ہمیں کیا کام دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
پٹے دنیا کا تو عدد بتائے ہیں کہ دنیا میں غم و شادی تو ام ہو کرتے ہیں یعنی کبھی غم ہے تو کبھی شادی
ہے اور پھر اس بیان پر حسرت ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو تو خدا نے وہ دل دیا ہے جو کبھی شادی
ہی نہیں ہوتا یہی جاسے لئے تو دنیا میں غم ہی غم ہے۔

تم ان کے وعدہ کا ذکر ان کے کمرے غالب یہ کیا کہ تم کو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں
اس نوحہ کا لطف و جدائی ہے بیان میں نہیں آ سکتا۔ سوچتے یہ چاہتا تھا کہ مصدقہ اولیٰ شریکیت

کا پہلو ملے ہوئے ہوتا اور میرزا صاحب نے داغ خانہ طریقہ سے بیان کیا ہے اور وہ اس لئے ہے کہ سفر
ثانی یہ بتا رہا ہے کہ تم ان سے یہ کہو گے کہ تم نے ہم سے وعدہ ظلمتی کی اور وہ کہیں گے کہ تو جو بڑا
بے ہمین بنا وعدہ یہ نہیں۔ یا ہم رگرتخار ہوگی۔ تکرار سے رنج ٹھیکے گا۔ رنج سے جان عاشق پر صیبت
نازل ہو جائیگی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم ان کے بھولے ہوئے وعدہ کا ذکر ہی نہ کرو۔

تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
فرماتے ہیں۔ تیرے تو سن کی صبا سے تشبیہ و تمثیل اپنی مسنون نگاری کی ہوا باندھتے ہیں ورنہ
تیرا تو سن صبا سے زیادہ جالاک ہے۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
فرماتے ہیں۔ اثر کی امید پر ہم آہ نہیں کرتے نہ ہیں یہ یقین ہے کہ آہ میں تاثر ہوتی ہے
ہم تو صرف اس کے دل پر اپنا رعب بٹھاتے ہیں۔

تیری سرعت کے مقابل لے عمر برق کو پا بہ جٹ باندھتے ہیں
فرماتے ہیں۔ اسے عمر تیری تیز رفتاری کے مقابلہ میں بجلی کو پا بہ جٹ باندھتے ہیں۔ پا بہ فنا
چلنے سے معذور ہونے کا استعارہ ہے۔

تیرے ہستی سے ربانی معلوم اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
فرماتے ہیں۔ انسان کو دنیا کی اور ساری قیدوں سے رہائی اور آزادی مل سکتی ہے لیکن قید ہستی

سے سین میں سکتی۔ قطرہ اشک کو باوجود بے سرو پائی کے باندھتے ہیں اور وہ بندہ ہاتھ ہے اور انسان بھی اشک کی طرح بے سرو پا ہے اسلئے ہستی کی قید میں ہم ضرور رہینگے اور مرتبہ فنا جو عین آزادی ہے حاصل نہیں ہوگا۔
نشہ رنگ سے ہے واسطہ گُل **مست کب بند قیابا بندھتے ہیں**
 فرماتے ہیں۔ نشہ رنگ کی وجہ سے پھول کھلا کرتے ہیں اور جب وہ کھل جاتے ہیں تو وہ نشہ رنگ اور

اور بھی زور پکڑ جاتا اور مست کبھی بند قیابا بندھا نہیں کرتے۔ اسی لئے گل کے بھی بند قیابا کھلے ہوئے ہیں۔
غلطیہائے مضامین مست پوچھو **لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں**
 فرماتے ہیں۔ لوگ یعنی شعرا نالہ کو رسا باندھتے ہیں اور اس کی رسائی کے قائل بھی ہیں یہ ان کے مضامین کی غلطی ہے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نالہ کو رسائی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ مگر نالہ رسا ہوتا تو قیامت تک باندھا نہ جاسکتا۔ اس کا بندہ جاننا رسائی کی دلیل ہے۔

اہل تدبیر کی واما ندگیاں **آبلوں پر بھی خا باندھتے ہیں**
 فرماتے ہیں۔ اہل تدبیر یعنی عقل مند آدمیوں کی باتیں تو دیکھو کہ آبلہ پا پر ہندی باندھ کر پاؤں کو عضو معطل بنا دیتے ہیں یعنی نیک تو انسان آبلہ پا کی وجہ سے چلتے پھرنے سے محذور ہو جاتا ہے۔ اس پر علاج کی غرض سے خا کا باندھنا بالکل ہی پاؤں کو سبکا کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہل جنوں کو دیکھو کہ وہ آبلہ پائی میں بھی دشت پر خار طے کرتے ہیں۔

سادہ پر کار ہیں خواباں غالب **ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں**
 ہم کے لفظ کو زور دیکر بڑھنا چاہئے یعنی ہم کو فریب دیتے ہیں اور بھی کسی کو نہیں۔ فرماتے ہیں۔ یہ ان کی بیوقوفی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم ان کے فریب میں آجائیں گے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اس **وگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں**
 فرماتے ہیں۔ زمانہ جس قدر ہم کو آزار پہنچاتا ہے یہ بہت ہی کم ہے۔ اس کی جان کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تو اس سے زیادہ قسم سننے کی آرزو رکھتے ہیں۔

وا تم پڑا ہوا ترے در پر نہیں میں **خاک ایسی زندگی پہ کچھ نہیں میں**

فرماتے ہیں ہمیشہ تیرے درپردہ تیرے سنگِ در کی طرح سے پڑائیں ہو سکتا۔ ایسی زندگی کو خاک
میں ملا دوں کہ میں پھر پستی تیرا سنگِ در بھی نہیں ہوں۔

کیوں گردشِ ام سے گھبرائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں میں
فرماتے ہیں۔ پیالہ و ساغر کی طرح مجھ کو دن رات گردشِ نصیب سے وہ ایک بیجان شے ہے، گران
کو شربِ مدام کی دہ سے شبِ روز گردشِ رہتی ہے تو ان کو اس کی تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ یک مجلس
چیز ہیں۔ میں انسان ہو کر کب تک ایسی گردش میں مبتلا رہ سکتا ہوں۔ دل کیوں گھبرا جائے۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے لہجِ جہاں پہ حرفِ مکر نہیں ہیں میں
فرماتے ہیں۔ مجھ کو کس وجہ سے زمانہ مٹاتا ہے باوجودیکہ میں حرفِ مکر نہیں اور تو کوئی وجہ
میرے مٹانے کی ثابت نہیں ہوتی۔ حرفِ مکر کا مٹانا لازمی سمجھا جاتا ہے وہ میں ہوں نہیں۔
حدِ چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہ نگار ہوں کافر نہیں میں
فرماتے ہیں۔ کافروں کے لئے عذابِ دوزخ ہمیشہ جاری رہے گا اور مسلمان گوگاراؤں کیلئے
سیادِ سزا مقرر ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ میں ہمیشہ سے عذاب میں مبتلا چلا آتا ہوں۔ رہائی نہیں پاتا۔

قطعِ لعلِ نعتیہ

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے لعلِ دوزخ مرد و زرد گوہر نہیں میں
یہ شعر نعت میں ہے۔ بارگاہِ نبوت میں میرزا صاحبِ عرض کرتے ہیں کہ حضور کس واسطے مجھ
کو عزیز نہیں کہتے ہو کچھ لعلِ دوزخ مرد و زرد گوہر تو نہیں ہوں یعنی مال دنیا میں نہیں ہوں کہ جس کو آپ
عزیز نہ رکھتے تھے۔

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں کیوں لہجِ تبے میں ہر وہاہ سے کمتر نہیں میں
یعنی آپ میری آنکھوں پر قدم کیوں نہیں رکھتے۔ میں تبے میں ہر وہاہ سے کمتر نہیں
شبِ معراج میں تو آپ نے ہر وہاہ کو قدمِ بوسی کا موقع عطا فرمایا تھا۔

کرتے ہو مجھ کو منع قدمِ مبوس کس لئے کیا آسمان کے بھی برابر نہیں میں

مجھ کو قدموں سے کیوں مس کیا جاتا ہے آسمان پر تو حضور کے قدم گئے تھے کیا میرا مرتبہ آسمان سے بھی ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے لو کہ نہیں میں
اوائے شکر کا تیا پہلو ہے وظیفہ اس تنخواہ کو کہتے ہیں جو بلا سدا و صدہ خدمت کے ملا کرئی
ہے۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

سکھیاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا ستوین ہو گئی کہ نہاں ہو گئیں
اس شعر میں ہل ہنود کے عقیدہ تناسخ کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں یہ ہیں بلکہ تھوڑی سی

ٹٹنے والوں کی صورتیں لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ہیں ورنہ بڑے بڑے حکیم خاک کا رزق ہونگے ہیں۔

یا دیکھیں ہم کو بھی رنگ بزم آریاں لیکن انبث و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

اس شعر میں بھی اربابے روزگار کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں ہم کو بھی تم لوگوں کی طرح
سے رنگ بزم جلسے کرنے کا شوق تھا لیکن شباب کا زمانہ گزر جانے سے اب ہمارا حال عبرتناک ہو گیا
یہ وہ شوق ابدہ صہتیں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں ہم کو دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔

بھیں نبات انخش گردن گوشتے ہیں ہاں شہان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

شمال کی جانب آسمان پر سات ستارے ہیں۔ ان میں چار ستارے جہاز ہیں اور تین
جہاز کے اٹھانے والے عرب ان کو لڑکیاں سمجھتے ہیں اور سندھوستان کی عورتیں سات ہیلیوں کا جھمکا
کرتی ہیں۔ تمام ان کا نبات انخش ہے۔ فرماتے ہیں۔ دن کو وہ آسمان کے پرے میں چھپی ہوتی ہیں اور
رات کو بدو سے نکل آتی ہیں یعنی عریاں ہو جاتی ہیں۔

قید میں یعقوب کی گونہ یوسف کی خبر لیکن انکھیں وزن دیوار زنداں ہو گئیں

یعقوب کی آنکھوں کو روزن دیوار زنداں قرار دیا ہے کس واسطے کہ جس طرح روزن زنداں

مہر وقت یوسف پر کشا رہتا تھا۔ اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب روز یوسف کی طرف

نگراں رہتی تھیں (از یاد گاہ غالب)

تقسیموں سے ہونے خوش بہ زبان مصر سے ہے لینا خوش کہ مجاہد کنگاں ہو گئیں
 فرماتے ہیں۔ سب عاشق تو قیاموں سے، خوش ہوا کرتے ہیں۔ لیکن مصر کی عورتوں سے زینبی خوش
 ہے کہ یہ عورتیں حضرت یوسف پر عاشق ہو گئیں۔ یہ اشارہ ہے اس روایت کی طرف کہ جب لینا کا عشق جنت
 یوسف سے ظاہر ہو گیا تو زمانہ مصر زینبی کو عاشق ہونے کے طے دیتی تھیں۔ زینب نے ان عورتوں پر
 سو عورتوں کو منتخب کر کے ایک ایک لیموں اور ایک ایک چھری ہاتھوں میں دی اور کہا کہ جب تم حضرت
 یوسف کو دیکھنا ان چھریوں سے یہ لیموں تراش لینا جب حضرت یوسف سامنے بلائے گئے تو ان عورتوں
 نے بجائے لیموں تراشنے کے اپنی اپنی اٹھلیاں کاٹ لیں۔ زینب نے خوش ہو کر عورتوں سے کہا کہ
 دیکھا تم تو مجھ پر طعنہ زن تھیں۔

جسے خون کھولے ہوئے دو کہ ہے شام فراق میں سمجھو گنا کہ شمعیں و فروزاں ہو گئیں
 فرماتے ہیں شب تبار فراق میں جو خون آنکھوں سے بہے گا۔ میں اس کو یہ سمجھوں گا کہ دو
 موم بیاں اندھیرے میں روشن ہو گئی ہیں اور یہ تسکین خاطر کا سبب ہو جائیگا۔
 ان پر نیرا دل لینگے فلد میں ہم استقام قدرت حق سے ہی جو میل گرواں ہو گئیں
 فرماتے ہیں۔ یہ عشق جو دنیا میں ہم کو جلاتے ہیں۔ فلد میں ہم اپنا بدلہ ان سے لے لیں گے
 اگر خدا کی قدرت سے یہ عورتیں ہم کو ورنگرل جائیگی۔

غند اسکی ہے مانع اسکا ہے زمین سکی ہیں تیری نفس جسکے بازو پر پاشاں ہو گئیں
 یہ شعر مرزا صاحب کے شعروں میں کا ایک شعر ہے اس کی شرح اور تعریف بیان سے مستثنیٰ ہے
 اہل ذوق اپنے اپنے خیال کے موافق اس سے لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

میں تہن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا بلبلیں شکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں
 فرماتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں جانے سے بلبلیں غزلخواں کی گرائیں جس طرح کتب میں طالب علم کتاب
 پڑھتے ہیں۔ قاعدہ ہے بلبلیں آواز خوش شکر مرے سرائی کیا کرتی ہے۔

وہ نگاہیں ملی جاتی ہیں یار دل کے پا جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہو گئیں

لگا ہوں کے خرگان ہونے سے یہ مراد ہے کہ غم کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں بلکہ پلوں کی طرح ہر
دقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔ (از یادگار غالب)

بسکہ وکایں اور سینے میں بھریں لے پیے میری آہیں بجنیہ چاک گریباں ہو گئیں
فراتے ہیں۔ میں نے آہوں کو بار بار ضبط کیا اور وہ بار بار ابھرتی رہیں۔ اس لئے میری آہیں چاک
گریبان کا بجنیہ ہو گئیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ آہوں کے ضبط کر لینے سے باوجود گریبان چاک ہونے کے عشق
کا پر وہ ہو گیا۔

داں گیا بھی میں تو مکی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں
یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں ہی اور وہی مستمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں
دست کے حق میں صرت کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اہل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے
کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایسا ہی معمولی اور ضروری بات ہونی ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو
ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ اس واسطے کہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ تباؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب
دوں گا جبکہ دعائیں نہ تو چکیں (از یادگار غالب)

جانفزا ہے یادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگبیاں ہو گئیں
فراتے ہیں بشراب جانفزا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا اس کے
ہاتھ کی سب لکیریں سچ مچ رگبیاں بن گئیں گویا کہ لفظ مبالغہ کم کرنے کی غرض سے یہاں استعمال
ہوا ہے۔

ہم موصد میں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں حبیب مت گئیں اجڑائے یہاں ہو گئیں
تمام ملتوں اور مذہبوں کو سنجیدہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موصد کا اصل
مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں حبیب مت جاتی ہیں تو اجڑا ہوا یہاں بن جاتی ہیں (از یادگار غالب)
رنگ کا تو گر ہوا اتناں تو مٹ جاتا سچے مشکلیں بھیر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
فراتے ہیں۔ آدمی جب بچہ و غم کا عادی ہو جاتا ہے تو رنج کی سختی اور تکلیف کم ہو جاتی ہے

مجھ پر اتنی مستکون کا جوم ہو کہ وہ خود بخود آسان ہو گئیں۔
یونہی گرو مار غالب تو لے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
اس نقطہ میں دوشنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ رونے کے اثر سے آبادیاں ویراں ہو جائیں گی
اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ سیلاب اشک مکافوں کو ڈھا کر بستیوں کو ویراں کر دیگا۔

دیوانگی سے دوش پہ زنا رہی نہیں، یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
فرماتے ہیں۔ یہ نئی دیوانگی ہے کہ جس نے ہمارے گریبان میں ایک تار بھی نہ چھوڑا، گرد و چار تار
بھی جنون کے ہاتھ سے پک جاتے تو ہم انہی کو زنا رکھتے اس لئے کہ مذہب بستم پرستی میں زنا
کا ہونا ضرور تھا۔

دل کو نیا رحمت ویدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقت ویدار بھی نہیں
فرماتے ہیں۔ ویدار کی تمنا میں جب ہم اپنے دل کو خاک میں ملا چکے۔ اس کے بعد اپنے
موت کا خیال آیا غور کرنے سے ثابت ہو کہ دل کے مٹ جانے سے تاب و طاقت ویدار
کو بھی مٹا دیا اب گروہ ویدار کھائے بھی تو ہم میں جوہ ویدار دیکھنے کی قابلیت اور ضبط کی طاقت نہیں ہی۔
لہذا اگر نہیں آسان تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
ایک نیک کے بیان میں ایسے مناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اس معنیوں
کو چاہو حقیقت کی طرف لیاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کر دو دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر غیر ملنا
آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ وقت نہ بھی اس لئے کہ ہم مایوس ہو کر میٹھ رہتے اور شوق و آرزو
کی خلش سے چھوٹ جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں ہے تو
اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی (انہ یادگار غالب)

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اندیاں طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں
فرماتے ہیں۔ عشق کے بغیر عمر گزر بھی نہیں سکتی اور مصائب عشق برداشت کرنے کی دل میں
طاقت بھی نہیں مطلب یہ ہے زندگی بسر کرنے کیلئے دنیا سے تعلقات چینی تو ہم مکھن پٹنے میں رنج و مرگ

سے دل بھی اُکٹا جاتا ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سروبال و ش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
فرماتے ہیں شوریدہ سرس نے گھر میں نہ ٹکنے دیا وحشت سے تنگ کر بھر بھر اکل کھڑے ہو
مگر اس وحشت سے نجات یہاں بھی حاصل نہ ہوئی۔ اب شکل یہ بڑی کہ جنگل میں سرس پڑ کر مر جائے
کے لئے دیوار نہیں ملتی۔

گنجائش عداوت اختیار یک طرف
یاں دل میں ضعف ہو یا رہی نہیں
فرماتے ہیں گنجائش عداوت اختیار کا تو ذکر ہی کیا ہے عشق و مہر کا زمانہ گزر جائے
کے بعد یہاں یار سے بھی وہ دل لگاؤ باقی نہ رہا۔

ڈرنا لہائے زار سے میرے خدا کو ان
آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں
فرماتے ہیں خدا کو مان کر میرا دل نہ دکھا۔ میرے نالوں سے حذر کر میری قربان دوائے
مرغ گرفتار نہیں ہے جو بے اثر ثابت ہوگی خدا اس میں ضررہ اثر کرے گا
دل میں ہے یار کی صفِ ترگاں کے روٹی
حالانکہ طاقتِ خلش خار بھی نہیں
فرماتے ہیں۔ ارادہ تو یہ ہے کہ فوجِ ترگاں یار سے مقابلہ کر دوں اور حالتِ سیکار دل
میرا اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ خلش خار کی بھی تکلیف برداشت کر سکوں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
فرماتے ہیں کون ایسا ہے جو یار کی اس سادگی پر قربان نہ ہو جائے۔ لڑتے ہیں یعنی جھگڑا
میں ہانا پائی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ہے۔

دیکھا اللہ کو خلوت و جلوت میں
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
فرماتے ہیں ہم نے اس کو خلوت و جلوت میں دیکھا ہے اس سے بے میں باتیں کی ہیں
وہ اگر تھکے بیان کے موافق پورا پورا دیوانہ نہیں تو کمال ہشیار بھی نہیں ہے۔

نہیں زخم کوئی بخیر کے درخورد مرے تن میں
ہو لے تارِ شک باں رشتِ چشم سوزن میں غزل

فرماتے ہیں بجنید کے قابل کوئی زخم میرے جسم میں نہیں ہے یعنی ایسے بڑے اور گہرے زخم ہیں کہ جن میں ٹانگے نہیں لگائے جاسکتے اسلئے تاگا چشم سوزن میں پاؤں کی تاراشک بن گیا ہے۔
 ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ یارانی کف سیلاب پاتی ہے بزرگ پنہ و زن میں
 فرماتے ہیں حب ذوق تماشا میں ہم نے رو کر پھر کی دیواروں کو گرانا چاہا تھا اسی خانہ و یارانی
 کے ذوق نے روزن دیوار کو پانی کے چھاگوں سے بند کر دیا یعنی روئی کی طرح سے کف سیلاب
 روزن دیوار میں بھر گئے۔

ودیعت خانہ بیداد کاوشہا مژگیاں ہو نگین نام شاہد ہے مے قطرہ خون تن میں
 فرماتے ہیں میں، انت خانہ ہوں بیداد کاوشہا مژگان یا رکابو خون کا قطرہ میرے جسم
 میں ہے وہ ایک نگینہ ہے ہر کا جیسے میرے معشوق کا نام کندہ ہے بطلبت ہے کہ میں مانند روضہ مکار
 یار کی کاوشوں کا ہوں امانت جس طرح مژگاد دی جاتی ہے سیر طرح میرے خون کے قطروں
 پر کاوش مژگان ہار کی ہر میں لگی ہوئی ہیں۔

بیاں کس سے ہو طلمت گسری میر شبتاں کی شبت ہو جو رکھدی منہ دیواروں کے روزن میں
 فرماتے ہیں میرے یہ خانہ کی تاریکی کا حال کون بیان کر سکتا ہے اگر اس کے روزن یور
 میں دئی رکھ دی جائے تو یہ معلوم ہو کہ چاند نکل آیا۔

نکو ہش مانع بے بطلی شو جنوں آئی ہوا ہے خندہ احباب تجھے حبیب دامن میں
 فرماتے ہیں میرے احباب کی ملامت سیکر خوش جنوں کی رو کہ نے الی ثابت ہوئی
 ہے اور ان کا خندہ دندان تھام کر چاک گریباں کا بجنہ بن گیا ہے بطلبت یہ ہے دوستوں کے
 طعنوں نے مجھ کو آوارگی سے روک دیا ہے۔

ہوئے اس ہروش کے جلوہ مثال کے آگے پر افشان ہر آئینے میں مثل فرہ روزن میں
 فرماتے ہیں اس ہروش کے جلوہ مثال کے رو برو آئینے کے جو ہر اس طرح اڑتے جن سطح
 روزن دیوار میں شعلہ ہر سے خاک کے ذرے اڑتے ہیں۔

نجانوں نیکے نیکے بدوں پر صحبت مخالف ہے جو کہ ہوں تو ہوں گلشن میں جو کہ ہوں تو ہوں گلشن میں
 فرماتے ہیں یہ تو میں بتا نہیں سکا کہ اچھا ہوں یا برا ہوں لیکن صحبت مجھے مخالف آدمیوں کی
 نصیب ہوتی ہے یعنی اگر بھول ہوں تو بھار میں ہوں اگر گھٹا ہوں تو چھو ہوں تو چھن میں ہوں۔
 ہزاروں دل لے جوش جنوں عشق نے مجھ کو سید ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خون تن میں
 فرماتے ہیں جوش جنوں نے ہم کو ہزاروں لعل عطا کر دیے ہیں یعنی دیوانگی کی وجہ سے جو خون
 سیاہ ہو گیا ہے اسکا ہر ایک قطرہ سویدا بن گیا ہے سویدا دل میں ایک سید دہت ہو کر رہا ہے۔
 اسل زبانی تاثیر الفت کے خوابوں میں خم بہت نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں
 فرماتے ہیں۔ اے اسد حسینوں کی تاثیر محبت سیر لے قید خانہ بنگلی ہے اور مہربانی سے جو
 معنوتوں سے میری گردن میں باہیں ڈالی ہیں وہ طوق گلو کا کام سے رہی ہیں بطلب یہ
 کہ میں سیر محبت ہوں۔

غزل

مڑے جہان کے اپنی نظر میں خاک ہیں سولے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں
 فرماتے ہیں دنیا کے کھانے پینے کے لطف میری نگاہوں میں خاک بھی نہیں میں یعنی مجھ کو
 ان میں خاک مڑا نہیں آتا۔ البتہ خون جگر کے پینے میں مڑا کرتا تھا تو اب جگر میں خاک بھی نہیں ہے
 یعنی جگر میں خون باقی نہیں رہا میں نے سب چٹ کر لیا۔

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے وگرنہ تاب توں بال و پر خاک نہیں
 فرماتے ہیں شاید ایسا ہو کہ خاک ہو جانے کے بعد موابانے تک اڑا بیجا ہے ورنہ بال و پر
 میں تو اب تاب و طاقت خاک بھی نہیں۔

یکس بہشت شامل کی آمد آمد ہے کہ غیر جلوہ گل۔ بگذر میں خاک نہیں
 فرماتے ہیں یہ کون سا بہشت شامل تشریف لائے والا ہے کہ جلوہ گل کے سوا بگذر میں
 خاک نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ جنت میں خاک ہوگی بہشت شامل کی رعایت سے دنیا میں
 بھی جلوہ گل کے علاوہ خاک کا نہ ہونا لطف سے خالی نہیں ہے۔

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو جسم آتا اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں
 فرماتے ہیں۔ اگر اس کو مجھ پر رحم نہ آیا نہ سہی مجھی کو اپنی حالت نذر پر رحم آتا کہ میں نہ ناکستی
 سے باز رہتا مگر معلوم ہو گیا کہ میرے نالہ بے اثر میں خاک اثر نہیں ہے۔

خیال جلوہ گل سے خراب میں میکش شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں
 فرماتے ہیں۔ خیال جلوہ گل یعنی نشا کے طفیل سے میکش بہت ہو ہے میں نہ شراب خانے
 کی دیوار و در میں خاک نہیں ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ زندگی کو پر لطف بنا یزالی شے محبت
 الہی ہے ورنہ اس نالہ نذر دنیا میں کیا رکھا ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں
 فرماتے ہیں۔ عشق وہ بلائے روز گاہ ہے جس گھر میں قدم رکھتا ہے اسکو تیرا دوریت گرد
 ہے۔ میں عشق کی غارتگری سے شرمندہ ہوں کہ میرے گھر میں سوائے حسرت تعمیر کے اور
 خاک بھی نہیں ہے۔

ہم اے شعر میں اب صرف نگی کے سہل کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں
 فرماتے ہیں۔ اے استاد ہم صرف اپنے دل بہلانے کی غرض سے شعر کہا کرتے ہیں مگر
 یہ معلوم ہو گیا کہ اظہار کمال میں خاک بھی فائدہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب لوگ غلوئی
 کی قدر کرتے ہیں ورنہ شعر کی خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

غزل دل ہی تو ہے نہ سنگ خشت دے بھرتے کیوں روئنگے ہم ہزار بار کوئی نہیں تلے کیوں
 اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ظالم اپنے مظلوم عاشق پرستم کے ساتھ یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ
 خبردار آنکھ سے آنسو کا قطرہ نہ پکے پائے اور عاشق مظلوم گرگزار اگر اس سے کہتا ہے سیر سینہ میں تو
 ہوا دل ہے سنگ خشت نہیں ہے کیوں نہ بھرے ہوئے ساغر کی طرح جھلک جائے میں تو
 ہزار بار ساہوگر روؤں گا۔ کوئی مجھ کو کیوں تلے کمال غصہ میں بجائے مخاطب کرنے کے کوئی
 کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہزار ہزار حسن پیدا کر رہا ہے۔

دیر نہیں حرم نہیں ورنہیں آستان نہیں بیٹھے ہیں رگنڈر پہ ہم غیر مہر اٹھائے کیوں
یہ شعر لاکھ نشروں میں کا ایک نشر ہے۔ ہر صاحب ذوق اپنے ذوق طبیعت کے موافق
اس سے لطف اٹھا سکتا ہے۔

جب وہ جمال و لفظ و صورت مہر نیروز آپ ہی ہو نظارہ سوز پرے میں منہ چھپا کیوں
فرماتے ہیں جب وہ جمال جس سے دل روشن ہے اور مہر نیروز کی طرح اس کے دیکھنے سے
نگاہ قاصر ہے تو پردہ میں پوشیدہ کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ پردے میں نہاں نہیں ہے بلکہ
آہکار ہے مگر پھر کوئی اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔

دشنہ غمزہ جانتاں نادک ناز بے پناہ تیرا ہی عکس نہ سہی سامنے تیرے آئے کیوں
فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ دشنہ غمزہ جانتاں ہے اور نادک ناز بے پناہ ہے تیرا وہ
کسی کا آنا ہی بہتر نہیں ہے یعنی جو شخص آئیگا وہ مارا جائیگا اب اگر آئینہ تیرے سامنے آیا اور اس میں
تیرا عکس دشنہ و نادک لئے ہوئے تیرے مقابل ہو گیا تو پتا تیرا کیا حال ہوگا۔

قید حیات بند غم اہل میں و نون ایک ہیں موت پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
فرماتے ہیں جس طرح قید حیات ایذا دینے والی ہے ایسی طرح بند غم تکلیف دہ ہے ان کو
کی اہل ایک ہی ہے یعنی یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام میں پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آدمی مرنے
سے پہلے غم سے نجات پائے۔

حسن اور حسین ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم اپنے پناہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
فرماتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ حسن و کشت شد تلخ نے عطا فرمایا ہے دوسری وجہ یہ
کہ حسن کی و لفرسی کا یقین بھی کامل ہے ان دونوں باتوں سے بوالہوس کی شرم رہ گئی اس کو اپنی ذات پر
اعتماد کی حاصل ہے کہ جو مجھے دیکھو گا بغیر عاشق ہوئے نہ رہیگا پھر کیوں غیر کا امتحان کرے
دال غرور عز و نازیاں یہ حجاب پاس وضع راہ میں ہم طیس کہاں بزم میں ہلے کیوں
فرماتے ہیں یہاں تو یہ پاس وضع ہے کہ ہم رستہ میں اس سے ملتے ہوئے شرماتے ہیں اور

وہاں وہ غرور غرور ناز ہے کہ اپنی بزم میں ہم کو جانے ہوئے اکوننگ آتا ہے۔
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوقوف سی جس کو ہودین دل عزیز کی گلی میں جائے کیوں
 اس نے جو شوق کی بُریاں مہر شوق کی بے دینی اور میونانی بیان کی ہے اس کے جواب میں
 میرزا صاحب کے لہجہ میں فرماتے ہیں ہاں وہ خدا پرست ہیں ہے جاؤ وہ بیوقوف ہی سی جس کو دین دل
 بہاؤ وہ اپنی گلی میں کیوں جانے جانی اسے صاع شفق آپ وہاں جانے کی تکلیف نہ فرمائیے گا
 اور ہر توتہ اسکو چھوڑ سکتے ہیں ورنہ اس کی گلی میں جانے سے باز رہ سکتے ہیں۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں رویتے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں
 میرزا صاحب اپنی وفات کے بعد اپنے دوستوں کو رنجیدہ و طول پاکر ملقبین صبر ان لفظ
 میں فرماتے ہیں کہ غالب خستہ کے بغیر دنیا کے کوئی کام بند ہو گئے جن کی وجہ سے تم زار زار روئے
 اور ہائے ہائے کرتے ہو۔

غزل غنچہ ناشدہ کو دوست مست کھا کیوں بوسہ کو پوچھتا ہوں میں سے مجھے بتا کیوں
 فرماتے ہیں۔ میں نے جو یہ دریافت کیا کہ بوسہ کیوں کر لیا جاتا ہے تو تو نے منہ بند کیوں کر کھلی کے
 اشارہ سے دکھا دیا کہ دیکھ بوسہ لینے کی یہ صورت ہوا کرتی ہے میں خاک نہیں سمجھا میرے پاؤں پر
 اور میرا بوسہ سیکر مجھ کو بتا کہ دیکھ کیوں لیتے ہیں۔

پرست طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے اس کے ہر کاشائے سے نکلتے ہے یاد کیوں
 فرماتے ہیں۔ دل چسپ لینے کے طریقہ کو اس سے کیا دریافت کیا جائے اسکی تو ہر آواز ہے
 یہ اشارہ پیدا ہوتا ہے کہ دیکھ دل پر چسپ لیا جاتا ہے۔

رات کی وقت ہے ساتھ رقیب کو لئے آئے وہ یاں خدا کرے پر کرے خدا کیوں
 فرماتے ہیں یہ تو ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ شوخ ہمارے گھر میں قدم نہ بھرے لیکن خدا
 نہ کرے کہ وہ یوں آئے یعنی شراب پی کر اور غیر کو ساتھ لیکر نہ آئے۔

غیر سے رات کیانی یہ جو کہا تو دیکھے سامنے آن بیٹھا اور یہ دیکھا کیوں

فرماتے ہیں میں نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ رات کو غیر سے کیا بچی اس کے جواب میں اس نے یہ کہا کہ میرے سامنے آ بیٹھا اور اس واسے یہ ظاہر کر دیا کہ دیکھنا یوں یعنی میں اس کے سامنے اس طرح دُور بیٹھا رہا۔

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خاموش بیٹھئے اُس کی تو خاموشی میں بھی یہی مدعا کہ یوں فرماتے ہیں اس کے روبرو بزم میں کیونکر خاموش نہ بیٹھا جائے اسکی تو خاموشی میں بھی یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہماری طرح تم بھی خاموش بیٹھے رہو۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں ستم ظریف وہ شخص کہ جبکہ ستم میں ظرافت ہو۔ فرماتے ہیں میں نے اس سے کہا تھا کہ بزم ناز غیر سے خالی ہونی چاہئے یہ بات سن کر اُس ستم ظریف نے مجھ کو اپنی بزم سے اٹھا دیا کہ یوں خالی ہونی چاہئے یعنی ہماری بزم میں ایک تو ہی غیر تھا۔

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں کس طرح دیکھ کے میری بخودی چلنے لگی ہو کہ یوں فرماتے ہیں مجھ سے یار نے یہ دریافت کیا تھا کہ ہوش و حواس کس طرح سے جاتے ہیں میری بخودی کو دیکھ کر ہوا چلنے لگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دیکھ لے ہوش یوں اُڑھاتے ہیں۔

کنبے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی آئندہ وار بنگئی حیرت نقش پاکہ یوں فرماتے ہیں مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد نہ تھی نقش پانے مجھے سکھا دیا کہ دیکھ اس طرح خا میں ملکر اور جلوہ یار سے حیرت زدہ ہو کر معشوق کے کوچہ میں رہا کرتے ہیں۔

گر ترے دل میں جو خیال وصل میں شوق کا زوال موج محیط آب میں لائے ہے ہست پاکہ یوں فرماتے ہیں اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل سے کامیاب ہو کر شوق کیونکر زوال پذیر ہوتا ہے اور عاشق و معشوق میں اتحاد کامل کس طرح ہوتا ہے تو موج محیط آب کو دیکھ لے وہ تبارہی ہے کہ یوں دست و پا مارنے مارنے کا راتخا د پیدا ہو جاتا ہے جس سے طنین سکون کی شکل نکل آتی ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتہ غالب کیا ڈرھکے اُسے سُناک بوں
ریختہ ارد میں شعر کہنے کو کہتے ہیں فرماتے ہیں جو شخص یہ پوچھے کہ ریختہ کیونکر رشک
فارسی ہو کرتا ہے تو غالب کے اشعار ایک بار پڑھ کر اسے سُنا کہ یوں ہوتا ہے۔



ریختہؒ حسد سے دل گرافسردہ ہے گرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے واہو
یہ شخص خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقتِ افعیٰ کو ایک نیتِ عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے
فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دنیا کے حالات، واقف اور لوگوں کی ترقی
تنزل کے اسباب بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا لیکن
جب قدر اس کا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے ہفتہ راس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ کوئی
خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر حسد رشک کیا جائے بلکہ ان کی محنت و تہذیب کا نتیجہ ہے اور اس لئے
انصاف و رفاقتی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بھی کوششِ تہذیب کی طرف مائل ہوتا
ہے اور بجائے حسد و رشک کے اردوں کی لہریں درپردہ کرنے پر توجہ ہو جاتا ہے اس معقول بات کو ایک
محسوس تشیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے واہو جس طرح شعر نے بحال کے دل
کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ مٹھو کیا ہے (از یادگار غالب)
بقدر حسرت دل چاہئے ذوقِ معاشی بھی بھڑل بک گوشہ دامنِ گر آبِ ہفتِ پام
بقدر حسرت دل کے برابر ذوقِ گناہ بھی ہونا چاہئے میں نے دامن کا ایک ذرہ رکھوں
اگر اساتِ دریاؤں کا پانی مجھ کو مل جائے آپ ہفت دریا سے کثرتِ معاشی کا استعارہ ہے۔
اگر وہ سرد قد گرم خرام ناز ہو جائے کفِ ہر خاک گلشنِ قمری نالِ قرب ہو
فرماتے ہیں اگر وہ سرد قد اپنے خرام ناز کیساتھ گلزار کی میر کو آجائے تو ایک ایک شعی خاک
گلشن کی قمری بن کر اس کے عشق میں نالے کرنے لگے۔ قمری کا رنگ کسری ہوا کرتا ہے۔
غزل کہیں جا رہا تو نہ دو طعن کیا کہیں بھولا ہوں حق صحبتِ اہل کشت کو

فرماتے ہیں۔ اگر میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کہیں میں ہمارا توجہ کو طعنہ کیوں دیتے ہو میں
بنکدہ کی صحبتوں کو بھولنے والا آدمی نہیں ہوں۔

طاعت میں تاہم نہ مے وانگیں کی لاگ و زخ میں دالہ کوئی لے کر بہشت کو
فرماتے ہیں بہشت میں جو شہداء و شہرت کی نہریں ہیں ان کے لالچ سے اگر بہشت الٹی کی تو کیا
کی بہشت کو دوزخ میں بھونک دیتا ہے۔ جب سے غرض عبادت کا مزہ ہے۔

ہوں منہ خرف نہ کیوں و درہم ثواب سے ٹیرھا لگا ہے قلم سر نوشت کو
فرماتے ہیں میں راہ و درہم ثواب سے برگشتہ کیوں نہ رہوں۔ کاتب تقدیر نے جس قلم سے میری
سر نوشت لکھی ہے اس پر قلم ٹیرھا لگا تھا۔ یہ وجہ ہے میری ہم ثواب سے برگشتہ ہونے کی۔

غالب کچھ اپنی سعی سے ملتا نہیں مجھے خرمن جلے اگر تلخ کھائے کشت کو
فرماتے ہیں مے غالب اپنی کوشش سے فائدہ اٹھانا میری تقدیر میں نہیں لکھا۔ اگر ٹڈیاں
میری کھیتی کو نہ کھالیں تو اناج کے خرمن میں آگ لگ جائے۔

دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
فرماتے ہیں ہم اس خیال سے آراء دیں کہ تم سے اس بات کی فرمائش کی جائے کہ ہمارے
ساتھ تم محبت کا برتاؤ کرو۔ ہاں یہ کہتے ہیں ہمارے ساتھ عداوت بھی کی جائے تو اس میں بھی غم
کی شرکت نہ ہو مطلب ہے کہ دوستی اور دشمنی ان دونوں باتوں میں سے ہمارے ساتھ وہ کر د
جو دشمن کے ساتھ نہ کی جائے۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا سہل پہا پر نقش محبت ہی کیوں نہ ہو
فرماتے ہیں ضعف نے مجھے ایسا سکھا دیا ہے۔ کہ میرے خیم میں خون باقی نہ رہا اور خون
باقی نہ رہنے سے رنگ اختلاط بھی مٹ گیا۔ اب میرے دل پر نقش محبت بھی بار ہے۔

سے بھنکوتے سے تذکرہ غیر کا گلہ ہر چند برسوں شکایت ہی کیوں نہ ہو
فرماتے ہیں۔ مجھ کو تم سے غیر کے ذکر کرنے کی شکایت ہے۔۔۔ جو دیکھ تم نے اسکا ذکر شکایت

آئینہ انفلوئنس میں کیا ہے مجھ سے اسکی شکایت بھی نہ کیا کرو۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا یوں ہو تو چارہ غم الفت ہی کیوں نہ ہو
فرا تے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے۔ دنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ بات سچ ہو تو
عشق کا بیمار اچھا ہی کیوں نہ ہو جایا کرے۔

ڈالا نہ ہیکسی نے کسی سے معاملہ اپنے سے کھینچتا ہوں نجات ہی کیوں نہ ہو
فرا تے ہیں بلکہ ہے میرا معاملہ میری ہیکسی نے کسی غیر سے نہ ڈالا۔ یعنی کسی غیر شخص کا احسان
مجھ پر نہ ہوا اگر لوگوں سے مجھ کو کچھ نفع بھی نہ پہنچتا تو شرمندگی ضرور اٹھانی پڑتی۔ اب اگر شرمندہ
بھی ہوں تو اپنی ہی ذات سے۔

بے آدمی بجائے خود ایک محشر خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
فرا تے ہیں۔ تنہائی اور خلوت میں بھی تو خیالات اور تصورات کی ہنگامہ آرائی رہتی ہے
وہ کیا انجمن سے کم ہے مطلب ہے کہ تخلیق نفس نہایت دشوار کام ہے اور خطرات قلب پر قابو
پانا اس سے بھی دشوار ہے۔ یہ شعر تصوف میں ہے۔

ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال حال نہ کیجئے دہرے عبرت ہی کیوں نہ ہو
فرا تے ہیں۔ کسی شخص سے کچھ حاصل کرنا یعنی اسکا احسان لینا انفعال کا سبب ہے۔ اور
شرمندگی حاصل کرنی کم ہمتی کا کام ہے۔ یہاں تک کہ زہرے عبرت بھی حاصل نہ کرنی چاہیے
وارستگی یہاں نہ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو
فرا تے ہیں۔ وارستگی اور آزادی اسکو نہیں کہتے کہ لوگوں سے وحشت اور بیگانگی کا برتاؤ
کیا جائے۔ اور یہ خیال موجب فخر و ناز ہو کہ ہم دنیا سے آزاد ہو گئے نہیں بلکہ بیگانگی و وحشت
اپنے نفس سے کی جائے اس کا نام آزادی ہے۔

مٹا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی عمر غیر صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
فرا تے ہیں وقت کے ضائع ہونے اور گزرنے کا غم ایسا ہے کہ جبکا انعم البدل ممکن ہی نہیں

عمر عزیز اگر صرف عبادت بھی ہو تو بھی اس کا غم کرنا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عبادت سے بڑھ کر
 اور کوئی اچھا کام کیا جاتا تو ممکن ہے کہ زیادہ موثر اور سودمند ہوتا۔

اس قسمہ خو کے در سے اب کھٹے نہیں استبد اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہیں
 فرماتے ہیں۔ اس سادہ ہم تو اب اس قسمہ گر کے در سے کھٹے نہیں۔ بلا سے ہمارے سر پہ قیامت
 ہی کیوں نہ گذر جائے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ روز قیامت میں سب اٹھیں گے مگر ہم جب بھی نہیں
 اٹھیں گے۔

تفس میں ہو گئی اچھا بھی نہ جانیں کشتیوں کو ہر پہلو مایہ کیا ہے تو اس نجان گلشن کو غن
 فرماتے ہیں مجھے گرفتار رنج و غم اور سرگرم نالہ و فریاد دیکھ کر میرے وہ دوست جو رہائے
 کی گردشوں سے محفوظ اور دنیا کے پنج و آلام سے بچے ہوئے ہیں۔ کیوں نفرت ظاہر کرتے ہیں
 میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔

نہیں گرجی آسان ہو یہ شک کیا کم ہے زدی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
 فرماتے ہیں۔ یہ تو میں نے مانا کہ میرا سا جوش عشق اور نالہ و دنگداز میرے دشمن کو نہیں ملے
 لیکن یہ شک کیا کم ہے کہ میری طرح وہ بھی آندوئے دوست رکھتا ہے۔ یا رب العالمین یہ
 آرزو دشمن کو نہ دی جاتی تو بہتر تھا۔

نہ نکلا آنکھ سے تیرے اک آنسو اس جراحت کی کیا سینہ میں جس نے خوشیاں ہر مکان زن کو
 فرماتے ہیں۔ تیری آنکھ سے ان زخموں کا حال سن کر ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ جن زخموں
 کو میرے دل میں دیکھ کر سوزن غم کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔

خدا ترے ہاتھوں کو رکھتے ہیں کشاکش میں کبھی سے گریباں کو کبھی جانان کے واس کو
 میرا صاحب ناس شعر میں یہ شوخی بھر دی ہے کہ اپنے جوش عشق اور دھور شوق کا
 الزام بے گناہ ہاتھوں پر لگا دیا ہے۔

ابھی ہم قتلگاہ کا دیکھنا آسان سمجھتے ہیں نہیں دیکھا شاور جوئے نوح میں تیرے سن کو

فرماتے ہیں! ابھی تک ہم قتلہ کا تماشا نہ دیکھنا آسان ہی سمجھے ہوئے ہیں تیری سواری کے گھوڑے کو خون کے دریا میں تیرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے مطلب ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ راقا تل گروہ عشاق میں سے ایک خوش نصیب عاشق کو انتخاب کر کے خیر ناز یا تیغ غمزہ سے شہید کر دے گا یہ نہیں معلوم کہ اس تماشا کے بعد اتنے آدمی رشک سے اپنے گلے کاٹینگے کہ خون کا دریا بہ جائیگا۔

ہوا چہ چا جو میرے پاؤں کی زنجیر بنے گا کیا تیا بکلاں میں جنش جو ہر نے آہن کو فرماتے ہیں۔ میری دیوانگی کا رتبہ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے پاؤں کی زنجیر بنائے جانے کا چہ چاٹن کر فولاد کو جو ہر فولاد نے معدن میں جیاب کر دیا یعنی وہ یہ چاہتا تھا کسی طرح کان سے باہر آکر اس دیوانہ کی زنجیر چاہتا ہوں۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار برائے سمجھتا ہوں کہ کھیتنگ ہے ابھی سے برق خرم کو فرماتے ہیں۔ میرے کھیت پر بار بار برکا آتا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ میری زراعت کی پرند کے لئے آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ کھیل ابھی سے میرے خرم کو تلاش کر رہی ہے اور اس کی جھوٹیں دوڑ دوڑ کر آتی ہے مطلب ہے میں ایسا نامراد شخص ہوں کہ جس کی ساری کوشش بیکار ثابت ہوتی ہے۔ وفاداری بشرط استواری اصلایاں ہے مے تجانے میں تو کعبہ میں گارو برہمن کو یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر تجانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبے میں دفن کیا جائے۔ اس لئے کہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر لیا اور یہی ایمان کی اصل ہے (از یادگار غالب)

شہادت تھی مری قسمت میں تھی کٹی تھی مجھ کو جہاں تلوار کو دیکھا جبکہ نیت تھا گردن کو فرماتے ہیں۔ میری قسمت میں مرتبہ شہادت ٹکھدیا گیا تھا اسی واسطے مجھ کو یہ عطا ہوئی تھی کہ جہاں میں تلوار کو دیکھتا تھا گردن جبکہ نیت تھا۔ گھرا تلوار میری آنکھوں میں مریب مبادت۔ ہم دیتی تھی نہایت طبع اور پر اطمینان شریعت۔

نہ لکھتا دن کو تو کبے انگو یوں بے خبر ہوتا رہا کھڑا نہ چوری کا دعویٰ۔

اس شعر کا یہ مطلب ہے کہ انسان دنیا میں آرام اسی صورت میں پاسکتا ہے جب تعلقات
دنوی کو دل سے شادے۔

سخن کیا کہ نہیں سکتے کہ جو یان چون جاہ کے جگ کیا ہم نہیں کہتے کہ کھو دیں جا کے معدن کو
فرماتے ہیں جگ کا دی کے ساتھ شعر کو موزوں کرنا معدن کو کھود کر جو اہر نکالنے سے بدرجہا بہتر
مرے شاہ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب فریدون جم کو پھنسر و دارا مہی بہمن کو
میرزا صاحب کا مدعا شاہ سلیمان جاہ کہنے سے یہ ہے کہ بادشاہ مسلمان تھے اور نہایت میندار
یہ سب بادشاہ جن کا معرہ ثانی میں ذکر کیا ہے کا فر تھے۔ وجہ فوقیت ثابت ہے۔

دھوتا ہوں جب میں پیئے کو اس سکتن کے پانؤ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانؤ
پانؤ دھو کر پتیا۔ انہما رجوش محبت کا استعارہ ہے باقی شعر کے سنی صاف ہیں۔

دی سلاگی سے جان پڑوں کو کچ کے پانؤ بیہات کیوں ٹوٹ گئے پیرزن کے پانؤ
میرزا صاحب کے زمانہ میں بیوتوت آدمی کو بنائے کا موقع پر کہا کرتے تھے کہ اس کے پانؤ پچے
اب ایسے موقع پر کہتے ہیں۔ ان کا بایاں پانؤ پوچئے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ فرما دئے بیوتوتنی
سے ایک عیار کے دم میں اگر جو پیرزن کا بھیس بدل کر آیا تھا جان دیدی۔

بھلے گئے تھے ہم بہت سواسی کی سزا ہے یہ ہو کر اسیر و اجتے ہیں راہزن کے پانؤ
مطلب ہے کہ تقدیر الہی کے خلاف کوشش بیکار ثابت ہوا کرتی ہے اور اکثر اس کا نتیجہ
برعکس ظاہر ہوتا ہے۔

مریم کی جستجو میں پھر اہوں جو دُور دُور عن سے سوانکا میں اس خستہ تن کے پانؤ
مطلب یہ ہے جستجو سے جو ہر مراد ہمیشہ نہیں ملا کرتا کبھی مل جاتا ہے۔

اللہ سے دوق دشت نوڑی کہ بعد مرگ ملتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانؤ
فرماتے ہیں شوق صحرانوردی مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ ہے۔ زندگی میں دنیا کے خیلوں
میں پھرتا تھا موت کے بعد میدان عدم طے کر رہا ہوں مبالغہ اچھوتا خیال ہے۔

ہے جوش گل بہار میں یا شک کہ بھڑن اڑتے ہوئے اُچھتے ہیں صر جھن کے پاتو
میرزا صاحب نے اس شعر میں عجیب تراکت سنی سے کام لیا ہے مطلب یہ ہے اس بہار کے
ساتھ چمن میں بہار آئی ہے کہ جو پرندے باغ پر اڑتے ہوئے گندتے ہیں وہ تہ شاے گل و لاد
دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتے ہیں اور آگے جانے کو ارادہ منق کر کے وہیں اتر پڑتے ہیں۔
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں دیکھتے ہیں آج اس بُت ناز کبدن پاتو
فرماتے ہیں۔ آج اس بُت ناز کبدن کے پاتو دیکھتے ہیں۔ شاید کہیں گیا ہو گا جانے کے خیال
کے ساتھ رشک نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ اس کا بیداری میں بیانا بیان کیا جائے اسلئے
یہ بات نہ فی گئی کہ شاید وہ خواب میں کسی کے ہاں گیا ہوگا۔

غالب مگرے کلام میں کیونکر مزانہ ہو پیتا ہوں دھوکے خسر شہسرخ سخن کے پاتو
خسر شہسرخ سخن کا اشارہ بہادشاہ فی التخلص بہ طغر آخر بادشاہ دہلی کی طرف ہے باقی شعر مکتا ہے
داں اسکو مول دل ہے تو یاں میں مژوں شرمسا یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
جوش محبت کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے معشوق کو کوئی تعلیق یا بیداری پیدا ہو جاتی ہے
تو عاشق اپنی آہ یا دعا جذبہ دل کے اثر سے اس کا ہونا بکھا کرتا ہے۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوق ستم تو دیکھ آئینہ تاکہ دید و پنجیر سے نہ ہو
فرماتے ہیں جب تک دید و شکار آئینہ روبرو نہ ہو کہ ستم آرا اپنا منہ نہیں دیکھتا ہے۔
واں پہنچ کر جو غش آتا ہے ہم ہے ہلکو صدر وہ آہنگ زریں بوس قدم بے ہم کو
فرماتے ہیں۔ کو چہ یار میں پہنچ کر جو ہم کو بے ہم غش آتا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ ہماری ناتوانی
اور کمزوری میں یہاں تک پاؤں نے پہنچا دیا۔ اس انسان کو ہم یہ بدل کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے قدم
چونے کے ارادہ سے اس زمین پر گر پڑتے ہیں جس پر ہمارا نقش قدم ہوتا ہے۔

دل کو میں اور مجھے دل محو و فار کھتا ہے کس قدر ذوق گرفتار می ہم ہے ہم کو
فرماتے ہیں۔ دل کو میں محو و فار کھتا ہوں اور مجھ کو دل محو و فار کھتا ہے آپس میں ہم دونوں

ایک دوسرے کو گرفتار رکھنا چاہتے ہیں۔

ضعف لکش پے مور ہے طوق گردن تیرے کوچ سے کہاں طاقت ہم ہے ہم کو
فرماتے ہیں۔ حیویتی کا نقش قدم ہم سے کمزور آدمی کے واسطے طوق گردن کا حکم رکھتا ہے
لستے بھاری بوجھ کو لے کر ہم کیونکر تیرے کوچ سے بھاگ سکتے ہیں۔

جانکر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو یہ لگا و غلطا انداز تو قسم ہے ہم کو
فرماتے ہیں۔ جانکر یعنی سمجھ کر ارادہ کے ساتھ مجھ سے چشم پوشی کیجئے تو مجھ کو رحم آجانے کی
امید بندھ جائے لیکن ایسی نا آشنا نظر سے دیکھ لینا تو میرے لئے زہر سے کم نہیں ہے۔

ریشک بھڑھی و درواشر بانگ حزیں نالہ مرغ سحر تیغ و ددم ہے ہم کو
فرماتے ہیں۔ ایک تو ہم نوائی کا ریشک دوسرے درد فریاد کا اثران دونوں باتوں نے
نالہ مرغ سحری کو میرے واسطے چشمہ ال یاڑھ کی تلوار بنا دیا ہے۔

سراڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا ہنکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
اس شعریں دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور تیرا سر کاٹیں گے اور
دوسرے معنی یہ ہیں کہ تیرا سر کاٹنے کی ہم کو قسم ہے۔ ہم تیرا سر برگز نہ کاٹیں گے۔ محاورہ میں ایسی
طرح بولا جاتا ہے یعنی آج ہم کو پانی پینے کی قسم ہے۔ آج ہم پانی نہ پیں گے۔

دل کے خون کرنے کی کیا وجہ لیکن ناچار پاس بے سیر و لقی دیدہ نم ہے ہم کو
فرماتے ہیں۔ دل کے خون کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے صرف اس مجبوری سے
دل کو خون کرتے ہیں کہ بغیر اشک خونی کے آنکھیں ذرا بے رونق سی معلوم ہوتی ہیں۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی قسم ہے ہم کو
فرماتے ہیں۔ تم اس قدر نازک ہو کہ فغاں ترک کر دینے کے بعد ہماری خاموشی کو بھی فغاں
کہتے ہو۔ اور ہم اتنے کمزور ہیں کہ قسم بوقوت کر کے تم نے تغافل اختیار کیا تو ہمارے حق میں
اس نے بھی قسم کا کام دیا۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا مینہ سنی ہو سیر و تماشا سہ سو وہ کم ہے ہم کو
 فرماتے ہیں لکھنؤ آنے کا کچھ سبب ہم پر ظاہر نہیں ہوا ایسی سیر و تماشا کی عرض سے ان کا
 سفر کیا کرتا ہے تو دونوں باتیں نہیں ہیں۔

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شعر عزم سیر بھٹ طوط حرم ہے ہم کو
 فرماتے ہیں۔ یہ شعر سلسلہ شوق کا مقطع نہیں ہے مینہ اس کا ختم کرنے والا نہیں ہے
 سیر بھٹ اور طوط حرم کا ارادہ ہم کو ہے۔

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جاوہ رکشش کات کرم ہے ہم کو
 سیرا صاحب بغرض استغاثہ پیش کلکتہ جاتے ہوئے چنہ ماہ لکھنؤ اور بنارس میں پھیرے
 تھے اس مقطع میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

تم جانو تم کو غیس کے چہ راہ و رسم ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
 فرماتے ہیں۔ غیر کی رسم و راہ کے ساتھ اگر مجھ سے بھی ربط و ضبط رہے تو یہ کچھ بری بات
 نہیں ہے ترک ملاقات سے کیا فائدہ ہو گا۔

بچتے ہمیں مواخذہ روز حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم کو اہ ہو
 فرماتے ہیں تم کسی طرح مواخذہ حشر سے بچ نہیں سکتے۔ یہ میں نے مانا کہ میرا قاتل رقیب ہے
 یعنی اس کی طبع رشک نے مجھ کو قتل کیا ہے لیکن گواہی میں تم بھی ضرور پیش ہو گے۔

کیا وہ بھی وہ بیگنہ کش و ناحق شناس ہے مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
 فرماتے ہیں کیا خورشید و ماہ بھی تمہاری طرح بیگنہ قتل کرنے والے اور حق نہ پہچاننے
 والے ہیں یہ تو میں نے مانا کہ تم بشر نہیں ہو۔ خورشید و جمال اور ماہ و پیکر ہو۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار ترا بھرا ہوا ہے مجھے اس کو دیکھ کر یہ خوف پیدا ہوتا
 فرماتے ہیں۔ اس کی نقاب میں ایک تار ترا بھرا ہوا ہے مجھے اس کو دیکھ کر یہ خوف پیدا ہوتا
 ہے کہ یہ کسی شائق جمال کی نگاہ تو داخل نقاب نہیں ہو گئی ہے۔ سیرا صاحب نے اس شعر کا مصرع

بے شل لکھ ہے ثبوت دعویٰ کے واسطے اس سے بہتر خیال کا یہم پہنچا ممکن نہیں۔
 جب میکہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو۔ مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
 اس شخص ازراہ تہذیب اسکا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو
 مادی قرار دیتا ہے۔ مطلب ہے کہ میکہ جہاں حرفوں کے ساتھ شراب پیئے کا لطف تھا جب
 وہی چھٹ گیا۔ اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لیتی
 برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کے کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات جو اس شخص کے بالکل
 لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکہ پھینکنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تہذیب
 نہ کرنا میں مقتضائے بلاغت ہے (از یادگار غالب)

شتمین جہنم کی تعریف سب سے لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو
 فرماتے ہیں۔ بیشک کی جو کچھ تعریف ہم سنتے ہیں وہ سب بجا و درست ہے۔ ہم کو اس کی اور
 خوبیوں سے کچھ غرض اور مطلب نہیں ہے لیکن خدا اپنا کرے کہ وہ تیری جلوہ گاہ قرار پا جائے
 تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

غالب بھی گرنہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں دنیا ہو یا رب اور میرا بادشاہ ہو
 فرماتے ہیں۔ غالب کا سا با کمال شاعر اگر دوبار میں نہ ہو تو اس سے کچھ نقصان نہیں
 پہنچتا لیکن یارب دنیا ہو اور اس میں میرا مدح بادشاہ زندہ سلامت رہے۔

فزل گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو کہے سے کچھ نہ ہو اچھر کہو تو کیونکر ہو
 فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ گزر گیا کہ جب ہم یہ سوچا کرتے تھے کہ ان سے اہلکار کی تنہا کی ابتدا
 کیونکر اٹھانی جائے۔ خوش نصیبی سے جبراً ایسا قبول کیا کہ بہت سی ناکہ کے بعد جو ایک تجویز ہم نے سوچی
 غی اس کے موافق ہم نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور انہوں نے وہ سب سنی مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی
 نہ نکلا۔ اب کیونکر ہمارا کام بنے۔ مطلب یہ ہے ہم نے سب کچھ کہا مگر ان پر اثر خاک بھی نہ ہوا
 اور ہمارے کہنے کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا اب کیا کریں مجبور ہیں۔

جہاں سے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گزرتو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
ہمارے نزدیک اسی کا نام وصال ہے کہ پہروں بیٹھے ہونے پر سوچا کرتے ہیں کہ اگر وصال
یا رخصت خواست نصیب نہ ہوا تو ہم کیا کریں گے۔ کہاں جائیں گے اور اگر ہوگا تو کیونکر ہوگا اس کے
لئے کیا سامان ہونے چاہئیں۔ کس قسم کی کوشش کی جائے۔

اوپر سے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے حیا ہے اور یہی گو گو تو کیوں کر ہو
دلاتے ہیں۔ ارمان، شوق، تمنہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی مراد دلی حاصل
کریں۔ مگر اب روکتا ہے اور ان دونوں فریقوں میں باہم کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی حیا
ان کو صاف جوا نہیں دیتی ان کی طرف سے گو گو میں بات چلا پڑتی ہے اب کامیابی حاصل ہو تو کیونکر ہو۔
میں کہو کہ گزرا اصرار صنم پرستوں کا
فرماتے ہیں ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں۔ تم ہم کو یہ بات بتاؤ کہ صنم پرستوں کا گزرا یعنی ان
کا حصول مدعا کس طریقہ سے حاصل ہوا اگر سارے جہان کے معشوقوں کی ایسی ہی عادت ہو جائے
کہ جیسی تمہاری ہے کسی بات کو مانتے ہی نہیں۔ ہر سوال پر انکار کر دیتے ہو۔

آنکھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو
شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا ہی اپنی مانند گوارا نہیں تو
شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین سوجو دہیں تو تم کیا قیامت پیدا کرو۔

جسے نصیب ہو روزیہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے راز یا دکا غالب
ہیں پھر ان سے امید اور نہیں ہمارے قد
فرماتے ہیں ہم کو ان سے کسی بتلائی کی امید کیونکر ہو اور ان کو ہم جیسے جانا باز عاشق کی قد
ہو تو کیونکر ہو جب وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں اور ہم سے اپنے دل کا کوئی مدعا بھی نہ کہیں اور سہا سہا

کا موقع بھی نہ دیں۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا نہ مانے دیدہ دیدار جو تو کیونکر ہو
 فرماتے ہیں بہار یہ گمان غلط نہ تھا کہ ان کے خط سے ہمارے دل کو تسلی ہو جائے گی ہمیشہ دنیا
 میں ایسا ہوتا ہے کہ معشوق کی تحریر سے عاشق کی بیباکی کم ہو جایا کرتی ہے مگر یہاں ٹھیک ہی سے
 دیدہ دیدار طلب نے دل مضطر سے بھی زیادہ پاؤں پھیلانے وہ کجغت کسی طرح اسکے خط سے بہتا ہی
 نہیں اور یہی صد کئے جاتا ہے کہیں حق اس کا دیدار ہی دیکھو لگا۔ البتہ تو کیونکر ہو۔

بتاؤ اس کی حشرہ دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگ جاں میں فرد تو کیونکر ہو
 فرماتے ہیں۔ اسے حضرت ناصح آپ کا یہ ارشاد کہ تو سیلاب نہ ہو اور صبر کر میرے سر آنکھوں
 مگر ذرا اس ظالم کی ہلکوں کو دیکھ کر فرماتے کہ ایسے فتنہ جہل میں جھکے ہوئے ہوں تو صبر قرار کیونکر ہو
 مجھے جنوں نہیں غالت لے قبول حصو۔ فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو
 فرماتے ہیں اے غالب میں کچھ دیوانہ تو نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ بے قرار اور پریشان رہوں۔

قبول حضور کے حضور سے مراد اہل سبحانی بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر بادشاہ آفریدی ہیں یہ مصرعہ
 ثانی ان کا ہے (فراق یار میں تسکین کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ تسکین ہو تو کیونکر ہو)
 کسی کو دیکھ کے دل کوئی تو اسچ فتنہ کیوں نہ ہو جب دل ہی سینہ میں پھر منہ میں ان کیوں نہ ہو
 فرماتے ہیں کسی پر عاشق ہو کر فردا دنیاں کرتے رہنا سنانی شان عشق ہے۔ عاشق کو غائب
 رہنا چاہئے۔ گویا پردہ دار ہی عشق شان عاشقی ہے جب دل سینہ میں نہ ہو اور وہ کسی کو دیدیا جائے
 تو لازم ہے کہ زبان بھی منہ میں نہ ہو۔ اسکو بھی کاٹ کر پھینک دینا چاہئے یا کیل دینا مناسب ہے
 کیا خوب مطلع فرمایا ہے۔

وہ اپنی نو چھوڑ گئے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں سبک سرنیکے کیا پوچھیں کہ ہرے سر گراں کیوں ہو
 ہر شعر کا مضمون نثر کے فقرات میں بھی اس ہرستی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا جس طرح
 میرزا صاحب نے ان مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ قادر الکلامی کی حد ہو گئی۔ فرماتے ہیں اپنے دھڑلے رن

لی عدوت نہ چھوڑینگے۔ ہم اپنی خود داری کی وضع کیوں ترک کریں بھتیہ بن کر ان سے کیا
بچھیں کہ تم ہم سے آزر وہ کیوں ہو۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو نہ لائے تا جب غم کی وہ سیرا راز داں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ راز عشق ہم نے تو چھپا لیا تھا۔ مگر ہمارے غمخوار کی جیتا بیوں نے اس کو ظاہر کر دیا
اس محبت کو آگ لگے جس کی وجہ سے ہمارے غمخوار ہماری مصیبتوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ جو بچہ غم کی آگ
نہ لائے وہ کینفت ہمارا راز داں ہی کیوں بنے۔ اداسے مطلب میں بلاغت ختم ہو گئی۔

وفا کسی کہاں کا عشق جب سر پہنٹو یا پھرا تو پھر اسے سنگدل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ وفاداری کسی اور عشق و محبت کیا جب سر پہنٹو کر مر جائے ہی کی ٹھکان لی تو

پھر نہ کورہ بالا دونوں باتوں کا پاس اور خیال کیا اور جب سر پہنٹو کر مر جانے کی تجویز دل میں

قرار پائی چکی۔ تو پھر اسے سنگدل تیرے سنگ آستان کی کیا احتیاج ہے۔ یہ نہیں اور کسی پھر سے

سر پہنٹو لیں گے جو اہر کے ٹکڑے ہیں الفاظ نہیں ہیں۔

قفس میں مجھ سے رو داو چمن کہتے نہ دھرم گرجی جپ کل بجلی وہ میرا آشیان کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ اسے ہدم۔ یعنی اسے بھینٹ دے تو آج ہی گرفتار ہو گھبرا سکتا ہے۔ آہا ہے اور میں

بہت دنوں سے اس قفس میں ہوں۔ تو مجھے یہ قوت دے کہ چمن کی کیا حالت ہے اور تو اس کے

بیان کرنے میں جھجکا کیوں ہے۔ صاف صاف کہہ۔ رو داو چمن بیان کر دے۔ کل جس آشیانہ

پر بجلی گری ہے وہ شاید میرا آشیانہ ہو۔ تو اس کے بیان کرنے میں پس دیش نہ کر۔ اب بلیغ

شعر اور پھر اس زمین میں میرزا کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دلہن نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ کہ جب دلہن نہیں تم ہو تو آنکھوں سے بنانا کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہ تو تم کہہ نہیں سکتے کہ ہم دلہن نہیں

ہیں۔ مگر ہم کو یہ بتاؤ کہ جب دل میں تم ہی تم ہو اور کوئی دوسرا نہیں ہے تو پھر آنکھوں سے

پوشیدہ کیوں ہو جس طرح دل میں رہتے ہو۔ اسی طرح آنکھوں کے سامنے بھی رہا کرو۔

غلط ہے جذب لکھ شکرہ دیکھ جویم کسکا؟
 نہ کھینچو گر تم اپنے کو کش درمیان کیوں
 فرماتے ہیں۔ تم جو مجھ سے میرے جذبہ دل کی شکایت کرتے ہو کہ یہ ہم کو اپنی طرف کھینچتا ہے غلط
 ہے۔ خیال کر کے دیکھو اس میں تصور کس کا ہے یعنی میرا تمہارا اگر تم مجھ سے نہ کھینچو تو آپس میں
 کشاکش کیوں ہو مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے کھینچو۔ میرا جذبہ دل تم کو کھینچتا ہے۔ باہم کشاکش
 کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی فغانہ ویرانی کو کیا کم ہے
 ہوئے تم دوست جس دشمن اسکا آسمان کیوں ہو
 فرماتے ہیں۔ یہ فتنہ یعنی تمہارا دوست ہونا فغانہ ویرانی کے لئے کافی ہے۔ تم جس کے دوست
 ہو آسمان اس شخص کا دشمن کیوں ہو یعنی تمہاری دوستی اس کے برباد کر دینے کے لئے ہر پہلو
 سے کافی ہے آسمان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ بھی دشمنوں میں پانپانا نام کھوائے۔

یہی ہے آزمانا تو تانا کسکو کہتے ہیں
 علیہ کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو
 فرماتے ہیں جب تم ہمیشہ کے واسطے دشمن کے ہوئے اور اس کے عمر بھر نباہ دینے کا وعدہ کر چکے تو پھر
 میرے عشق و محبت اور فدا و مروت کا امتحان کیوں لیتے ہو تم میری آزمائش تو نہیں کرتے بلکہ ظلم کرتے ہو
 کہا تم نے کہ کیوں موغیر کے ملنے میں رسوائی
 بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو
 فرماتے ہیں تم نے جو یہ کہا کہ غیر سے ملنے میں۔ بدنامی و رسوائی کیوں ہو کیا وجہ ہے بجا کہتے
 ہو سچ کہتے ہو پھر دوبارہ تو کہو کہ ہاں رسوائی کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رسوائی تو ضرور ہوگی تمہاری
 خاطر سے کہو تو کہہ دوں کہ ہاں غیر سے ملنا رسوائی کا موجب نہیں ہے۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غائب
 ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہربان کیوں ہو
 میرزا صاحب نے یہ سادی غزل مرصع لکھی ہے۔ ایک ایک شعر کا جواب نہیں ہے اور مقطع سونے
 پر سہاگہ کا کام دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اسے غالب تو انتہا کے موقع پر طعنہ دے کر اپنا کام نکالا
 چاہتا ہے اپنے دل میں یہ تو سمجھ کہ وہ تیرے بے مہر کہنے سے تجھ پر مہربان کیوں ہو۔ خوبی اس مقطع
 پر رکھی گئی ہے کہ مشوق کی عادت کو نئی شوخی کے ساتھ بیان کیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ

کہنے کے خلاف کیا کرتا ہے۔ اور یہ بات سمجھ کر اس کو نامہبران کہاہے کہ وہ اپنی تدبیر ضد کے موافق
مہربان ہو جائے یعنی جو اس سے کہا جاتا ہے وہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

سب سے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور بھڑباں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں مجھ کو اپنے دوستوں، بھوٹنوں، ہمسائیوں، ہمدیوں، ہمنہوں سے ملنے بیچ و مل
پہنچے ہیں کہ اب میں اپنے مقام پر جا کر رہنا چاہتا ہوں کہ جہاں یہ سب ذات شریف نہ ہوں۔

بے در و دیوار سا ایک گھر بنانا چاہئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسبان کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں کسی میدان میں لکڑیاں کھڑی کر کے ایک چھپر ڈال لینا چاہئے جو گھر کا بھی کام دے

اور اس میں در و دیوار بھی نہ ہوں۔ دروازہ نہ ہو گا تو پاسبان کی کیا احتجاج رہیگی اور دیوار نہ ہو گی تو کوئی

ہمسایہ میں آکر کیونکر رہیگا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی سے مل جول نہ رکھا جائے تو بیچ نہ پہنچے گا۔

پڑے گریہ کر تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں۔ ایسے غیر آباد مقام پر نصیب دشمنان اگر بیمار پڑ جائے تو ان دشمنوں میں سے

کہ جن سے بیچ پہنچے ہیں کوئی تیمار دار نہ کرے اور اگر خدا نخواستہ مر جائے تو ان ظالم دوستوں میں

سے جنہوں نے تکلیفیں دی ہیں۔ ہزم ماتم میں نوحہ خواں کوئی نہ ہوگا۔

(ردیف آہو)

از مہر تا بہ درہ دل و دل ہے آئینہ طوطی گوشش حیرت کے مقابل ہے آئینہ

فرماتے ہیں۔ مہر سے درہ تک عالم میں خج و رخ اور دل و دل آپس میں آئینہ ہیں۔ اس کو

اس میں اور اس کو اس میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سارا عالم متحد ہے وجود

واحد ہے اور ایک ذات کو دوسری ذات سے غیریت نہیں ہے۔ یا اس میں اپنے کو اسی طرح دیکھتا

ہے جس طرح آئینہ میں کوئی اپنی صورت دیکھتے ہیں۔ جب یہ حال ہے تو طوطی شش حیرت میں سے جس طرح

متہ کرے آئینہ اس کے سامنے موجود ہے۔ طوطی کی مثال آئینہ سے استعارہ بنا لکھی گئی ہے۔ مراد اس

بیان سے وہ صوفی شخص ہے جس کو یہ اتحاد باہمی دکھائی دیتا ہے اور وجد و حال کی حالت میں
نعرہ انا الحق بلند کرتا رہتا ہے۔

ہے سبزہ زار ہر درو دیوار غم کدہ جسکی بیماریہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھے
فراتے ہیں میرے غمکدہ کے درو دیوار ایسے منہدم ہو گئے ہیں۔ جن پر برسات کے موسم
میں ہری ہری گھاس اُگ کر سبزہ زار کا سماں دکھاتی ہے جس گھر کی بیماریہ ہو۔ یعنی ایسا اجاڑ
ہو گیا ہو اس کی خزاں کا حال نہ پوچھو کہ وہ کس قیامت کی ہوگی۔

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے دشواری رہ و ستم بھریاں نہ پوچھے
فراتے ہیں۔ راہ کی دشواریاں اور بھریوں کے ستم کا حال مجھ سے نہ پوچھو وہ اس حد
نہ پہنچ گیا ہے کہ عبور ہو کر میں نے یہ راہ کر لیا ہے کہ اب بیکسی اور تہائی کی حسرت اٹھانی چاہئے
اور ایسے دشوار گزار راستہ میں اس قدر ظالموں کا ساتھ کھٹیک نہیں ہے۔

صد جلوہ رو برو ہے جو مٹر گاں اٹھائے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائے
فراتے ہیں۔ سو جلوہ رو برو ہیں۔ اگر آٹھ اٹھا کر دیکھئے یہ طاقت کہاں ہے کہ دید کا احساں
اٹھائے بطلت ہے کہ اس کی قدرت کنگو ناگوں تماشے نظر آ رہے ہیں۔ یہ کس میں طاقت ہے
کہ ان سب کیفیتوں کو دیکھے اور سمجھے۔ آدمی دیکھتے دیکھتے تھک جاتا ہے اور اس کی قدرت
کی نیزنگیاں ختم نہیں ہوتیں۔

بے سنگ برات معاش جنون عشق یعنی ہنوز منتِ طغلاں اٹھائے
برات تنخواہ کی چٹھی کو کہتے ہیں۔ فراتے ہیں۔ پیھروں پر معاش جنون عشق کی تنخواہوں کی
چٹھیاں لکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے مناسب کا بھی اور کچھ دن پھر مارنے والے لڑکوں کا احساں
اٹھاتے رہنا چاہئے بطلت ہے کہ جنون عشق میں لڑکوں کے ہاتھ سے پھر کھائے جہائیں
دیوارِ منتِ مزدور سے ہے تم اسے خامناں خراب نہ احساں اٹھائے

فرماتے ہیں۔ حسان اس قدر بوجھل چیز ہے کہ دیوار میں بھی اس کے اٹھا لینے کی طاقت نہیں ہے وہ بھی مزدود کے بار احسان سے خم ہو گئی ہے۔ اسے خانہ خراب دنیا میں بکر کسی کا احسان نہ اٹھا اور دیوار کو دیکھ کر عبرت حاصل کر کہ ایسی مضبوط چیز بھی ایسے سنگین بار کا اٹھانے کے مستعد نہ ہو یا میرے زخم رشک کو سوانہ کیجے یا پردہ جہنم پہناں اٹھائے

فرماتے ہیں رشک رقیب کے زخم جو میرے دل کے اندر بیٹھ گئے ہیں اور وہ خند و زن میں یا تو ان زخموں کو سوانہ کیجے اور یا ایسا کیجے کہ پردہ میں رقیب کے ساتھ چھپ چھپ کر سکرانا چھوڑ دیجے۔ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے شعر آنکھ کو میخانہ اور ابرو کو محراب مسجد سے تشبیہ دیکر کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اسے قبلہ حاجات دیا اشارہ و فطایح یا تابد کی طرف ہے (مسجد کے برابر میخانہ ضرور بنانا چاہئے جس طرح بھوں کے پاس آنکھ اللہ تعالیٰ نے بنا دی۔

عاشق ہوئے میں آپ بھی اک اور شخص مجھ آہستہ کی کچھ تو مکافات چاہئے فرماتے ہیں ہم جس طرح آپ پر عاشق ہیں اسی طرح آپ بھی ایک اور شخص پر عاشق ہو گئے ہیں اور یہ راز ہم پر کھل گیا ہے آپ نے اپنے عاشقوں پر بہت سے ظلم روا اور تاروا کئے ہیں۔ آخر ان کا بدلہ کچھ تو آپ کو بھی خدا کی طرف سے ملنا چاہئے۔

دے داداے فلک دل حسرت پرست ہاں کچھ نہ کچھ ملا فی مافات چاہئے فرماتے ہیں۔ اے فلک بہت سی حسرتیں تو نے خاک میں ملا دی ہیں۔ اب تو ان حسرتوں کی ہم کو داد ملنی چاہئے۔ میرا دل حسرت پرست بہت مخموم ہو گیا ہے اور کوئی آرزو تو جاری بھی پوری کر دے کہ جس سے گذری ہو لی باتوں کی تلافی ہو جائے۔

سیکھے ہیں مرے خوں کیلئے ہم مصدوی تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے فرماتے ہیں تو بصورت لوگوں سے واسطے ہم نے تصویر کھینچی لیگی ہے یہ یوں سمجھو۔ جو بے کوش طبعی سیکھی ہے عشق توں کی ملاقات کے لئے کوئی ذریعہ ہونا چاہئے۔

غزل

مے سے غرض نشا کا ہے کس سیاہ کو اک گونہ بخود می بجھے دن رات چاہئے
 فرماتے ہیں۔ مے پینے سے سیری بغرض نہیں ہے کہ نشا دوسرور حاصل کیوں بلکہ میں تو ریخ
 وغم فراموش کرنے کی غرض سے شراب پیتا ہوں۔ مجھ کو دن رات اک تھوڑی سی بخود می درکار ہے
 ہے رنگ لالہ و گل و نسرتل جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے
 فرماتے ہیں۔ لالہ و گل و نسرتل کا رنگ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے یعنی لالہ بہت سے
 رنگوں کا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ہر رنگ کے پھول پر داغ ہوتا ہے۔ گل گلاب کے پھول کو کہتے
 ہیں۔ اس میں بھی بہت سے رنگ ہیں۔ نسرتل بیشتر سفید ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ رنگوں یا
 صورتوں کے اختلافات سے غرض نہیں ہے۔ ہر رنگ میں بہار کا ثابت ہونا لازمی ہے۔ بہار کے
 یہاں ظہور ذات باری تعالیٰ کا خیال مقصود ہے۔ شعر نفوت میں ہے اور بہت خوب ہے۔

سر پائے خم پہ چاہئے ہنگام بخود می دسوسے قبلہ وقت سنا جارتہ پائے فخر
 فرماتے ہیں۔ بخود می کے وقت۔ سر کو پائے خم پر ہونا لازمی ہے اور سنا جارتہ کے
 وقت منہ کو قبلہ کی طرف ہونا لازمی ہے۔
 یعنی بحسب گردش پیمانہ صفات عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہئے
 فرماتے ہیں بحسب منشا گردش پیمانہ صفات۔ عارف کو ہمیشہ مے ذات سے مست و
 سرشار رہنا چاہئے۔

نشو و نما ہے اہل سے غالب فروع کو خاموشی ہی سے نکلے ہے جواب چاہئے
 فرماتے ہیں اہل سے یعنی جرٹے بنتوں کا بڑھنا اور بچھونا پھلتا ہے۔ اسے غالب۔ جو بات
 انسان کے منہ سے نکلتی ہے وہ خاموشی کے بعد نکلتی ہے پہلے آدمی اس کا مطلب سوچ بھیجتا ہے
 جب زبان سے کسی بات کو نکالا کرتا ہے۔ اس سارے قطع میں انہی اقوت کے خیالات کو باندھا
 ہے اور ان شعروں میں یہ تین باتیں بیان کی ہیں پہلی بات یہ ہے کہ تمام عالم اجنام کا ہے۔ یہ عجم

شکل سے منزع ہے اور اس عالم ظہور سے باہر ہے جس طرح درخت کی شاخیں خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں لیکن سب کی جڑ سے پھوٹ کر نکلی ہیں۔ لہذا ان کی جڑ پوشیدہ ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ہر بات خاموشی سے نکلی ہے یعنی اس کے معنی اول ذہن میں گذرتے ہیں۔ بعد ازاں اس سے بات پسہا ہوتی ہے اور خود ذہنی پوشیدہ ہیں۔ تیسری مثال یہ ہے کہ چمن میں بہت سے رنگوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں، وہ ہر رنگ کے پھول سے بہا کا وجود ثابت ہے اور خود آنکھوں سے نہایت اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رنگ برنگ کے پھولوں سے یہ بقیہ حاصل کرنا چاہئے کہ ہر رنگ میں انسان اپنے مبدع کو ثابت کرتا ہے۔ کبھی نقشے میں سرشار ہے کبھی زیادہ شب بیدار ہے اسکا یہ مطلب ہے کہ دنیا کے یہ سارے رنگ ذات کی صفات ہیں، اور یہ ساری صفات اپنے اپنے وقت پر نما ہ

ہو کر وہ ذات کی شہادت دیتے ہیں۔

ل۔ بساطِ معجز میں تھا ایک دل ایک قطرہ خون بھی سوہتا ہے باندا چکیدن سبزنگوں بھی

فرماتے ہیں۔ بساطِ معجز میں ایک دل تھا اور وہ بھی نہت ایک خون کا قطرہ تھا اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی۔ مگر ٹپکنے کے انداز سے وہ کجنت بھی سبزنگوں رہتا ہے۔ خبر نہیں کہ وقت ٹپک جائے انسان کے پہلو میں دل ایک رو سے کے ذریعہ سے ٹپک رہا ہے اور اس کی وہی موت ہے جو ٹپکتے وقت قطرہ خون کی موتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے عشق کا سرا یہ جو کچھ تھا وہ ایک دل تھا۔ اب رنج و غم بہتے بہتے اس کی بھی یہ حالت ہو گئی ہے کہ خون کے قطرہ کی طرح ہر وقت ٹپک جانے پر آمادہ رہتا ہے۔

سے اس شوق سے آزر وہ ہم چند تکلف سے لکھتے بساطِ معجز میں تھا ایک انداز جنوں بھی

فرماتے ہیں۔ اس شوق سے تھوڑے دن کا تناؤ اور تھک سے آزر وہ خاطر ہے۔ لہذا وہ پاس کیا وہ بھی ایک انداز جنوں تھا۔ پھر ہر دم میں تکلف کے معنی بناوٹ کے ہیں اور دوسرے عرصہ میں شرم و لحاظ کے۔ خیال مگر کب تک اس دل آزر وہ کو بخشنے میرے وہ امتیاز میں سے ایک صیدِ بے یوں بھی فرماتے ہیں۔ ہمارا آزر وہ دشمنانِ دل مر جانے کے خیال سے بھی کچھ خوش نہیں ہوتا ہماری تمنا

اس قطع میں مددنی پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی مغل نامز میں رعب حسن سے بات کرتے ہوئے یہاں کو پختا ہے اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ زبان سے ادا نہیں ہوتا۔ اس مطلب کو یہ راز صاحب نے بوں فرمایا ہے کہ سخن خوشامد طلب ہو گیا ہے اس لئے ہمارے ہوتوں سے باز رہا۔ روئے کر یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی خوشامد کریں۔ ایسے خوشامد طلبوں سے ہم تنگ آ گئے۔ دوسرے معنی میں کہ معشوقوں کو خوشامد طلب کہا گیا ہے اور ان کی جاں بجا خوشامد کرنے کی وجہ سے سخن ہمارے لبوں سے پیرا ہو گیا ہے۔

غزل ہے دو برقعہ وجہ پریشانی صہبہ یکار لگ دو خم مے مہکے لبوں سے
فرماتے ہیں صہبہ تو باعث دل بستگی ہے اسکو پریشان کرنا ذرا نہیں ہے اور دو برقعہ وجہ پریشانی ہے یعنی تھوڑی تھوڑی شراب نکال کر جو لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے یہ بظاہر شراب کے پر گنہ در پریشان ہونیکا سبب ہے ایک بار شراب کے شے کو میرے منہ سے لگا دو کہ میں دگدگا کر سارا نکالی جاؤں۔ اس صورت میں شراب ایک ہی جگہ رہے گی جگہ جگہ نہ پھیلے گی اپنے مطلب کی بات اس غزل سے اور دلیل کے ساتھ بیان کرنی لطف سے خالی نہیں۔

رندان در میکدہ گستاخ ہیں زابد زہنار نہ ہوتا طرف ان بے ادبوں کے
فرماتے ہیں۔ اے حضرت زابد یہ رندوں کی بھیر جو درمیانہ پر جمع ہو گئی ہے یہ لوگ تنہا نستان اور حاضر جواب ہیں۔ خبردار آپ ان لوگوں کے منہ نہ لگئے یعنی ان پاک شہدوں کے سامنے شراب کی خدمت کا بیان نہ فرمایا گیا۔

بیداد و فادیکھ کے جاتی رہی آخر ہر چہ مزاجان کو تھار بٹ لبوں سے
فرماتے ہیں۔ باوجود کہ میری جان میرے لبوں کی قدیم آشنا تھی اور دل سے بہت ہی محبت رکھتی تھی ہمیشہ ہونٹوں پر رہا کرتی تھی لیکن وفا کے ظلم دیکھ کر اس نے بیوفائی اختیار کرنا اور ہمیشہ کے لئے ان دوستوں یعنی لبوں سے رخصت ہو گئی۔

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ ہے جا سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ ہمارے معشوق نے یہ وضع اختیار کر لی ہے کہ اگر کوئی اس کے سامنے ہمارا ذکر جھگڑ دیتا ہے تو وہ اس کو منع نہیں کرتا کہ تو میرے سامنے یہ ذکر نہ کر۔ چونکہ منع کرنے میں ایک قسم کی بے مروتی پائی جاتی ہے۔ اس لئے وہ اس بات سے گریز کرتا ہے اور خود بھی ہمارا ذکر کسی کسی کے سامنے نہیں کرتا اور ان دونوں باتوں سے اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم کو اس سے شکایت کرنے کا بھی موقع نہ ملے۔

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو وہ سن کے بلا لیں یہ اجازت نہیں کرتے کیا خوب قطع فرمایا ہے اور الفاظ نے کس قدر براعت کے پہلو اختیار کر لئے ہیں کہ تعریف میں ہو سکتی مطلب یہ ہے کہ اے غالب تیرا حال کسی خاص موقع پر اپنی جان پر کھیل کر ہم ان کو سن دینگے یعنی آدھ سخن یا کوئی بات کا پہلو نکال کر تیرا ذکر ان کے گوشگزار کر دینگے لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتے کہ وہ تیری محبت یا مصیبتوں کا حال سن کر تجھ کو اپنی بزم ناز میں بامیابی کی اجازت بھی فرمادیں۔

گھر میں بھٹا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر ہوئے فرماتے ہیں۔ اگرچہ غم عشق نے ہم کو برباد کر دیا لیکن حسرت تعمیر کو وہ بھی غارت نہ کر سکا اور یہی حسرت تعمیر ہمارے گھر کی سب سے بڑی پونجی تھی۔ اس کے سوا ہمارے چھوٹی بڑے میں کچھ بچا ہی نہیں کہ جب کو غم عشق برباد کرتا۔

غم دنیا سے گری پائی بھی فرصت سراٹھائی نکلا نکلا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی غزل یعنی جب غم دنیا سے سراٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو وہ اٹھاتے ہی آسمان پر نظر ہائیرتی ہے اور چونکہ وہ بے قیامیشہ ہے اسلئے دیکھتے ہی تو یہ آجاتا ہے اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں (اذا یادگار غالب)

کھیلنے کی طرح مضمون سرگرم کو بکلیا یا رہ قسم کھائی جاس کا فرنے کا غم کے جلا نیکی فرماتے ہیں دو صورتوں سے میرے غم کا مضمون اس پر ظاہر ہو سکتا تھا کیا اس طرح کہ

وہ میرے خط کو کھول کر پڑھتا تو اس کے مطالب سے آگاہ اور خبردار ہو جاتا۔ اس بات کی تو اس کا فرسے۔ یہی نہیں وہ کیوں میرا خط کھولے اور پڑھے۔ دوسری یہ صورت تھی کہ میرے خط کو غفہ میں آکر چلا دیتا اور اس وقت میرے سوچ و عشق اور آتش فراق سے آگاہ ہو جاتا مگر اس نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھائی ہے یہ بھی اسید قطع ہو گئی۔

لپٹا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آسان ہے دلے مشکل ہے حکمت میں سوزِ غم چھپا نیکی
فرماتے ہیں کہ جہنم میں شعلہ آتش کو لپیٹ کر باندھ لینا جو ناممکن ہے بلکہ سمجھا جاتا

ہے۔ یہ نسبت اس کے کہ دل میں سوزِ غم کو پوشیدہ رکھا جائے مطلب یہ ہے کہ دل عاشق پر نیاں سے بھی زیادہ نازک ہے اور سوزِ غم عشق شعلہ آتش سے بھی زیادہ سرکش ہے۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا کھٹا اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوقی بہانہ کی
فرماتے ہیں۔ ان کو اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا منظور تھا۔ اس کا اظہار غیروں کے روبرو صاف

صاف تو وہ نہ کر سکے۔ یہ کہہ دیا کہ دریا کی سیہ کو جاتے ہیں۔ گل و لالہ کا تماشا نہ دیکھینگے۔ اس حیلے سے اپنے زخمیوں کو دیکھ تو لیا مگر گل و لالہ کی سیر اور زخمیوں کا دیکھنا سادی درجہ میں ان کے نیاں کے موافق ثابت ہوا اور یہی بہانہ کی شوخی تھی۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا تر آنا نہ تھا ظالم مگر متبید جانے کی
فرماتے ہیں۔ یہ ہماری سادگی یعنی ہماری حماقت تھی کہ میرے التفاتِ ناز پر فریفتہ ہو گئے

ہم سے گھر میں تیرا آنا آنا نہ تھا بلکہ جانے کی بہتید مطلب یہ ہے کہ اسی غرض سے آیات کہ تھوڑی دیر میں واپس جانے اور ہم تیرے فراق میں مہینوں تڑپتے رہیں۔

لکڑ کو بھڑاوت کا تحمل کر نہیں سکتی مری طاقت کہ ضامن تھی تو نیکے ناز انہی کی
فرماتے ہیں۔ اب ہم ایسے کمزور ہو گئے ہیں کہ باریک وادش بھی اٹھاتے ہوئے پچھتے جاتے

ہیں ورنہ ہم تھے کہ جن کی ناز برداری کی طاقت رکھتے تھے گویا زمانے کے حوادث و اثبات جن کے ناز و انداز سے بوجہ بہا میں کم ہیں۔

کہوں کیا خوبی اوضاع بنائے نہاں غیب
بدی کی اسنے جس سے ہم نے کی تھی بارہائی
اس تانیہ کو معمول کہتے ہیں سائیک دو شعروں میں ایسا قافیہ باندھنا جس کلام سمجھا جاتا ہے
فرماتے ہیں۔ بنائے زبان کی کچھ ایسی وضع ہو گئی ہے کہ ہم ان کی خوبی بیان ہی نہیں کر سکتے
ہم نے جس سے بارہائی کی تھی اسی نے ہمارے ساتھ بُرائی کی اوپر کے مصرعہ میں خوبی کا لفظ
طنز استعمال ہوا ہے جو بُرائی کے معنی دیتا ہے۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی سامی
ڈوبی ہوئی سامی زمینداروں کی اصطلاح میں اس کا شکار کہتے ہیں جس کو کسی
افتادگی کی وجہ سے نقصان پہنچا ہو اور مالگذا رہی کار وہ یہ مہاجن کا قرضہ اس کے ذمہ ایسا باقی
ہو جس کی وصولیابی کی امید قطع ہو گئی ہو اور جواریوں کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں
جو ہمیشہ ہارتا رہتا ہو۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دل جوش گریہ میں اثر گریہ کو اپنی طبیعت سے
کھو بیٹھتا ہے۔ اثر گریہ گویا حاصل گریہ ہے مطلب یہ ہے کہ اسے آرزو تو گریہ پر مبرور کر کے اپنی
مردولی حاصل کرنی چاہتی ہے اور گریہ کی بے اثری دیکھ کر ڈوبی ہے تیرے حیرت کوئی کام نکلتا معلوم نہیں ہوتا
اس مجمع کی طرح سے جسکو کوئی کچھا ہے میں بھی چلے ہوں میں تار داغ نامتامی
فرماتے ہیں۔ میں داغ نامتامی ہوں یعنی مجھ کو اپنے نامتام رہ جائے گا داغ اس شمع کی طرح
ہے جسکو کسی قدر جل چکنے کے بعد کوئی شخص ارادتا گل کر دے اور وہ نامتام اور نامکام رہ جائے۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے جس میں کہ ایک جیسے مورا آسمان ہے غری
فرماتے ہیں ہم ستم کے مارے ہوؤں کا جہاں ایسا چھوٹا سا ہے کہ اس جہان کا آسمان صرف
ایک چوٹی کا اندھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مظلوم آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے واسطے دنیا سمت کربت
ہی تنگ دائرہ میں آگئی ہے۔ نہ میرا کوئی معاون ہے نہ فریاد رس
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتو سے آفتاب کے ذرے ہیں جہاں ہے
فرماتے ہیں۔ ساری کائنات نے مجھ کو اپنا مبدؤ اصل قرار دے لینے کے بعد بظہر کے

تھکائے لازمی سے قیری جانب اپنی ساری توجہ مبذول کر دینے کے بعد رجوع کی ہے
جس طرح آفتاب کی روشنی سے خاک کے ذروں میں جان پڑ جاتی ہے، فورات کی حرکت کو
جان پڑ جانے سے محمول کیا ہے جس میں عیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔

ہمارا نگہ ہے یہ سیلی خارا سے ناز نگہ فافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

فراتے ہیں حقیقت حال تو یہ ہے کہ میرے شیشے دل کو سنگ خارا کی چوٹ یعنی زمانے کی
آفت لال کر دیا ہے جبکہ آخر میری آنکھوں کو سرخ رکھتا ہے آنکھوں کی مٹھی اکثر نشاء کی وجہ
سببی ہوا کرتی ہے اس لئے ناواقف لوگوں کو یہ گمان ہے کہ میرا شیشہ دل شراب کے لہریز ہے
نہ انکے یہ بات نہیں ہے۔

کرا اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

فراتے ہیں قیہوں کے دل میں باری طرح سوز عشق کی آگ نہیں ہے اور اسی لئے معشوق
نے قیہوں کے دل میں جگہ کر لی ہے، ٹھنڈے مکان میں رہنا ہر شخص پسند کرتا ہے اور جس دل
میں اشتیاق نہیں ہے وہ ضرور سرد و خفا کا کام دیتا۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوس نہیں دیا بس چنپ ہو رہے ہیں منہ میں زبان ہے

ہمارے بھی منہ میں زبان ہے اس میں وہ معنی رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس
ایسے ثبوت ہیں اگر بوسنے پر آئے تو تم کو قائل کر دینگے اور دوسرے شوٹ معنی یہ ہیں کہ
ہم زبان سے چل کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ دیا ہے یا نہیں (ازراؤ کار غالب)

بیٹھا ہے جو کہ یہ دیوار یا ر میں فرمانروائے کشور ہندوستان ہے

فرماتے ہیں جو شوق سایہ دیوار میں بیٹھا ہوا ہے وہ گویا کشور ہندوستان کا بادشاہ
ہے۔ ہندوستان کی تفصیل باعتبار رنگ سایہ کے ہے یعنی سایہ جی کالا ہوتا ہے اور ہندوستان
کا لالاک سمجھا دیتا ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس کہوں کدواغ جگر کا نشان ہے

یہ مضمون بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ فرماتے ہیں۔ جھوم غم نے میرے جگر پر داغ ڈال دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس داغ نے جگر کو قوتش جان فرمایا۔ داغ ہی داغ باقی رہ گیا جگر کی ہستی شلگی اب اگر کسی سے یہ کہتا ہوں کہ کبھی میں بھی جگر رکھتا تھا اور اب ماکس کی نشانی یعنی داغ میرے سینہ میں موجود ہے تو کسی شخص کو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا۔

ہے بارے اہم و وفا داری استقدر غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے فرماتے ہیں ہماری وفاداری پر اسکو ایسا بھروسہ اور یقین کامل ہے کہ باوجود نامہربان ہونے

اور ہم کر لے کے کبھی اسکو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ غائب ہماری بے رخی سے ترک محبت کرے گا۔ درد سے میرے ہتھکڑی بھاری ہائے کیا ہو لی ظالم تری غفلت شعلہ تری ہائے

غزل

یہ ساری غزل قطعہ بند اور عشق کا مرثیہ ہے اسکو نسخ میں دیکھ کر فرماتے ہیں کہ میں تجھ کو اس حالت میں دیکھ کر درد مند ہو رہا ہوں اب تو اس حال میں بھی میرا بچ و غم گوارہ نہیں کرتا اور میرے تڑپنے سے تو خود بھی بیقرار ہو رہا ہے۔ تیری وہ غفلت شعاریاں کیا ہو گئیں یہ میری جان پر ہنسی تھی اور تو میری بات بھی نہ پوچھتا تھا۔

تیرے لہجے میں نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ تو نے پھر کیوں کی تھی میری نمکاری ہائے فرماتے ہیں اگر تیرے دل میں غم کی تختیاں اٹھانے کی برداشت نہ تھی تو تو نے میری نمکاری کا دھوئی ہی کیوں کیا تھا یعنی مجھ سے بگٹ لٹا ہی نہ تھا اسی طرح نا آشنا رہتا۔

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال دہشتی اپنی تھی میری دوستداری ہائے فرماتے ہیں۔ کاش تو میرا غمخوار نہ بنا ہوتا اور یہ سب سناکھ غمخواری کرنے کا خیال تجھے پیدا نہ

ہوتا تو نے مجھ سے غمخواری کر کے اپنے کو رسوائے خلق کر لیا اور انجام کار رسوائی کے فوٹے اپنی جان دیدی عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا عمر بھر تو نہیں ہے پائنداری ہائے

فرماتے ہیں۔ تو نے تمام عمر وفا داری کے ساتھ ملے رہنے کا مجھ سے عہد بھی کیا تو کب تیری عمری نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور مجھے تڑپتا ہوا چھوڑ کر تجھ کو دیتا سے جانا پڑا۔

زیر لگتی ہے مجھے آپ ہو زندگی . یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہے
 فرماتے ہیں میرے لئے زندگی کی آپ وہ ہوا نہ ہو کر اثر رکھتی ہے جب اس نے تجھ سے وفائی
 تو یہ بھی ایسی زندگی کو موت سے بہتر سمجھتا ہوں۔

گھٹتے ہیں تیرا جلوہ کو کیا ہو گیسّا خاک چھوٹی ہے تیری لالہ کاری ہے ہائے
 فرماتے ہیں تیری جلوہ افزائی کے وقت تیرے ناز و انداز سے جو پھول جھڑا کرتے تھے
 وہ کیا ہو گئے یا تو وہ نہ تھا یا اب یہ وقت آگیا کہ تیری قبر پر پھول رکھے ہوئے ہیں۔
 شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب ک میں ختم ہے الفت کی تجھ پر وہ داری ہے ہائے
 فرماتے ہیں رسوا ہو جانے کی شرم سے تو زمین کا پیوند ہو گیا اور تو نے خاک کی نقاب اپنے
 چہرہ پر ڈال لی تجھ سے زیادہ دنیا میں محبت کا پردہ پوش کون ہو سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ
 خوف رسوائی سے تو نے اپنے کو ہلاک کر لیا۔

خاک میں نہ توں پہچان محبت مل گئی اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
 فرماتے ہیں تیرے مر جانے سے ناموس چھان محبت خاک میں مل گئی گویا دوستی کی راہ و رسم
 ہی دنیا سے اٹھ گئی یعنی تیرے بعد اب کوئی معشوق وفا دار نہ رہتا ہے پیدا نہ ہوگا۔
 بات ہی تیغ آرزو کا کام سے جاتا رہا دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہے ہائے
 فرماتے ہیں انوس کی جگہ ہے کہ دستِ قاتل بیکار ہو گیا مجھ کو تو یہ آزمود تھی کہ میرے
 دل پر اس کے ہاتھ سے تلواروں کے زخم لگتے وہ آرزو میری پوری نہ ہونے پائی۔ زخم اٹھانے
 کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی مطلب یہ ہے کہ تیرے ناز و انداز کے باعث حسرت و کجواہ
 حاصل نہ کر سکا۔

کس طرح کوائے کوئی شبہائے تار بر شگال ہے نظر تو کردہ آخر شماری ہائے ہائے
 فرماتے ہیں ہم کو تو اس بات کا مزہ اچھا ہوا تھا کہ انتظار کی گھڑیاں اور فراق کی راتیں
 تار سے گن گن کر بسر کیا کرتے تھے۔ اب یہ برسات کی اندھیری راتیں کیونکر ہم سے گئیں گی۔

شہنائے غم کو شب ہائے تار سے تعمیر کیا ہے اور برسات روئے کا استعارہ ہے۔
 گوش مجور پیام چشم محروم جمال ایک دل اسپر یہ نا امید واری ہائے
 فرماتے ہیں کان تو پیام یار کے بھروسے تباہیں اور آنکھیں جمال یار سے محروم ہو گئی ہیں میر

ایک دل پر یہ دوہیتیں نا امید واری کی بلائیں نازل کر رہی ہیں۔
 عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی دوستدار رہ گیا تھا دھن جو کچھ ذوق خواری ہائے
 فرماتے ہیں۔ اے غالب میرے عشق نے ابھی تک وحشت کا رنگ اختیار نہ کیا تھا یعنی ابھی
 میں نے ہرزہ گردی و دہشت نوری نہ کی تھی کہ رسوائی کے شہر سے میرے معشوق نے اپنی جان
 دیدی اور میرے دل میں ذوق خواری اسی طرح رہ گیا۔

گشتگی میں عالم ہستی سے پاس ہے تسکین کو حقے نوید کہ مرنے کی آس ہے
 فرماتے ہیں اپنی گشتگی کی وجہ سے زندگی سے ناامید ہو گیا ہوں اب تسکین کو مبارکباد
 دینی چاہئے کہ موت آجانے کے بعد نفسی گشتگی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

لیتا نہیں مے دل آوارہ کی خبر اب تک جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
 فرماتے ہیں میرا دل میرے اختیار سے باہر ہو کر آوارگی پسند ہو گیا ہے لیکن معشوق کو
 اب تک یہی یقین ہے کہ وہ میرے ہی پاس ہے۔ اسی یقین کے بھروسہ پر وہ میرے دل
 سے بے پرواہ ہو گیا ہے اور اس کی خبر نہیں لیتا ہے۔

کچھ بیان سورت پغم کہاں ملک ہر موم کے بدن پہ زبان پاس ہے
 فرماتے ہیں۔ تپ غم کے چڑھنے سے جو خوشی حاصل ہوئی ہے۔ کہاں شک انس کا
 بیان کروں محقر یہ ہے کہ روٹنگا روٹنگا میرے حیم کا شک گذاری کے واسطے زبان بن گیا۔
 جازے کے بخاریں جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہے وہ عرف حسن سے بیگانہ وفا ہر چند اسکے پاس دل حق شناس ہے
 فرماتے ہیں۔ میرا دل حق شناس تو اسی کے پاس رہا کرتا ہے اور مجھ کو اس بات کا کامل

تینیں ہے کہ اس ظالم کو میرے دل حق شناس نے سم در او دفات بجو بی خبر دار کر دیا ہو کہ۔ مگر
وہ اپنے غم و دشمن یہ کس کی ست ہے یہی وجہ ہے کہ اب تک سم و راہ دفات سے بیگ نہ رہا
پلی جقد رملی شب بہتا ہے شراب اس طغی مزاج کو گرمی ہی اس ہے
فراتیں شب بہتا ہے تر جسد شراب سے آسکی میں نے پلی لی۔ میرا مزاج طغی ہے اور
طغی مزاج والے کو پیا چیریں جیسے سفید ہو کر تکی ہیں۔ شراب کو آتش تہ سے تہیہ کرتے ہیں اور
اس کی گرم مزاجی کا ادنی ثبوت ہے اور شب بہتا ہے جی ٹھنڈی ہو کر تکی ہے اس وہ شب
بہتا ہے میں شراب کا استعمال زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔

ہر اک مکان کو ہے کیسے شرف اسد مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل ادا اس نے
زیاتے ہیں۔ اسے اسد ہر مکان کو کہیں سے شرف حاصل ہوا کرتا ہے جنگل کی آبادی مجنوں
کے دم سے تھی۔ اس کے مرنے کے بعد جنگل ادا اس ہو گیا ہے۔

غزل

گرفتاری سے فائدہ اٹھانے کے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
فراتے ہیں۔ گرفتاری سے یہ فائدہ ہے کہ دل کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اور رازوں
چھپا رہا ہے تو میں اپنی گفتگو سے ہی خوش ہوں۔ یہ بھی خاموشی کے برابر کام دیتی ہے اس نے کہ میری
بات کو ہی سمجھ ہی نہیں سکتا خاموشی اور گفتگو کو مساوات کا درجہ دینا نہایت طبع خیال ہے۔
کس کو توں حسرت اظہار کا گھر دل فرد جمع و فرج زبا نہائے لال ہے
فراتے ہیں۔ یہ اظہار نہ ہان کے گویا نہ ہونے کی گلا منہ ہے میں کس کے آگے جا کر
اس کا رکھڑا روتوں اور دل میرا ایک فرد حساب جس پر جمع و فرج زبا نہائے لال کا حساب
رقم ہے۔ یہ سب کہ حسرت اظہار ان لوگوں سے گلا منہ ہے جو گونگوں کی طرح زبانوں کو منہ
کہتے ہیں مگر میری مصیبتوں کا حال نہیں بوجھتے۔ باوجودیکہ میرے پیارے سے حسرت
اظہار ظاہر ہو رہی ہے۔

کس پر دہیں ہے آئینہ پرواز اے خدا رحمت کہ غم خواہ لب بے سوال ہے

فرماتے ہیں۔ ایندھن تیری رحمت کس پر وہ میں چھپی ہوئی آئینہ بخشش کی جلا کر رہی ہے اور
کیوں پر وہ سے بہ سزئیں آتی اب تو اسے ظاہر ہو جانا چاہئے اس لئے کہ میرا لبے سوال غنہ
خواہ مصیبت ہے مصلحت ہے کہ میرے لبِ حمت کا سوال اس شرم سے نہیں کرتے کہ میں نے
بے انتہا گناہ کئے ہیں میری یہ خاموشی گویا میرے گناہوں کا غدر ہے اس صورت میں انہما رحمت ضروری
ہے ہے خدا بخدا تھو است وہ اور دشمنی اے شوق منقصل یہ تجھے کیا خیال ہے
فرماتے ہیں۔ اے شوق محبت آج اس خیال سے منقصل ہو رہا ہے کہ اس شوق نے تیرے ساتھ
دشمنی پہلی یا برتنے گا۔ ہے ہے خدا تھو است وہ ایسا کیوں کرنے لگا یہ خیال تیرا بالکل غلط ہے۔

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم جان نامتین ہے نہ کہ نواب غزال ہے
یہ شعر منقبت میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ غلامانہ کعبہ کو شک آگین علی کے قدم سے جان تو بینی
غمانہ کعبہ سے جو منقض و برکت تمام دنیا کو پہنچ رہا ہے۔ وہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ
نے غمانہ کعبہ کی دیواروں سے تہوں کو توڑ کر نکالا ہے۔ اگر تبت نہ توڑے جاتے تو اسپر کفار کا قبضہ رہتا
مسلمانوں کو اس سے فیض نہ پہنچتا اور خانہ کعبہ زمین کی نواف ہے۔ نواب غزال نہیں ہے جس میں
مشک ہوتا ہے۔ مشک کے اعتبار سے خانہ کعبہ کو مشکیں لباس نہ سمجھنا چاہئے۔ دوسری خصوصیت
یہ ہے کہ حضرت پیدا بھی خانہ کعبہ میں ہوئے ہیں۔

وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ تھا دریا زمین کو عرق انفعال ہے

فرماتے ہیں۔ میدان دنیا میری صحرا نوردی کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اور اس لئے زمین
عرق انفعال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دریا اور سمندر گویا زمین کے واسطے عرق انفعال کا حکم رکھتے ہیں
ہستی کے مت لمبریں ہیر آجا یو ا عالم تمام حلقہ وام خیال ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسد یہ ساری دنیا صرف خیالی اور اعتباری وجہ دکھتی ہے یہاں اپنے
موجود ہونے کو بخولے سے اپنی ہستی نہ سمجھ لیا یہ سارا عالم حلقہ وام خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔
تم اپنے شکوک کی باتیں کھود کھود کے پوچھو جذبہ کرو سیر دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

فرماتے ہیں قہاری شکایتیں میرے لیے اسی طرح بھی ہوتی ہیں جس طرح وہ لٹھے میں آگ لبی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر تم انہیں کھود کھود کر اور کر یہ کرید کر پوچھو گے تو ان باتوں کا شکایت آمیز اظہار ردی کی آگ کو مشتعل کر دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ دوستوں میں اکثر شکوہ و شکایت سے مناد پیدا ہوتا ہے۔
والا یہ درد و الم ہی تو مختتم ہے کہ آخر نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے
فرماتے ہیں۔ یہ درد و الم کا نتیجہ ہونے والا ہے کہ ایک دن ہم مر جائیں گے اور پھر نہ گریہ سحری باقی رہے گا نہ آہ نیم شبی کا وجود ہو گا۔ اسے دل درد و غم کی حالت کو خیمت سمجھنا چاہئے کہ موت تک یہ سب جاری زندگی بھی ہے۔

عزل

ایک جاحظ غافل کھا کھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہر کا غذ ترے خط کا غلط بردار ہے
غلط بردار اس کا غذا کو کہتے ہیں جس پر سے حرفت یا سانی کن لکٹ وغیرہ سے اڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں دُرُودِ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جس پر سے حرفت خود بخود اڑ جائے۔ کہتے ہیں کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف و قائل کھا کھا سو وہ جی مٹ گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات چکے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے (ازبادگار غالب)

جی تلے ذوق فنا کی ناتمامی مرنے کیوں
ہم نہیں جلتے نفس سرحدِ انتشار ہے
وہ کہتے ہیں ہر سانس سینے کے اندر پتھر اشتعال پیدا کرتا ہے اور یہی اشتعال زندگی کا باعث ہے۔ باوجود اسکے کہ ہر اشتعال میں جسم کا انس اور بدن کا حصہ فنا ہوتا ہے اس سے یہ عمر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ بقائے ظنر طبعیت ہر ذی حیات کو فنا کو ذوق ہے یعنی یہ وہی اشتعال ہے جو فنا کرتا ہے اور حیات بخت ہے لیکن اس ذوق فنا کی ناتمامی پر دل جلتا ہے کہ ایک با جسم کو جلا کیوں نہیں دیتا۔
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹکتی ہے
ہر کوئی دریا ندگی میں نالہ سے لایا ہے
فرماتے ہیں آگ ایک خاموش چیز ہے نل شور سے تعلق نہیں رکھتی لیکن جب اسے پانی میں ڈالتے ہیں تو اس میں سے جی ایک آواز پیدا ہوتی ہے اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہر کوئی طبعیت

کے وقت نالہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

ہے وہی بدستی ہرزہ کا خود عذر خواہ جس کے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار

ہرزہ یعنی ہر مخلوق عذر خواہ۔ معافی چاہنے والا یا معذور رکھنے والا اس شعر میں دعویٰ ہے

طریقہ سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متعین دلیل وقت ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرات عالم یعنی ممکنات

جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ ان کی بدستی و فعلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پر تو وجود سے

یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔ (از یادگار غالب)

مجھ سے مت کہہ تو میں کہتا اپنی زندگی زندگی سے بھی میرا جی اندلوں بیزار ہے

فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے یہ نہ کہہ کہ تو میں اپنی زندگی کہا کرتا تھا جب میں ایسا کہتا تھا وہ اور

وقت اور زمانہ تھا اس تو اپنی زندگی سے بھی میرا جی بیزار ہو گیا ہے۔

آنکھ کی تھوڑا سا مہر پہ کھینچی ہے کہ تا تجھ پہ کھل جائے کہ اسکو حسرت دیدار ہے

فرماتے ہیں میں نے لفاظ خط پر بجائے پتہ لکھنے کے آنکھ کی تصویر قلم سے بنا دی ہے۔ اور

اس سے مراد غایہ ہے کہ تجھ پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کاتب خط کو حسرت دیدار بہت زیادہ ہے۔

چشمیں میں گذرتے ہیں جو وہ کوچہ میرے کندھا بھی کہاڑوں کو بد لئے نہیں دیتے شعر

فرماتے ہیں جس طرح میری صورت سے ان کو نفرت ہے اسی طرح میرے محلہ سے بھی ہے یہ کہ

کوچہ میں اتنی دیر توقف فرما بھی گوارا نہیں ہوتا کہ جتنی دیر میں کہا کندھا بد لئے ہیں اس لئے کہاڑوں

پر تاکید ہوتی ہے کہ اس کوچہ سے باہر نکل کر کندھا بد لئے یہاں سے جلد گزر جاؤ۔

مری سستی فضا نے حیرت آباد مٹا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عذاب ہے

فرماتے ہیں میری سستی حیرت آباد مٹا کر رونق بخشنے والی ہے۔ نالہ و فریاد جس آواز کا نام اہل دنیا

نے مقرر کر لیا ہے۔ وہ اس عالم کا عذاب ہے یعنی کسی قسم کی آواز بلند ہی نہیں ہوتی صرف نالہ کا اسطرح

میں مقام حیرت اس مقام کو کہتے ہیں جہاں طالب پر تجلی ذات وارد ہوتی ہے۔

خزاں کیا فصل گاں کہتے ہیں کو کوئی مچھڑا وہی ہم ہیں قفس ہے اور اتم بال پر کڑ ہے

یہ صاحب نے چوبچ دو مضمون میں عجیب حدیث خوبی کے ساتھ ادا کر لئے ہیں۔ اور اس میں
لغات یہ رکھنا ہے کہ سب جملے زبان طہل سے ادا کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں ہمیں معلوم نہیں خزاں
کہ کو کہتے ہیں اور یہاں کس کو کہتے ہیں۔ ہمارے حالت کسی موسم میں بدلتی ہی نہیں، یہ وہ ہیں اُرفا
ہیں کہ نفس میں نہ ت سے بند ہیں اور پیشہ بال و پر کے ماتم میں گرفتار ہیں۔

وفا کے دلہاں ہے اتفاق ورنہ اکہم
نہاتے ہیں وفادار و شوق کاں جانا خوش نصیبی سے اتنا فیہ سرب و گرد نہ اسے جہم قزو
کے اثر اور محبت کی تاثیر کے ہم قائل نہیں ہیں یعنی نہ محبت کے اثر سے مشوق رام ہوتا ہے نہ آہ و
نالہ کی تاثیر کا اثر ہوتا ہے۔

نہ لانی شوخی اندیشہ تاب نہج نو میدی
کف افسوس ملنا اہل تجدید تمنا ہے
فرماتے ہیں شوخی اندیشہ سے ناامیدی اور دایوسی کا صدمہ نہیں اٹھ سکتا اس واسطے
ایسی تمنا میں ہمیشہ متنا رہنا ایوں ہو جانے سے بد رہنا بہتر ہے اس لئے کف افسوس کا ماننا ایسا
کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دوبارہ تمنا سے تجدید بیعت کرنی ہے۔ مطلقیت ہے کہ میں جو یا اس کے
عالم میں کف افسوس ملتا ہوں یہ ناامیدی کی وجہ سے نہیں ملتا بلکہ تمنا کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت
کرتا ہوں۔ بیعت کرنے کے وقت مرید اپنے دونوں ہاتھوں میں پیر کا ایک ہاتھ قیام کر تو اپنا تنہا
کرتا ہے اور کف افسوس ملنے کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔

رحم کر ظالم کہ کیا دو چراغ کشتہ ہے
نہض ہمار و فنا دو چراغ کشتہ ہے
چراغ کشتہ استعارہ ہے بیمار و فنا سے۔ فرماتے ہیں۔ رحم کر ظالم کہ بیمار و فنا کی سستی ہی کیسے گویا
اس کی نہیں دو چراغ کشتہ ہے نہ نزع کے وقت کی نفی کو ایسا دودھی کہتے ہیں اور نسی جی کہتے ہیں۔

دل لگی کی آرزو چین رکھتی ہے
ورنہ یاں میر و نقی سود چراغ کشتہ ہے
فرماتے ہیں دل لگی کی آرزو ہم کو چین رکھتی ہے اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ روٹی
چراغ اس کے نقصان کا باعث ہے یعنی چراغ ملتا رہتا ہے تو اس کا تیل اور جی دونوں ختم

ہو کر چراغ کو نقصان پہنچ جائے اور اگر وہ بجھ جائے تو اس کی بے منفی چراغ کیسے مفید ہے۔
 چشم خواباں خاموشی میں بھی زویرا ہے سر نہ تو کہوے کہ زویرا شعلہ آواز ہے
 فرماتے ہیں حنینوں کی ہاتھیں خاموشی میں بھی گفتگو کرتی رہتی ہیں گویا ان کی آنکھوں کا
 کابل شعلہ آواز پر یا گیا ہے سر نہ خورائیدن یا سر نہ آواز نہ دونوں تاری الوں کے محاصرے میں عیش
 کوئی بے معنی پران کا استعمال ہوتا ہے میرزا صاحب کہتے ہیں کہ یہ کابل شعلہ آواز پر بنایا گیا ہے اسلئے
 اس کا اثر ظلمات اور سرموں کے قوت گویا بجھتا ہے تو کہوے تو کوئی کا ترجمہ ہے۔

پیکر عشاق سارے طالع ناما ہے نالہ گویا گردن سيارہ کی آواز ہے
 فرماتے ہیں پیکر عشاق یعنی عاشقوں کے جسم بھیمی کے سارے ہیں اور ان کے نالے دیباچہ
 کے ستاروں کی آواز ہیں عشاق ہمدن نالہ و فریاد ہو اکہے ہیں اس لئے ان کو بھیمی کا سا زکما
 گما ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہل عجم کے محاورے میں مقام عشاق الیک گنی کا نام ہے۔
 دستگاہ دیدہ خونیاز مجنون کھینا یک بیاباں جلوہ گل فرش پا انداز ہے
 فرماتے ہیں دیدہ خونیاز مجنون کی دستگاہ تو ملاحظہ فرمائیے کلاںکھوں جو خون کی
 ندی ہی ہے اس نے نجد کے جنگل کو ایسا فرش پا انداز بنا دیا ہے جس میں کوسوں تک
 جلوہ گل کا سماں نظر آتا ہے۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سی میری وحشت تری شہرت ہی سی
 فرماتے ہیں تو جو میرے دعوت عشق پر کہتا ہے کہ تجھ کو عشق نہیں ہے بلکہ یہ دیوانگی کا
 جوش ہے جس میں وحشت پیدا ہو گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھا مجھ کو عشق دہی وحشت
 ہی سی اور یہ میری وحشت تری شہرت جس کا باعث ہی ہے۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سی
 یہ صفوں میرزا صاحب کے حق میں آیا جہاں نظم کیا ہے شل نظم کیا ہے اور ہر جگہ شاعر
 باندھا ہے فرماتے ہیں ہم سے تعلق آپ کیوں کرتے ہیں۔ اگر کچھ بھی لگاؤ باقی نہیں ہے تو ہمارے

سہ دشمنی ہی کیجئے محبت نہ سہی عداوت سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
فرماتے ہیں اگر میں تھوڑی سی آوازوں کا تو اس میں کوئی تپ کرنا ہی ہوگی بلکہ دوزخ
جگہ کیا ہے مجلس نہ سہی خلوت سہی۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
فرماتے ہیں ہم کچھ اپنے عدو تو نہیں ہیں کہ تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کریں
تجھے غیر کی محبت کا فتنہ کامل ہے اور اس کو اپنا سچا عاشق سمجھتا ہے تو ہم تجھ سے کیوں ملیں۔
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

فرماتے ہیں اپنی ہستی کو جاننا صین عرفان ہے بصدق من عرف نفسه فقد عرف ربه یعنی جسے
پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچاننا اپنے رب کو دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں اگر اپنے نفس سے آگہی
حاصل نہ ہوئی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی کر لینی مناسب ہے یعنی جہاں اپنے کو نیست سمجھ لیا تو موجود
بحق کا جلوہ ضرور نظر جائیگا یہ شعر بھی میرزا کے نثر وں میں آیا بدارشتر ہے۔

عمر ہر چند کہ ہے برفِ خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
فرماتے ہیں یہ تو ہم نے مان لیا کہ عمر کا قیام بجلی کی چمک کی مانند ہے لیکن پھر بھی اتنی فرصت
مل جاتی ممکن ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے۔

ہم کوئی ترک و فاکرے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
فرماتے ہیں ہم عشق کی تکلیفوں سے گھبرا کر ترک و فاکرے ہو گئے یوں ہی کہ عشق کو ہم نہ ایچہ
راحت نہ سمجھیں باعث مصیبت سمجھیں گے۔

کچھ تو دے لے فلکات انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
فرماتے ہیں۔ اے فلک میں تجھ سے یہ تو نہیں کہتا کہ تو میری مراد ہی پوری کر دے آواز
فرصت فریاد تو تجھے دے گا اس کے دینے میں بھی تیرا کچھ نقصان ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خود الیں گے بے نیازی تیری عادت ہی سہی
 فرماتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم بھی تسلیم و رضا کی عادت ڈال لیں گے جب یہ سمجھ لیں گے کہ
 بے نیازی تیری عادت میں داخل ہو گئی ہے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسل گرنیں وصل تو حسرت ہی سہی
 فرماتے ہیں۔ اے آسیدار سے مدعا طلبی کی چھیڑ چھاڑ ہوئے جاوے خاموش ہو کر بیٹھا
 کچھ کام کی بات نہیں ہے اگر وصل نہیں ہوا تو اظہار حسرت ہی سہی۔

ہے آرمیدگی میں نکو ہش بجا مجھے صبح وطن ہے خندہ دندان نا مجھے غزل
 فرماتے ہیں۔ آرام لینے کی حالت میں اس بات کا مترا د رہوں کہ مجھ کو نشتر کی بجائے وطن میں
 رہ کر صبح کا ہونا میرے اسطے خندہ دندان تھا ہے مطلب یہ ہے کہ مجھ کو تلاش یار میں ترک وطن کرنا
 لازمی اور ضروری ہے میں آرام طلبی کی وجہ جو گھر میں بیٹھا ہوا ہوں تو وطن کی صبح میری حالت
 پر ہر روز خندہ زن ہوتی ہے۔

ڈھونڈے ہے اس منہی آتش نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوہ برق فتا مجھے
 فرماتے ہیں۔ میزدل اُس گانے داسیکو ڈھونڈ رہا ہے جس کی آواز کی بجی مجھ پر گر کر ٹھیکوٹن کر دے
 اور میں غم ہا سو کے ساتھ اپنی ہستی کو بھی بھول جاؤں

مستانہ طے کروں ہوں وہ وادی خیال تابا نگشت سے نہ رہے مر عا مجھے
 فرماتے ہیں۔ میدان خیال میں ستانہ دارداہ کو طے کر رہا ہوں اودہ اسنے کہ طبت کر آئیے مجھ کو
 غرض مصائب رہے یعنی میں نے کو اس طرح گم کردوں کہ پھر موت میں نہ آسکوں۔

کرنا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں لے لگی ہے نگشت گل سے حیا مجھے
 فرماتے ہیں میں تو ہمیشہ نگشت گل کو بیجا بی کا ازام دیتا رہا ہوں وہ اس سے ہی کستار
 ہوں کہ ذرا ہوا چلی اور تو جام سے باہر ہو گئی مگر تو آج اس سے بھی زیادہ بے حجاب بے شرم
 نکلا اب مجھے نگشت گل سے شرم رہا ہوا پڑا یعنی تیری بے حجابیاں دیکھ کر دوسے گل کو کس منہ سے

بے حجاب کہوں۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
فرماتے ہیں کسی شخص پر میرے دل کا معاملہ یعنی میرا ذوق عشق کیوں ظاہر ہوتا مگر ہمارے
انتخاب نے مجھے بدنام کر دیا یعنی میں ایسی ہی شعر چن کر پڑھا کرتا تھا جن میں معاملات عشق موجب

مضامین ہند سے ہوئے ہوتے تھے۔
زندگی اپنی جیل میں ناگ سے گزری غائب
فرماتے ہیں۔ اسے غالب جیل ہماری زندگی ایسے بُرے حالات سے گزری تو ہم کیا ذکر کر سکتے
کہ خدا رکھتے تھے۔

غزل اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے بیٹھارہا اگر چہ اشاعے ہوا اسکے
میرزا صاحب نے اس شعر میں حیا کے معنی فحش کے لئے دیے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اسکی بزمِ ناز میں
مجھ کو فحش کام لیتے ہوئے بن شیت لای جن بیٹھارہا وجود کے بغیر سے اُن کے اُشاعے ہوتے ہیں۔
دل ہی تو ہے سیاستِ باں سے ڈو گیا میں دیاؤں دے سے تے بے صدا کئے
فرماتے ہیں دل ہی تو ہے یعنی دل کی یہ کیفیت ہے کہ کبھی مضبوط ہو جاتا ہے کبھی ہلکا ہوتا
ہے اس وقت اس کا یہ حال ہوا کہ ذرا سے دربان کے دھمکے دینے سے ڈو گیا دروازہ میں اب نہ تھا کہ
تیرے دروازہ پر سے بغیر صدا کئے چلا جاتا۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ میں ہے مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے
فرماتے ہیں۔ خرقہ و سجادہ و شراب کے بدلے گرو رکھتا پھرتا ہوں اس لئے کہ میں ہمیشہ
پاکا موسم آیا ہے مینہ برس رہا ہے دھندلی ہوا ہے رہی ہے مناسبت کہ اس وقت فصلِ بہار
کی دعوت کی جائے اور شراب کا دور ہو اور دونوں چیزوں کو ملا کر گروں رکھتے ہیں۔ خوشی
رکھی ہے کہ ایک چیز سے قیمتِ شراب داتا ہوئی۔

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہر گز چہر خضر حضرت بھی کل کیسنگے کہ ہم کیا کیا کئے

فرماتے ہیں۔ تعلقات دنیا سے چھٹکارہ کہاں کہ عمر کو عبادت الہی میں صرف کیا جائے عمر گرچہ
حضرت خضریٰ کی کیوں نہ ہو مگر بیکار ضرور گزرے گی حضرت خضرؑ کی کل فرمائشیں کہ معلوم نہیں ہم کیا کرتے ہیں
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لیم تو نے وہ گنجھائے گرا نہایا یہ کیا کئے
فرماتے ہیں۔ اگر یہ قدرت حاصل ہو جائے تو میں ضرور خاک سے دریافت کروں کہ اے لیم تم نے
وہ قیمتی خزانے کیا کر دیے یعنی بڑے بڑے لوگ تیری آغوش میں آئے اور ٹوٹے انکو خاک میں ملا دیا
اس طرح کہ کسی کا بھی نشان باقی نہ رہا۔

کس روز تمہیں نہ تراشا کئے عدد کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کئے
فرماتے ہیں وہ کونسا دن تھا کہ جس دن دشمنوں نے ہمارے اچھتمتیں نہ باندھیں ورنہ تو
دن تھا کہ جس دن ان کی جھوٹی باتوں میں گرہم نے ہمارے سر پہ آ رہے نہ پھیرے۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہ میت خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے
فرماتے ہیں مجھ کو یہ دہم پیدا ہو گیا ہے کہیں غیر کی صحبت میں تھے اس کو عبادت نہیں لگتی
وہ بغیر التجا کئے بوسہ دیتا ہے اور اس دہم نے وصل کی خوشی کو غم سے بدل دیا ہے۔

ضد کی ہے اور بات مگر خوبڑی نہیں بھولے سے اس نے نیت کر دے وعدے فدا کئے
فرماتے ہیں ضد کی تو بات ہی اور ہے کہ اسے ہم کسی وقت کسی بات پر خاص عند پیدا ہو
ورنہ یہ عادت بڑی تو نہیں ہے اکثر اس نے بھولے سے وعدے وفا کئے ہیں مطلب یہ ہے
کہ اس کی بھول بھی بعض اوقات لطف کا کام دیکھاتی ہے۔

غالب تمہیں کہو کہ ملیگا جواب کیا مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے
فرماتے ہیں ہاں غالب تم خود ہی سوچ کر اس بات کا جواب دو کہ وہاں سے تم کو جواب
کیا ملیگا۔ یہ تو ہم نے فرض کر لیا کہ تم اپنا مطلب اس سے کہتے رہے اور وہ سنتے بھی ہے لیکن مختاری
مرد عاثری کی کیا صورت ہوگی۔ وہاں مختاری پہنچ کیونکر ہو سکیگی اور پھر حسب ان اظہار فنا کی
اجازت کس طرح دیکھا تم کہاں وہ کہاں کچھ دل میں تو اپنے سوچو۔

غزل رفتارِ عمر قطع رہا اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب کے
 فرماتے ہیں جس طرح اہل تنجیم آفتاب کی رفتار سے سال کا حساب لگالیتے ہیں عمرِ یزید کا حساب
 آفتاب کے بدلے بجلی سے کرنا چاہئے۔ سال معنی عمر بھی استعمال ہوتا ہے راہِ اضطراب وہ راستہ ہے
 جو حالتِ اضطراب میں طے کیا جائے۔

مینائے مے ہے سروِ نشاط بہارِ مے بالِ تدرودِ جلوہ موجِ شراب کے
 فرماتے ہیں۔ نشاط بہار سے بہرِ نشاط شراب سرود کا مد مقابل شگ ہے اور شراب تندر کی لہر
 بالِ تدرود کا نمونہ دکھا رہی ہے

زخمی ہوا ہے پاؤں پائے ثبات کا لئے بھل گئے کی گونٹِ اقامت کی تاب کے
 فرماتے ہیں پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہو کر مشکل یہ ہو گئی ہے کہ اس میدانِ عشق میں بھٹکتا ہو
 سکتا ہوں اور نہ ٹھہر سکتا ہوں۔

جادادِ بادہ نوشی رنداں ہے شہتِ غافل گماں کرے ہے کہ گمیتی خراب ہے
 فرماتے ہیں۔ جاداد یعنی جاداد۔ بادہ نوشی سے مراد شرابِ عرفان ہے رنداں سے مراد غافل
 مطابقت ہے اہل عرفان کو شہتِ پرانے عرفان کی وجہ سے قبضہ حاصل ہو گیا ہے وہ طرفِ ذات
 باری تعالیٰ کی تجلیاں دیکھ رہے ہیں ورنہ شخص صلوٰۃِ حقیقت سے نا آشنا یعنی غافل ہے اُس کے گرد
 میں دنیا خراب ہے یعنی غافل ہو رہی ہے۔

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حُسن کا جوش بہارِ جلوہ کو جس کے نقاب کے
 فرماتے ہیں ظہورِ عالمِ اجسامِ آشائے حقیقی کے اسطے پردہ کا حکم رکھتا ہے نظر کو دیکھنے سے روکتا ہے
 سکتی یعنی نظر حبیب دیکھے گی نقاب ہی کو دیکھے گی آنکھ حبیبِ عینیِ حُسن ہی پر پڑے گی جوشِ بے ریت ہو جائے
 ظہورِ عالم کا اور نقاب کہنے سے انکو یہ مراد ہے کہ نقابِ طرحِ چہرہ کو چھپا لیتی ہے اسی صورت سے
 عالمِ اجسام کا نقشہ صوفیہ کے نزدیک عالمِ لاہوت تک جانے سے روکتا ہے۔

میں نامِ رادل کی تسلی کو کیا کروں مانا کہ تیرے رخ سے نگر کا میاں ہے

فرماتے ہیں میں نے دل مراد کی تسلی کو نہ کر کے یہ تو میں نے مانا کہ صرف تیر دیکھ لینے سے
جگہ کو تسلی ہوگی۔ مگر دل کو تسلی اسی صورت میں ہوگی کہ جب تجھ سے وصل جیانی بھی حاصل ہوگا۔

گزرا آتش سترت پیغام یا سے قاصد یہ مجھ کو رشک سزا ال جواب ہے
فرماتے ہیں۔ اسے اتنا میں پیغام یا کی خوشی و مسرت کو لیکر کیا کروں مجھ کو تو یہ رشک قتل
کئے ڈالتا ہے کہ اگر میں قاصد کو بھیجوں گا تو قاصد جا کر اس سے گفتگو کرے گا ہم کلام ہوگا اور مجھے
یہ بات کسی طرح گوارا نہیں۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے یہ رشک آجائے میں سے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے غزل
فرماتے ہیں میری بے بسی تو دیکھو کہ مجھ کو آپ نے پر رشک آ جاتا ہے نہ تمہارے محبت یہ ہے کہ
محبت میں بدگمانی پیدا ہو جائے اور نہ تمہارے بدگمانی یہ ہے کہ انسان کو کامیابی کی صورت میں اپنے
پر بھی رشک آئے رشک کی حالت میں اس کو نہ دیکھ سکتا ہوں مطلب یہ ہے کہ نہ تمہارے محبت کامیابی
سے بھی محروم رکھتی ہے۔

ہات دھول سے ہی گرمی گرا نہ لیشہ میں آگینہ تندی صبا سے بگھلا جگا ہے
فرماتے ہیں اگر آتش فکر میں ہی ہی گرمی ہے تو دل سے تا امید ہو جانا چاہئے۔ دوسرے
مصرعہ میں اسی مضمون کو تشبیہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آگینہ یعنی دل کا شیشہ شرب کی
تیزی سے بگھلا جاتا ہے۔

غیر کو یا رب کینہ مکر منع گستاخی کرے اگر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے
یہ شعر معاملہ کا ہے جو طلب مطلوب کے درمیان اکثر گزر رہا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے
مصرعہ میں بانی جاتی ہے ظاہر ہے کہ حیا آتی اور شرما جانا دو حقیقتیں ایک ہی چیز ہے پھر اس کے کیا کہنی
کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آئے کا متعلق اور ہے اور شرما جانیکا
متعلق اور۔ اگر حیا بھی اسکو آتی ہے یعنی غیر کی گستاخی در خواہش حیا سے اور شرما جائے ہے یعنی
غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرتے سے (انہ یادگار غالب)

شوق کو یہ بت کہ ہر دم نار کھینچے جائیے دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے کھنکھارے
 دہانے نہیں شوق کو نہ سے رینکا ایسا پکا پڑ گیا ہے کہ کسی نشت کو فریاد سے اکتاہٹ نہیں
 دل کی حالت سی زار و مزار ہو گئی ہے کسلس لیتا بھی ناگوار گزرتا ہے ہمت کے معنی بڑی عاقبت
 کے ہیں۔ جیسے کہ تپا کس کو جو اکھینے کی ہمت ہے۔

دو چشم بدترتی بزم طرب سے واہ واہ نغمہ ہو جاتا ہے ال گزرا لہ میرا جائے ہے
 فرماتے ہیں چشم بد دو تیری بزم طرب کی کیا بات ہے یعنی اس قدر خوشی سے محو ہے کہ میرا
 نالہ بھی نہ رہا پچ جائے تو وہ کسی نغمہ کی تپ سے معصوب ہے کہ میری فریاد کو سن کر خوش ہو گیا
 اس سنگینی پر مقدمہ جو کرے۔

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جا ہے
 فرماتے ہیں۔ اگرچہ اسکی چشم پوشی مینی ہے تو جی راز عشق کی پردہ پوش ہے لیکن ہم کے راز
 ایسے باتوں اور خود راز ہر جہت سے ہیں کہ وہ راز عشق سے خبر نہ ہو جاتا ہے کھوئے جانے سے چھٹا
 ایسے دو محو وئے اس شعر میں نظم کیے گئے ہیں کہ جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

اس کی بزم آرائیاں سکر دل رہنمویاں مثل نقش مدعا ئے غیر میٹھا جائے ہے
 اس کی محفل ناز کی خبریں شہر میرا دل بخور رہا اس طرح سے میٹھا جاتا ہے یعنی ناممید
 ہو جاتا ہے اس طرح رنیب کی دفا کا سدا ئے دل پر میٹھا گیا ہے۔

ہو سکے عاشق دہریہ کی رخ اور نازک بن گیا رنگ کھلتا جائے ہے صفا کہ دلتا ہے
 فرماتے ہیں دہریہ کی رخ منیر نہ کا شوق بکر اور زیادہ نازک بن گیا مجھ کے صدف سے جھکا
 اس کا رنگ رٹا ہے اتنا ہی رنگ نکھرتا جاتا ہے مینی زیادہ گوارا ہوتا جاتا ہے

نقش کو سکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں کھینچتا ہے بقدر اتنا ہی کھینچتا جا ہے
 فرماتے ہیں اسکی تصویر بھی مصور کے ساتھ ناز و غرور کا پرتاؤ کرتی ہے یعنی بقدر مصور تصویر
 کو کھینچتا جاتا ہے اسی قدر اس کی تصویر مصور سے کشیدگی پائی کرتی جاتی ہے۔

سایہ میرا مجھ سے مثل و د بھاگے ہے حاصل
پاں مجھ سے آتش بجاں کس سے ٹھہرا جائے ہے

فرماتے ہیں اسے آتش عشق کی بدلت ایسی مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہوں کہ میرا سایہ بھی مجھ سے گریز کرتا ہے
یعنی جس طرح آگ سے ہواں ٹھکرا کر ٹپک رہتا ہے میرے سوز و حر کے خوف سے میرا سایہ مجھ سے
دور بھاگ جاتا ہے گویا شعلہ آتش جگر کا دھواں ہے میرا سایہ نہیں عجب پر لطف مقطع لکھا ہے۔

گرم فریاد رکھا شکل تنہالی نے مجھے
تکلیاں ہجر میں می برد لیالی نے مجھے

فرماتے ہیں نقشِ قالمین کو دیکھ کر میں حشر فدا فریاد ہوا کہ ہائے یہ شکل تو میرے پہلو میں جو آؤ
میرا عشق تو گرم فریاد ہونے سے شب ہجر کی سردی سے میری جان بچا لی ورنہ میں ٹھکرا کر مر جاتا۔

نسبہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

فرماتے ہیں میری ہمت کی کی نگاہ بد دنیا و عقبی میں کون سی چیز ہو سکی اور یہ نقد ان لوگوں کے لیے حقیقت سمجھ کر
یہ ہمت لی نے مجھ کو خود خرید لیا یعنی میں ہیش رہا ہوں کہ میری خریداری کیلئے نقد دنیا ایسی عیبی ہونی چاہی۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری و ہم
کر دیا کافران ہمنام خیالی نے مجھے

فرماتے ہیں کثرت کے لباس میں وحدت کو آراستہ کرنا اور وحدت پر کثرت کا خیال کرنا وہم پرستی
نہیں تو ادھر کیا ہے یعنی یہی خیال کثرت ہمنام خیالی سمجھے جاتے ہیں اور جس طرح بتوں کو بتوں کا بندہ
شریک باری تعالیٰ سمجھتا ہے اسی طرح وہ پیچھے جو وجود کثرت کے قائل ہیں کثرت کو وحدت کا
شریک وجود سمجھ رہے ہیں اور ایسا خیال کرنا کھلا ہوا شرک کفر ہے۔

ہوس گل کا تصویر میں بھی کھٹکانہ رہا
عجب رام دیا بے پروبائی نے مجھے

فرماتے ہیں ہاں گل کا تصویر بھی اب نے نہیں پایا اس کھٹکے سے بھی مجھ کو نجات حاصل
ہو گئی۔ یہ احت قلمی بے پروبائی کی بدلت مجھے حاصل ہو گئی بمطبت ہے کہ جب تک بال پر
یہ منت پرواز رہی میرا کربانغ میں پہنچ جاتا تھا اب طافی کی بدلت گل کی تید سے آنا چھوٹا۔

ہار گاہ ہستی میں لالہ داغِ سماں ہے
برقِ خرمنِ احت خون گرم مہقان ہے غزل

میرزا صاحب اپنی رقعات و عمدہ مندی میں ان تینوں شعروں کی شرح خود تحریر فرماتے ہیں۔

وہ یہ ہے داغ سامان مثل انجم بجز شخص داغ جکا سراپہ سامان ہو موجودیت لالہ کی منحصر
 نمائش داغ پر ہے نہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لاں ہوتا ہے بعد اس کے سمجھ لیجئے کہ پھول کے
 درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے وہاں کو جو تنے پونے پانی دینے میں شقت کرنی پڑتی ہے اور پھر
 میں لو گرم ہو جاتا ہے مقصود شاعر کا یہ ہے کہ جو دھن رنج و غناہ ہے مزارع کا وہ لو جو کشت
 کار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرم کا برق ہے حاصل موجودیت داغ اور داغ حیا
 راحت اور صورت رنج غنچہ۔

غنچہ ناش گفتمنا برگ عافیت معلوم باوجود کجی خواب گل پریشاں ہے
 کی چنپی کجی بصورت قلب صنوبری نظر آئی اور جب تک پھول بنے برگ عافیت معلوم ہیں معلوم
 معنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایہ آرام بصرہ۔ برگ مینی گہو خوشی فرست برگ اور برگ
 برگ معنی سازو سامان ہے خواب گل شخصیت گل باعتبار غامضی و پر جانہ گی پریشانی کا ہے
 یعنی شفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا کھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے باوصف جمعیت
 دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔

ہم سے بچ مینا بی کس طرح اٹھایا جاوے داغ پشت دست عجز شعلہ حسن مذاج
 پشت دست صورت عجز اورین مذاج کا بدن داغ رفتن بھی اظہار عجز ہے پس حسن عالم میں کہ داغ نے
 پشت دست میں پر رکھ دی ہوا و شعلہ نے شکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس
 ہو قبلہ متبادل فکر سخن میں تبدیل اسیر شوکت کے طرز پر رنجتہ لکھنا تھا چنانچہ ایک غزل کا مطلع
 یہ تھا کہ طرز تبدیل میں رنجتہ لکھنا۔ اسد شہ خاقانی است ہے۔ ۵۰ برس کی عمر سے ۲۵ کی عمر تک
 مضامین خیالی لکھا گیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب متمیز آئی تو اس دیوان کو وہ
 کیا ادراک یک قلم چاک کئے دس پندرہ شعر اسطے مونث کے دیوان حال میں رہنے دیے۔

اگت ہا ہے درو دیوار یہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں رگھر میں بہاڑی ہے
 فراتے ہیں ہم تو وحشت دل کی بدولت دیوانگی کے عالم میں بیابان رو ہو گئے ادب

نے اگر گھر کے در و دیوار پر پرائیگی کے عالم میں گھاس پیدا کر دی ہو اس ہے کہ ہم تو جنگل میں رہے
 مائے پھرتے ہیں وہ گھر میں بہار آ کر خاؤ ویران باغ بن گیا ہے میرا صاحب کے ذرا رنگی مکی
 تصویر ایسے ساٹے نقطوں میں کھینچی ہے کہ تعریف سے مستثنیٰ ہے۔

سادگی پر اس کے مرجانے کی حسرت میری بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے غزل
 یہاں سادگی سے مراد ترکِ منت و آرائش ہے۔ فرماتے ہیں۔ اسکی سادگی جو بغیر تلوار کے قتل
 کر رہی ہے یعنی ابھی تلوار اس نے باندھی بھی نہیں ہے میرا مادہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ کر مرجانے
 کا تھا اور یہی حسرت ابھی تک میری دل میں ہے کہ اسکی سادگی پر گلا کاٹ کر مر جاؤں مگر میرے اس
 ارادہ کی تکمیل بھی نہ ہوئی تھی کہ خنجر اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اب میری حسرت نکالنے کے دو
 سبب نفع ہو گئے ہیں ایک یہ کہ جب خنجر اس کے قبضہ میں گیا تو ہم اپنا گلا کیونکر کاٹیں اور دوسرا سبب
 یہ ہے کہ جب خنجر اس نے کھینچ لیا تو اب وہ سادگی کہاں باقی رہی جس پر ہم اپنی جان قربان کرنی چاہتے
 تھے۔ دو سرے مصرعوں میں پھر کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ ہم اپنا گلا کاٹنے
 پر مستعد تھے مگر اس نے اسی طرح خنجر ہمارے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہاں نہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
 کسی کے حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قاتل کے منہ سے نکلے و
 سامع کے دل میں اس طرح اتر جئے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی
 (از یادگار غالب)

گرچہ جسے کس کی الٹی سٹے یا ہنچ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس مغل میں ہے
 فرماتے ہیں۔ اگرچہ میرا ذکر ان کے سامنے برائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور غیر وہ ذکر کرتے ہیں مگر
 بہر حال مجھ سے بہتر ہے کہ اس مغل میں آتے جاتا ہے۔

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائیگی یہ جو اکنات ہماری سی بچا ل میں ہے
 فرماتے ہیں۔ اسے ہجومِ ناامیدی بس کر کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری سی بے جا ل میں جو اکن

ذرا سی لذت باق رہ گئی ہے یہ بھی خاک میں مل جائے۔
 رنج یہ کیوں کھینچے داماندگی کو عشق ہے ۱ ٹھٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
 راد کی کھینچیں کیوں کھینچی جائیں اور بھی کوشش کیوں کیجئے۔ داماندگی کو ہم سے عشق
 ہو گیا۔ یعنی ناگامی و نامرادی ہم پر عاشق ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ داماندگی ہم پر مبتلا ہے
 پھر کمر بستہ منزل مقصد تک پہنچ سکیں گے تو اب ہمارا ایک ایک قدم سو سوں کا ہو گیا یعنی رستہ چھینے
 سے بالکل جی بھڑکتا گیا۔

جلوہ زار آتش و دُخ ہمارا دل سی فتنہ شوق قیامت کے آگ میں ہے
 فرماتے ہیں یہ آپ سچ کہتے ہیں مجھے دل میرا آتش و دُخ بھری ہوئی ہے لیکن فتنہ قیامت
 کے آگ میں نکل رہا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم تو سدا پافتنہ قیامت کا نمونہ ہو۔

ہے دل شوریدہ غالب طلسم بیچ و بیا۔ رحم کراہی تمنا پر کہ کس خشک میں ہے
 مطالب تو اس شعر میں صرف اتنا ہے کہ میری تمنا کے دل نکال دو۔ میرا صاحب کسے اس کو
 عیب شوخی کے ساتھ بیان کیا ہے فرماتے ہیں غالب کا دل شوریدہ طلسم بیچ و بیا ہے یعنی اس میں
 کورکھ و مہر کی طرح بہت سے بل پڑے ہوئے ہیں تمنا کی پچھلی پچھلی شکل میں مبتلا ہو
 گئی ہے تم غالب پر رحم نہ کرو و بجا اپنی تمنا پر رحم کیسے اس کو اقل امت سے نکال کر لیجاؤ۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دولوں کو اک دل میں رضا مند کر گئی
 فرماتے ہیں۔ تیری نگاہ تیر کی طرح دل سے جگر میں جا چکی اصاف دولوں کو ایک ہی ایسے ناز
 میں رضا مند کر کے واپس ہو گئی۔

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق تکلیف پرودہ واری زخم جگر گئی
 فرماتے ہیں۔ سو تو سہی میرا سینہ شق ہو گیا ہے اور اس کے شق ہونے سے لذت فراق کو
 عجب سرور حاصل ہوا ہے بڑی تکلیف زخم جگر چھپائے کی بھٹی اب ہر مٹ گئی کھلم کھلا فراق
 کے مرض سے لڑنے نصیب ہو گئے۔

وہ بادہ شبانہ کی سرستیاں کہاں اٹھنے لگاں کہ لذتِ خواب سحر گئی
 فرماتے ہیں۔ ایسے رات کی پی ہوئی شراب کی سرستیاں کہاں باقی ہیں یعنی شبانہ کا زیادہ
 گزرا گیا بیدار ہونے کا وقت آگیا۔ لذتِ خواب سحر باقی نہ رہی یعنی پیری کا آغاز ہو گیا جوں کی
 نیند سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ نفس کو غفلت کا موقع نہ رہا۔

اڑتی پھرے ہے خاک کی کوئی میری بائیں ایلے ہوو ہوس بال و پر گئی
 فرماتے ہیں۔ مجھے برسوں سے یہ آرزو تھی کہ بال و پر پیدا ہو جائیں اے میرے پار کے کوچہ میں
 اڑ کر پہنچ جاؤں زندگی میں میری یہ مراد پوری نہ ہوئی لیکن مرنے کے بعد میری خاک کو سوار میں
 اس طرح لوثی پھرتی ہے جس طرح میں زندگی میں چاہتا تھا۔

دیکھو ٹو دل فری اندازِ نقشِ پا کے موحِ خرام یا ربھی کیا گل کتر گئی
 فرماتے ہیں۔ اسکی نقشِ پا کی دھڑکیوں کے انداز تو ذرا دیکھو موحِ خرام یا ربقرضِ فکر کیسے
 بھول کر گئی۔ دو کتر معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ گل کتر نامحاورہ ہے جو نسا دہر پا کر دینے کے موقع پر بولا جاتا
 ہے اور اس کے نقشِ پا نے زمین پر قائم ہو کر عشاق و عیار میں باہم نسا دہر پا کر دیا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اے پروے شیوہ اہل نظر گئی
 فرماتے ہیں ہوس راؤ کی عادت حسن پرستی نہ تھی۔ مگر اب انھوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے یہ عادت
 اختیار کر لی۔ اہل نظر کے عشق صادق کی قد جاتی رہی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا سستی سے ہر نگہ تر سے رخ پر بکھر گئی
 فرماتے ہیں رخ یا ربک پہنچ کر نگاہ اسی پرست ہو گئی کہ اس کی نہ نقوں کی طرح پریشان ہو کر
 بکھر گئی اور ان نقاب کی طرح دیرار کی مانع ہو گئی گویا خود نقاب بن گئی۔

فرواد دی کا تفرقہ یک بار مٹا گیا کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی
 کہتا ہے کہ تھارے جاتے ہی بسبب خود فتنگی و خود فرواموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج تو
 کل کن مطلق تیز نہیں ہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہاں انھی دستِ تقدیر و تدبیر

بد زمانہ حال ہو جائیں گے پس تم کیا گئے گویا ہم یہ قیامت گذر گئی قیامت گذر جائے معنی
 ہیں نہایت سختی کا زمانہ گذر جائے اور خود قیامت کا آجانا (زیادہ کار غالب)

مارا زمانہ نے اسے اسد اللہ خان بخش وہ دلوے کہاں وہ جوانی کدھر گئی
 فرماتے ہیں اسے اسد اللہ خان بہادر بخش۔ مانہ کی گردنوں و محبت کی تسکینوں سے موت پہنچے
 تمام کر دیا۔ وہ جوش و خروش اب کہاں ہے اور وہ زور و شور جوانی کے کدھر گئے۔

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے حوران خلیہ میں تری صورت مگر ملے
 نرٹے ہیں۔ فاشن کے لئے یہ دو باتیں عیش و مستی کی ہیں۔ ایک تسکین قلب۔ دوسری ذوق
 نظر حوران خلیہ اگر تیری شکل میں نوان کے ملنے سے ہم کو صورت ذوق نظر حاصل ہو سکتا ہے تو نہیں
 یہ نہیں ہے کہ حوروں کی صورت تجھ سے متی ہوئی ہو اور اس صورت میں بھی کہ ان کو تیرا شکل
 مان لیا جائے تو بھی تسکین قلب بغیر تیرے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم ذوق نظر ملنے پر بھی صبر
 کر لیتے ہیں لیکن یہاں بھی میسٹریاں ملے کہ حوریں تیری شہادت نہیں دیکھتیں۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کرو دفن بعد قتل میرے پتہ سے خلق کو کہوں تیرا گھر ملے
 فرماتے ہیں تو مجھے اپنی گلی میں دفن کر بھانڈاں میں قبا حلتیں پیدا ہو جائیں گی اپنی قبر حلت
 یہ ہے کہ میرے پتہ سے تیرا گھر مشہور ہو جائے گا یعنی لوگ قبر والی جلی مشہور کریں گے یہ یہ کہیں گے کہ
 کی قبر جس گلی میں ہے اور مجھے دو ذوق حلتوں میں شاک یوگا اور رشک مجھ کو جاننے کے بعد بھی گوارا
 نہوگا۔ دوسرے بار ایک معنی اس شعر میں ہیں کہ جب قبر کے پتہ سے تیرا مکان مشہور ہو جائے گا تو لوگ
 تجھ کو غالب قاتل یا غارتگر کا معشوق مشہور کر دیں گے اس میں تیری توہین اور بدنامی ہوگی
 مجھ کو مر چلنے کے بعد بھی تیری بدنامی گوارا نہ ہوگی۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ہر شب پایا ہی کرتے ہیں مے جھدر ملے
 فرماتے ہیں آج تم ساقی بنے ہو چلے گے ہم کو تھپکا دو۔ تھوڑی بہت تو ہر روز پئے گھر پہ
 بھی پیئے ہی رہتے ہیں۔ مگر پیٹ بھر بڑی نفیب نہیں ہوتی۔ آج تو میں جی بھر کے پیا دو۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
 فرماتے ہیں۔ اے ندیم تجھ سے تو ہم کو کچھ زیادہ شکایت نہیں ہے البتہ نامہ بر جو بڑی ڈینگیں
 ہاتھ آتا تھا اور دعویٰ کر کے گیا تھا کہ میں ضرور جواب نامہ لیکر آؤں گا ادھاب تک اس نے شکل ہی نہیں
 دکھائی اور شرمندگی سے چھپکر مٹیہ گیا مگر وہ لمبا ہے تو میرا سلام کہہ دینا مطلب ہے کہ دراصل
 شکایت کرنا اور شرمندہ کرنا۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ محبوں نے کیا کیا فرصت کشاکش غم پہناں سے گرے
 فرماتے ہیں ہم تم کو دکھا دیتے کہ محبوں یعنی تمہیں نے عاشقی کو کس حد تک ترقی دی ہے لیکن
 مجھ سے یہ ہے کہ غم پہناں اپنی پردہ دہی اور رسوائی کے خوف سے ہم کو بھیج کھینچ کر لے آتا ہے اور
 جگہ میں نکل جانے سے مانع ہوتا ہے۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
 فرماتے ہیں راہ سلوک میں تو ہم خضر کے برابر ہیں لیکن راہ طلب میں خضر سے سبق لیا جانی
 چاہتے ہیں اس لئے ان کو ایک بزرگ آدمی سمجھتے ہیں مگر ان کی پیروی کرنے سے قاصر ہیں اس
 شعر سے میرزا صاحب کی شوخی طبع ظاہر ہوئی ہے۔

اے ساکنان کوچہ دلدار دیکھنا تم کو کہیں جو غالب شفقہ سر ملے
 فرماتے ہیں اے ساکنان کوچہ راہ سلوک نکو غالب شفقہ سر اگر ملے تو اس کی زیارت کرنا
 اور دیکھنا کہ اس کی جذبہ کیفیت کس قدر بلند رہتی ہے تم جس کو چہ میں جھوڑی چھاکو پڑے ہو
 وہاں سے کس طرح بے تعلقی کے ساتھ گزرتا ہے۔

کوئی دن گردن دکائی ادا ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور غل

فرماتے ہیں اب تک تو ہم نے تمہاری التجا میں غیروں کی منتیں کیں اور راہ عشق کی ٹھوکریں
 کھائیں مگر اب ہم نے اپنے دل میں شان لی ہے کہ تم سے ترک تعلق کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ جائیں گے
 ریش کا آلہ جذبہ صادق رکھتے ہیں تو تم خود ہمیں پوچھتے ہوئے ہمارے گھر چلے آؤ گے مگر یہاں

باتیں سی ستور میں ہو سکتی ہیں کہ ہماری زندگی بھی ٹاکرے اور غم فراق ہماری جان پر نہ بنا لے۔
 آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غم سے نہانی اور ہے
 فرماتے ہیں۔ یہ گرمی آتشِ دوزخ کو کہاں نصیب ہے، غم نہاں کا سوز کچھ دوسری چیز ہے۔
 مطلب یہ ہے کہ سوزِ غم عذابِ دوزخ سے بھی زیادہ سخت ہے۔

بار بار دیکھی ہیں انکی رعشیں یہ کچھ اب کے سرگرائی اور ہے
 فرماتے ہیں۔ دوزخِ محبت کی بدگمانی غضب کی چیز ہے باوجودیکہ بہت دفعہ ان کا بڑا ہوا ہے
 پھر باجمِ صفائی ہو گئی ہے لیکن اب کی بار یہی یقین ہے کہ اب ان سے ٹاپ نہ ہوگا۔

دیکھو خطِ سنہ دیکھتا ہے نامہ یہ کچھ تو پیغامِ نہ بانی اور ہے
 فرماتے ہیں۔ نامہ بر لے ان کا خط مجھے دیدیا لیکن اسکے نزدیک سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکتبہ بانی
 بھی کچھ کہلا بھیجا ہے اور وہ اسی بات ہے کہ اس کے دُہرنے میں قاصد کی زبان نہیں مل سکتی معلوم
 ہوتا ہے دو چار گالیاں بھی خط کے ساتھ دی گئی ہیں میرزا صاحب کی شوخی اور ذرا لغتِ ہر غزل
 میں ضرور اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔

قاطعِ اعما رہیں اکثر نجوم وہ بلائے آسمانی اور ہے
 فرماتے ہیں اکثر تارے ایسے ہیں جن سے عمریں قطع ہو جاتی ہیں لیکن یہاں جس بلائے آسمانی
 کام پڑا ہے وہ ان نخوس تاروں کے مقابلہ میں قصائے ربم کا حکم رکھتی ہے۔

ہو چکیں غالبِ طامسِ تبسم ایک مرگ ناگمانی اور ہے
 فرماتے ہیں اے غالبِ تدلی میں جن مصیبتوں کا سامنا ہوا وہ انجامِ کارِ تبسم ہو گئیں تو ایک
 مرگِ گمانی کی آفتِ و بانی رہی ہے۔ موت کچھ کہہ کر تو آتی ہی نہیں کیا معلوم کس وقت آجائے گی
 ضرور اور بے خبر کئے یکا یک دھمکسی میں ہر وقت اس کا منظر ہوں۔

غزل کوئی امید پر نہیں آتی کوئی صورتِ نظر نہیں آتی
 فرماتے ہیں حصولِ مہدی کوئی صورتِ نظر ہی نہیں آتی تا کا می اور تا مرادی میں زندگی

بسر ہو رہی ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فرماتے ہیں موت کے واسطے ایک دن معین ہو چکا ہے جب تک وہ دن نہ آئے گا موت کیونکر آ سکتی ہے لیکن نیند کو شب فرقت میں کیا ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی مری موت تو نہیں ہے کہ اس کے آنے کے لئے بھی کسی خاص دن کی قید لگا دی گئی ہو۔ وہ (یعنی نیند) شب فرقت میں رات رات بھر کیوں نہیں آتی۔

آگے آتی تھی حال دل بپسی اب کسی بات پر نہیں آتی

میرا اگر زندہ ہوتے تو میرزا صاحب کے اس شعر کی داد دیتے۔ پریشان خاطری کی تقوٰ کن سادے نقطوں میں کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں۔ پہلے تو مجھے اپنے دل کی مصیبت پر ہی آ جایا کرتی تھی۔ اب میری مصیبتوں نے اس قدر مجھ کو اندر دھک دیا ہے کہ ۳ خوشی کی بات پر بھی مجھ کو ہنسی نہیں آتی۔

جانتا ہوں ثواب طاعت زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

فرماتے ہیں زہد و عبادت کو ثواب جانتا ہوں۔ اور ان دونوں باتوں کی خوبیوں سے بخوبی آگاہ ہوں لیکن طبیعت اب ہر رجوع نہیں ہوتی۔ اس کا کیا علاج مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ توفیق نہ دے۔ انسان کوئی نیک کام نہیں کر سکتا۔

بے کچھ ایسی ہی بات جو چاہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ بہتر یہی ہے۔ کہ میرا منہ نہ کھلو اور نہ میٹھے جھٹکائے رسوا ہو جاؤ گے مطلب یہ کہ مجھے وہ راز کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں کہ جن کے بیان کر دینے میں بدنامی کا خوف ہے۔

کیوں نہ چھینوں کہ یاد کر سکتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ میری نالائقی کو میرا معشوق اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لئے اس کو میری فریاد میں ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے اگر میں نہ موش موش باتوں کو وہ لوگوں سے کہتا ہے

کہ ہمارے مکان کے قریب ایک دیوانہ سا آدمی بیٹھا ہونا لے کیا کرتا تھا۔ آج اس کی آواز
نہیں آتی شاید کہیں چلا گیا۔ اس لئے میں رات دن چننا کرتا ہوں۔

داغ دل گر نظر نہیں آتا بوکھی لے چارہ گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے چارہ گراں بات کو تو تسلیم کرتا ہوں کہ میرا داغ دل پر دے میں یعنی میرے
سینہ کے اندر چھپا ہوا ہے تو اسکو دیکھ نہیں سکتا لیکن اے کجخت کیا تیرا داغ بند ہے کہ کجھ کو اس کے
جلنے کی بو بھی نہیں آتی مسائل کے ساتھ کباب کی بو آ رہی ہے اور تو اسکو نہیں سونگھ سکتا اور
دل کے کباب ہونے سے انکار کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں استفہام اقراوی ہے یعنی بو آ رہی ہے۔

ہم کہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ چاری خبر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ خود درنگی و خود فراموشی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ممکنا ہے حال کی بھی خبر نہیں رہی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ مرنے ہیں مرنے ہیں یعنی موت کے بے انتہا مشتاق و آرزو مند ہیں۔ موت
آتی ہے یعنی موت کا آنا لازمی اور ضروری ہے۔ رات دن سیکڑوں آدمیوں کا مرنے کا سننے
رہتے ہیں مگر ہم کو موت نہیں آتی ہم نہیں مرنے۔

کعبہ کس منہ سے جاو گے غالب شرم ہم کو مگر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے غالب ساری عمر تو شاہد پستی اور شرب خواری کرتے رہے اب کیا
منہ لے کر خانہ کعبہ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ ہم کو شرم نہیں آتی۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

فرماتے ہیں دل ناداں تجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ تو کسی طرح اپنے کو تکوں سے باز نہیں آتا
آخر اس درد یعنی دردِ عشق کی دوا کیا ہے۔ تیرا کیا علاج کریں جو تو ان حرکتوں سے باز آئے۔

ہم میں مشتاق اور وہ بیزار یا الہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا الہی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور عاشق و معشوق میں بڑا زوہیا زنجی باتیں ہوتی

غزل

ہیں۔ ان سے ناواقف ہے۔ اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے یزار ہونے پر تھپ کرنا ہے۔ سدا زیا دیکھو غالب ایہ شعر بھی مزار کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔
 میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
 فرماتے ہیں غیروں سے تو تم ان کی حالت پوچھتے رہتے ہو۔ مجھ کو بھی اللہ تعالیٰ نے زبان عطا فرمائی ہے مجھ سے بھی تو کبھی پوچھو کہ تیرا مدعا کیا ہے۔ دیکھو تو میں تم کو اسکا کیا جواب دیتا ہوں

~~~~~

جیکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ اسے خدا جس صورت میں کہ تیرے سوا دنیا میں کوئی دوسرا موجود ہی نہیں ہے  
 پھر یہ ہنگامہ آرا لی کیسی ہے یعنی

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزدہ و عشوہ و ادا کیا ہے  
 جب تیرے سوا کوئی دوسرا اس عالم میں نہیں ہے تو یہ پریوں کے سے حسین اور خوبصورت  
 لوگ کیسے نظر آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کے یہ غمزے اور ناز و کرشمے اوداد میں کیا چیز ہیں۔  
 شکن زلف غنیزیں کیوں ہے نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے  
 یہ خوشبودار گھونگر والی زلفیں کس لئے بنائی گئی ہیں۔ اور یہ نگہ چشم سرمہ سا کیا کام دے رہی  
 سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز سے ہوا کیا ہے  
 یہ سبزہ زار اور یہ خوشبودار پھول کہاں سے آگئے ہیں کس نے ان کو پیدا کر دیا ہے اور یہ ابر کیا  
 چیز ہے اس کی ماہیت کیا ہے اور یہ ہوا کیا ہے اس کی حقیقت حال کیا ہے۔ اس قطعہ کا مطلب یہ ہے  
 کہ دنیاں حال سے مزارعہ صاف فریاد کر رہے ہیں۔ کہ اس دلکش اودہ دلفریب منظر کو دیکھ کر ایسا مطمئن  
 نفس کس کے پاس ہے کہ آدمی ان سب تماشوں کو صحیح سمجھ کر ذات باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔  
 مطلب یہ ہے کہ اس فائنل نظر فریبتے انسان کو ایسا مشغول کر دیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی نظر  
 توجہ کرنی دشوار ہو گئی ہے۔ فریاد اس امر کی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان ساری لذتوں کو ترک کر کے

اس ذات واحد کی طرف رجوع کریں لیکن ان منظروں کی دلفریبیاں ہم کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔  
 ہم کو اُن سے وفا کی بے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ وہ بھی سلامتی سے تقدیر میں اور نادان ہیں کہ سرے سے وفا ہی کو نہیں جانتے  
 کہ وفا کس جانور کا نام ہے اور ہم عشق کے دام میں پھنس کر ایسے نادان بن گئے ہیں۔ کہ اس پر  
 بھی ان سے وفا کی امید رکھتے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہے۔ سچ تو کہتا ہے۔ اس میں شک شبہ کرنے کی کیا بات ہے فقیر  
 کی یہ صدا کہ جو بھلا کر گیا یعنی دنیا میں کسی کو کچھ فائدہ پہنچا دے گا۔ دونوں جہان میں اس کو فائدہ پہنچا  
 جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ ادروں کی طرح زبانی خراج میرے پاس نہیں ہے یعنی میں خالی دعا دینی  
 نہیں جانتا۔ جان کو تم پر قربان کرتا ہوں۔ میری بڑی دعا یہی ہے کہ اپنی جان میرے ہاتھ  
 میں آتا رہا ہوں۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے  
 فرماتے ہیں اس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ غالب ایک بیکار سا آدمی ہے لیکن تم کو تو  
 مفت کا غلام ملتا ہے۔ تم کو اس کے غلام بنانے میں کیا بُرائی ہے۔ کچھ گروہ سے دام تو خرچ کرنے  
 ہی نہیں پڑتے۔ مفت کا سودا ہے لے لو۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالبی آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے غزل

فرماتے ہیں۔ اے دوستو۔ اے ہمدردو۔ اے اندیمو۔ اے مخوارو تم سب میرے لئے یہ ہوش  
 تو کر رہے ہو کہ خدا کرے وہ بت غالبی تو آجائے۔ یہاں کہہ دو کہ ایک نام سب گھبرا کے کہہ دو۔  
 ہوا کشمکش فریغ میں ہاں جذب محبت کچھ کہہ سکوں پر وہ مر رہے چنے کو آئے  
 فرماتے ہیں میں تو اس وقت کشمکش فریغ میں مبتلا ہوں۔ مگر ہاں جذب محبت میں مبتلا ہوں۔

کشش تو تو بھی دکھا دے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مجھ میں اب بات کرنے کی طاقت باقی نہیں ہے  
ہے لیکن وہ میرے پوچھنے کو تو آجائے۔ بلا سے جواب نہ دے سکوں نہ سہی۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم آنا ہی سمجھ میں ہرے آنا نہیں گوا آئے  
فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے گھر میں تشریف لے آئے ہیں لیکن ان کی حالت صاعقہ و شعلہ  
و سیلاب کی سی ہے یعنی دم نہیں لیتے بیٹھے نہیں ٹھہرے نہیں آتے ہی جانے کا سوال ہو رہا ہے  
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا آنا بھی آنے میں خمار ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ گھر کے نہ بھاگنے لکیریں ہاں منہ سے مگر یادہ دوشینہ کی بوا  
یادہ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی گئی تھی ازراہ شوخی کے کہتا  
ہے کہ لکیریں کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مرن  
تا کہ لکیریں اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کے چلے جائیں (از یادگار غالب)  
جدا دے ڈرتے ہیں نہ واغٹے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس شخص میں چٹ آئے  
یہ شعر تصوف میں ہے گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

ہاں اہل طلب گن سنے طعنہ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے  
فرماتے ہیں۔ یہ طعنہ کس سے سُت جائے کہ برسوں اس کی طلب میں خاک چھانی اور پھر اسکو  
نہ پایا۔ ناکام و نامراد واپس آگئے ہم نے جب دیکھا کہ معرفت الہی کار از پوشیدہ دریافت نہیں ہو سکتا  
اور اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا تو ہم اپنے کو کھو آئے۔ یعنی ہوش و خرد سے محروم کر مست و مجذوب ہو گئے  
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اس دہپہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہوا کے  
فرماتے ہیں ہماری یہ عادت نہیں ہے کہ طلب دوست سے اتنا آرام سے ہو نہیں سکتا جب  
ہم کو یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا اور ہم کسی طرح اس تک نہیں پہنچ سکتے تو کعبہ جا کر  
خاند کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے یعنی یہاں بار نہ ملا تو یار کے گھر کو ہی دیکھ آئے۔  
کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر اچھے ہے آپ اس سے مگر ٹھیکو دلو آ

فرماتے ہیں میرے ہمنفسوں نے معشوق سے اثر گریہ کی بابت تقریر کی یعنی گریہ میں اثر  
ہونی کو ثابت کیا مگر ثابت نہ کر سکے اور وہ اس بنا پر کہ جب معشوق نے یہ کہا کہ رونے میں اگر تاثیر  
اور تم جس کے جانب دار بن کر یہ گفتگو کر رہے ہو کہ وہ تیرے فراق میں رات دن روتا رہتا ہے اور اس لئے  
کا تجھ پہ اثر ہو گا تو نصیب دشمنان تیرے دم پر بن جائے گی۔ یہ بالکل غلط ہے نہیں ایسا نہیں ہوتا  
آنسو بہانے میں اثر تاثیر ہوتی تو میں اس وقت رو نیوالے کے پاس ہوتا یہ نہ کہ میرے نفس گریہ کا یا اثر ہونا  
مان گئے اور دیا اس ہو کر واپس چلے آئے۔ قائل ہو جانے کے بعد یہ لوگ تو اس سے چھٹے ہے یعنی ایک  
ہم زبان بن گئے مگر مجھ کو ڈبو آئے یعنی میری گریہ کی بے اثری کا قائل ہو جانا میرے لئے شرمندگی  
کا سبب تھا۔ دوسرا پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ معشوق سے میرے گریہ کا حال کہہ دیا جس کو میں پیشہ  
رکھتا تھا۔ اب اس حال کے ظاہر ہو جانے کے بعد اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جاؤنگا۔  
اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب ہم بھی گئے وہاں اور تیری تقدیر کو فراموش  
فرماتے ہیں۔ وہ انجمن ناز یعنی تیرے معشوق کی بزم اسے غالب قابل تعریف کے ہے وہاں کسی  
کی روک ٹوک نہیں ہے دوست دشمن سب جمع ہو جاتے ہیں ہنسی مذاق غرض یہ کہ گفت و گو محبت حاصل کر  
لیں تیری بڑبڑی ہے جو تو وہاں جانے سے محروم ہے اور باریابی سے روکا جاتا ہے۔

غزل

پھر کچھ اک دل کو بقیہ رسی سینہ جو یائے زخم کاری ہے  
فرماتے ہیں۔ پھر دل میں چینی پیدا ہو گئی ہے اور ہر وقت گدگدی سی ہوتی رہتی ہے  
معلوم ہوتا ہے کہ عشق کا زخم کھانے کی دوبارہ خواہش پیدا ہو گئی ہے۔  
پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمد فصل لالہ کاری ہے  
فرماتے ہیں۔ ناخن نے پھر جگر کریدنا شروع کر دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیاہ کامو پھر  
آگیا ہے۔ باغ میں لالہ گل کھلیں گے اور سودا پھر زور پکڑے گا اہل جوان کے زخم پھر تازہ ہو جائیں گے۔  
قبلہ مقصد لگا و نیاز پھر وہی پردہ عماری ہے  
فرماتے ہیں۔ پھر نگاہ نیاز کا قبلہ مقصد وہی پردہ عماری بن گیا ہے جس میں محبوب گھر ہے



مطلب یہ ہے کہ یہی کی طرح ہمارے مشوق کو بھی محل میں سوار ہونیکا شوق پیدا ہو گیا ہے۔

~~~~~

چشم دلال جنس سوانی دل خریدار ذوق خواری ہے
فرماتے ہیں: کچھ جنس سوانی کی دلالی کرنے لگی ہے اور وہ ذوق خواری کا خریدار بن گیا ہے یعنی دیوانہ ہو گیا ہے۔

وہی صد رنگ نالہ فرسائی وہی صد گو نہ اشکباری ہے
پہلے شعر کی تفصیل اس شعر میں بیان فرمائی ہے یعنی دل سو سو طرح سے نالہ فرمایا کرتا ہے جس کا انجام دلت و خواری کے اور کیا قرار پاسکتا ہے اور آنکھ سو سو طرح سے اشکباری کرتی ہے جو سوانی اور بدنامی کا موجب ہے۔

دل ہوائے خرام ناز سے پھر محشر تان بیقراری ہے
فرماتے ہیں: خرام ناز کے شوق میں پھر ہمارا دل بیقراری کے لئے میدان مشرب گیا ہے جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے روز بازار جان سپاری ہے فرماتے ہیں: جلوہ یا رستل ناز و غرور کو دکھا کر کہہ رہا ہے کہ کون عاشق جانتا ہے اس کا خریدار بنتا ہے گویا بازار جاں سپاری کی ہر روز گرمی بازار ہے۔

پھر اسی بے وفایہ مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے
فرماتے ہیں: پھر اسی بی وفایہ کا عشق دوبارہ پیدا ہو گیا ہے یعنی پہلے جس پر مرتے تھے اور پھر اسی طرح سے زندگی کے دن بسر رہے ہیں جس طرح پہلے بسر جوتے تھے۔

~~~~~

پھر کھلا ہے درِ عدالت ناز      گرم بازار فوجداری ہے  
فرماتے ہیں: تبیل ختم ہو گئی پھر عدالت ناز کے دروازے کا قفل وا ہو گیا۔ آجکل پھر فوجداری کا بازار گرم ہو گیا مطلب یہ ہے کہ قفل کُل کے آتے ہی پھر عشق و جنون کے

دلوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

مورہا ہے جہان میں اندھیر  
زلزلہ کی پھر سرشتہ داری ہے  
فرماتے ہیں جہاں میں پھر جہاں اندھیر مورہا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ زلزلہ کو  
پھر عہدہ سرشتہ داری مل گیا ہے

پھر کیا پارہ جگر نے سوال  
ایک فریاد و آہ داری ہے  
فرماتے ہیں پارہ جگر نے پھر دعویٰ دائر کر دیا ہے پھر چاروں طرف فریادی ٹوٹ پڑے ہیں  
پھر ہوس کے میں گواہ عشق طلب  
اشکباری کا حکم جاری ہے  
فرماتے ہیں پھر عدالت کے ڈر و عشق کے گواہ پیش ہو رہے ہیں۔ اشکباری کا حکم جاری ہے  
آئندہوں کے ساتھ بخون دل کنت جگر کو عشق کی شہادت میں پیش کر رہا ہے۔

دل و مثر گاہ کا جو مقدمہ تھا  
آج پھر اس کی رو بکاری ہے  
فرماتے ہیں مثر گاہ یا اور دل عاشق میں جو باہم مقدمہ بازی ہو رہی تھی آج پھر عدالت  
زمین اس کی رو بکاری ہے یعنی دونوں فریق اپنا اپنا ثبوت دعویٰ اور جواب دعویٰ پیش کر رہے  
ہیں۔ مرزا صاحب کی حدت پسند طبیعت اشعار میں نئی نئی ترکیبیں پیدا کئے بغیر رو نہیں سکتی  
چنانچہ یہ قطعہ بھی ان کی نہرت بیان کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

یہ بخودی بے سبب نہیں غالب  
کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے  
فرماتے ہیں۔ اے غالب۔ یہ بخودی بے سبب نہیں ہے کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے جس کے  
پھینکے کی غرض سے یہ بخودی ظاہری ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اخفائے راز عشق کے  
لئے یہ پردہ بخودی حاصل ہوا ہے۔

جنون بہت کشش نہیں ہو گرشادمانی کی  
نکپاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی  
فرماتے ہیں۔ اے جنون۔ تجھ پر کشش کی قیمت سیر ٹھوڑی دیر کے لئے شادیاں ہو جانے کی وجہ سے  
نہیں عائد ہو سکتی۔ اگر میں دم بھر کے لئے خوش ہو گیا تو اس کے سنی یہ نہیں ہیں کہ تجھ پر خدا نخواستہ

شادمانی کی تہمت لگا دی جائے گی۔ مجھ کو محنت کی شادمانی تو زخمِ دل پر نمک پاشی کے سبب ہے  
 تسکین کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ زخمِ دل پر لذت زندگانی کا نمک پاشی ہوا ہے  
 مطلب یہ ہے کہ بھارا ایسے بُرے حال سے زندہ رہنا زخمِ دل پر نمک چھڑک رہا ہے اور زخمِ دل پر  
 نمک چھڑکنے سے زخموں میں سوزش اور تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے نہ کہ تسکین۔

کٹاکش ہائے ہستی سے کیے کیا ہی آزادی ہوئی زنجیرِ مروج آبِ فرصتِ روانی کی  
 فرماتے ہیں آزادی چاہے جتنی کوشش کر لے مگر دنیا میں اگر ہستی سے کوئی آزاد نہیں ہو سکتا  
 دریا کی موجوں کو دیکھ لو وہ آزاد ہونے کے لئے جہدِ ممکنہ کرتی ہیں۔ اسی قدر زنجیروں میں زیادہ الجھتی چلی  
 جاتی ہیں مطلب یہ ہے کہ غلامیِ ہستی سے انسان جہدِ آزاد ہونے کی کوشش کر لے اسی قدر  
 اس کی گرفتاری بڑھتی جاتی ہے۔ انجام کار اس کی کوشش کوشش سے مغلوب ہو جاتی ہے۔  
 پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ غلامی شہزادہ شگ کے تربت میرے گفتگانی کی  
 فرماتے ہیں۔ مرجانے کے بعد بھی تیرے دیوانہ کو لڑکوں نے زیارت گاہ بنا رکھا ہے اور وہ

اب تک بھی میری قبر پر آکر پتھر مارتے ہیں۔ شہزادہ شگ کے پھول قبر پر ہر روز چڑھائے جاتے ہیں۔  
 نکویش سزا فریادی بیداد دلبر کی مہا داخندہ دندان نما ہو صبحِ محشر کی  
 فرماتے ہیں ظلمِ معشوق کی فریاد کرنے والے مجرم کی سزا جبر و ملامت ہے۔ میں ڈرتا ہوں

کہیں ایسا نہ ہو صبحِ محشر بھی اس کو محنت کے حق میں خندہ دندان، نابین کر نو دار ہو۔  
 رگِ سیلی کو خاکِ دستِ مجنوںِ رشکی بختے اگر لڑے بجائے دانہ دہقان نوکِ نشتر کی  
 مشہور ہے کہ ایک بار سیلی کی نصد ہوئی تھی اور قیس کی رگِ بازو سے خون جاری ہو گیا تھا۔

فرماتے ہیں۔ دستِ مجنوں کی خاکِ گیلی کو زخمی کر دے اگر دہقان غلہ کی جگہ نوکِ نشتر بوسے۔ مطلب  
 ہے اگر دستِ مجنوں میں دانہ کی جگہ نوکِ نشتر ہو تو زمین سے بجائے کوئل کے رگِ سیلی پیدا ہو  
 یعنی جذبہ عشق نے عاشق و معشوق اور رگِ نشتر میں امتدادِ اتحاد باہمی پیدا کر دیا ہے۔  
 پرہیزانہ شاید یاد بان کشتی سے تھا ہوئی مجلس کی گرمی سے لٹی دو رانگی

فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پر وادہ کا پرے کی کشتی کا بادبان تھا اس لئے کہ جب جس  
غوب گرم ہو گئی تو دیر سا غرچنے لگا مطلب ہے جہاں نیم آرائی ہوتی ہے وہاں شمع روشن کی  
جاتی ہے اور جہاں شمع روشن ہوتی ہے وہاں پروانوں کا لشکر آدھکتا ہے اور گرمی مجلس الانی  
دیر سا غر کا سبب قرار پاتی ہے تو شاید کشتی کے کا بادبان پر پر وادہ ہوتا ہے۔

کروں بہرہ و ذوق پر فشانے کا قدر کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میر شہیر کی  
فرماتے ہیں میری کیا مجال ہے جو ذوق پر فشانے کے ستم و جور کو عرض کر سکوں۔ پھر کئے سے  
پہلے شہیر کی طاقت نے جواب دیدیا۔

کہا نیک رُوں اس کے خیمہ کے چھپے نیابہ مری قسمت میں یا رکب نہ تھی دیوار تھری  
فرماتے ہیں خیمہ کے چھپے کہا نیک رُوں۔ قیامت یہ ہے کہ یارب میری قسمت میں تھری کی دیوار  
بھی نہ تھی مطلب یہ ہے کہ نہ تو گری میں اتنا جوش ہے کہ کم سے کم قنات خیمہ کو پہاڑ سے اور راکا  
دیدار نصیب ہو جائے نہ رونے میں ایسا اثر ہے کہ وہ خیمہ سے گھبرا کر باہر نکل آئے یا ہم کو خیمہ  
کے اندر بلا لے اور قسمت سے بجائے قنات خیمہ نگیں دیوار بھی نہیں ہے کہ ناامید ی اور  
ایو سی کی حالت میں دیوار سے ہر ٹکرا کر مرجائیں۔

غزل بے اعتدالیوں سبک سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے  
فرماتے ہیں جب قدر ہم نے اپنی حد سے تجاوز کیا اسی قدر لوگوں کی نگاہوں میں سبک ہوئے  
پہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے  
جو مطلب اس طریقہ سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے تو  
مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا (از یادگار غالب)

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یا شک ہے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے  
فرماتے ہیں۔ ہمارے ہی ہستی ہماری فنا پر دلیل ہے ہم اس قدر بے ہیں کہ آپ اپنی قسم  
بن گئے ہیں کسی شے کے نہ ہونے کو محاذ سے میں یوں کہتے ہیں کہ فلاں شے ہمارے پاس قسم کھانے کو



یعنی نہیں ہے اور اس قسم پر یہ بھی بولا جاتا ہے کہ نام کو بھی نہیں ہے یعنی اگر وہ شے برائے نام ہی  
 ہوئی تو ثبوت قسم کے لئے کافی سمجھی جاتی اور اس طرح کی ہستی جو برائے قسم یا برائے نام ہو وہ ہستی فنا کی ہے  
 ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ہستی کو استبداد بنا دیا ہے کہ قسم کھانے کے لائق بھی باقی نہیں رہی۔  
 سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے  
 فراتے ہیں عشق کی سختیاں کھینچنے والوں کی یعنی اپنے عشاق مصیبت زدہ کی خبر کیا دریافت  
 کرتے ہو وہ لوگ گھٹتے گھٹتے یعنی نسا ہوتے ہوتے سراپا الم بن گئے مطلب ہے کہ جس طرح رنج و الم  
 ظہور محسوس شے نہیں ہے یہی حال ان بد نصیبوں کا ہو گیا کہ گھٹتے گھٹتے قطارے پوشیدہ ہو گئے  
 تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہریس تیرے سوا بھی ہم یہ بہت سے تم ہوئے  
 فراتے ہیں تیری وفا سے تیری ہی جفا کی تلافی ہو سکتی ہے اور ہم ایسے ستم زدہ ہیں کہ تیرے  
 علاوہ زمانہ نے بھی ہزاروں ستم ہم پر کئے ہیں۔ ان کی تلافی تیری وفا سے کیونکر ہو سکتی ہے مطلب  
 ہے کہ اگر رحم کھا کر اپنی جفا کی تلافی کرتا ہے تو پھر ایسا کر کہ عمر بھر کے لئے ہمیں کوئی شکایت ہی  
 پیدا نہ ہو یعنی دنیا کی تکلیفوں سے بھی تیری بدولت چھٹکارا ہو جائے۔ میرزا صاحب عشق  
 کو بہرہ بان پا کر اور پاؤں پھیلاتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں ہر چند اسمیں ہاتھ ہمارے قلم چسے  
 جنوں سے یہاں مراد عشق ہے فراتے ہیں ہم عشق کی حکایات خونچکاں اپنے اشعار میں لکھتے  
 رہے ہیں باوجودیکہ معشوق نے ہمارے ہاتھ قلم بھی کئے تو بھی ہم گدے ہوئے معاملات نظم کر لئے  
 باز نہ آئے ایک شارح صاحب نے میرزا کے اس مصرعہ ثانی پر اپنی جودت طبع دکھانے کے لئے  
 ستر مصرعہ لگائے ہیں مگر اس سجدان کی رائے میں میرزا کا مصرعہ اولیٰ مستحق سبقت حاصل کیونکہ  
 اندری تیری تشددی نوحہ کیے ہم سے اجڑائے تالہ دل میں سیر زرق ہم ہو  
 فراتے ہیں تیری بد مزاجی کے ثبوت سے تالہ لب بکشت آسکا تالہ دل و لہی میں نہیں ہو گیا  
 اداس کا ایک جزو دوسرے جزو کو اسی طرح نوش جان فرما گیا جس طرح ثوبت سے رگوں میں

خون خشک ہو جاتا ہے۔

اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ ہر عشق جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم سے

فرماتے ہیں، بوہوسوں کی جیت اسی میں ہے کہ میدانِ عشق کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور وہ لوگ

چنے دل میں یہ سمجھیں کہ میدان سے بھاگتے وقت جو پاؤں اٹھا وہ گویا علمِ فتح کا بلند ہوا جھانڈی

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے جو ان کھنچ کے سر پہاڑ کے دم سے

فرماتے ہیں ہم اذلی بہ نصیب ہیں۔ ازل میں بھی نالہ کشتی کا منصب ہم کو عطا ہوا تھا جو نالہ

دیاں کھینچنے سے باقی رہ گئے تھے وہ دنیا میں آکر ہمارے لئے سانس بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ

ہم نہ عدم میں خوش تھے نہ وجود میں، کہ خوش رہے ہمارے لئے سانس بھی نالوں کا حکم کرتا

چھوڑی، استدہا ہم نے گدالی میں لگا سانس جوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

فرماتے ہیں۔ اے استدہا ہم نے گدالی میں بھی عاشق مزاجی ترک نہ کی سانس بوسے کی

حالت میں جس کسی نے نہیں سیدھ لکھ دیا ہم اسی کے عاشق ہو گئے

جو نہ نقد داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی تو فسرِ دگی نہاں ہے بہ کین بے زبانی

غزل

فرماتے ہیں۔ اگر شعلہ عشق میرے داغِ دل کی حفاظت نہ کرے یعنی اسے ٹھنڈا ہوئے

سے نہ روکتا رہے تو فسرِ دگی کا قابو چل جائے جو بے زبانی کے پردہ میں چور کی طرح چھپی ہوئی ہو

ہے اور قابو ڈھونڈ رہی ہے کہ ذرا غافل پاؤں تو اشرافی داغِ دل کو لے بھاگوں۔ مطلب یہ ہے

کہ اگر شعلہ عشق داغِ دل کی ہر وقت خبردار رہے نہ کرتا رہے تو داغِ دل ٹھنڈا ہو جائے۔

مجھے اس سے کیا توقع یہ زمانہ جوانی کبھی کو دکی میں حسینے مٹی مری کہانی

فرماتے ہیں۔ کم عمری میں کہانی سننے کا شوق بہت ہوا کرتا ہے۔ اس عمر میں تو اس مفروضہ

کبھی مری کہانی مٹی ہی نہیں۔ اب جوانی کے زمانہ میں مجھے اس سے کب یہ توقع ہوتی ہے

کہ مری مصیبت کی داستان بنیگا۔

یونہی دیکھ کسی کو دنیا نہیں خوب نہ کہتا کہ میرے عدو کو مارے میری نگاہ

فرماتے ہیں۔ بے وجہ کسی کو تکلیف دینا اپنی اچھی بات نہیں ہے۔ ورنہ میں ضروریہ دعا مانگتا کہ اپنی  
برخی صیبتیں دشمن کو مل جائیں جو میرے رنج و غم کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

گزل  
تمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے      اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

میرزا صاحب نے خود ہندی میں خود اس مطلع کی شرح لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ایک شمع  
ہے دلیل سحر سو خموش ہے۔ یہ خبر ہے پہلے مصرعہ کی مصرعہ ظلمت کدہ سے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے  
بتدار ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہے (اندھیرا ظلمت غلیظ) سحر پید اگوا خلق ہی نہیں  
ولی ماں ایک دلیل صبح کی بود پر ہے یعنی بجھی ہوئی شمع اس رات کے شمع و چراغ صبح کو بجھ جائیگا  
یہ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے سبب اسباب  
ریکی کے پس دیکھنا چاہئے جس گھڑی علامت صبح سورہ ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

نئے مزدہ وصال نہ نظارہ جمال      مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش سے  
فرماتے ہیں۔ اب نہ وصل کا مزدہ کانوں کو حاصل ہوتا ہے نہ جمال کا نظارہ آنکھوں کو شیر  
تا ہے۔ مدت ہو گئی کہ چشم و گوش میں باہم اتحاد و اتفاق پیدا ہو گیا ہے یہ مطلب ہے۔ ورنہ  
مذکر کیا کہ آپ آنکھوں کو اگر نظارہ جمال ہوتا تھا تو کانوں کو رشک پیدا ہو جاتا کرتا تھا کہ ہم کو بھی  
اغزو ملے یا نہیں کانوں تک وصل کی خوشخبری پہنچ جاتی تھی تو آنکھوں کو حسد پیدا ہو جاتا تھا کہ  
نوں نے تو خردہ وصل میں لیا اور ہم نظارہ جمال سے محروم ہیں۔

مے لئے کیا ہے حسن خود آرا کو عجب اب      اسے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے  
فرماتے ہیں۔ شراب نے حسن خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے۔ اسے شوق لب عاشق اب تجھ کو بھی  
اجازت ہے کہ تو بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہوش و حواس اس حسن عجب اب کو نہ کر دے۔  
پتھر کو عقد گردن خواباں میں دیکھنا      کیا اوج پر ستارہ گوہر فروزش ہے۔  
فرماتے ہیں۔ موتیوں کا ہمارے سینوں کی گردنوں میں دیکھنا نصیب ہو گیا ہے۔ گوہر  
موتی کا ستارہ کس قدر اوج پذیر ہے۔



دیدار بادہ جو حملہ ساقی نگاہ مست بزم خیال سیکدہ میخروش ہے  
 فرماتے ہیں دیدار تو شراب ہے اور تو صلہ ساقی ہے اور نگاہ میخوار ہے خیالی مجلس نیک  
 ایسا سیکدہ ہے جس میں کسی قسم کا غل شور ہی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بزم خیالی محب  
 سرور فرما منتظر ہے ہر عہد اولیٰ میں اضافت کہیں نہیں ہے۔

اے تازہ واردان بساط ہوا کے دل زہدار اگر تمہیں بزم ناسے نوش ہے قطع  
 فرماتیں۔ اے نوجوانو تم نفسانی خواہشوں میں تازہ گرفتار ہوئے ہو۔ خبردار اگر تم کوٹنے  
 کا ستنا اور شراب کا پینا منظور ہے تو۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نوش ہے  
 بھگد کو دیکھو اور میرا دل دیکھ کر عبرت حاصل کرو اور نے کے مقابلہ میں میری نصیحت  
 گوش دل سے سنو اور وہ نصیحت یہ ہے کہ۔

ساقی بیلوہ دشمن ایمان آگہی مضر بے نغمہ رہن بکین ہوش ہے  
 ساقی اس جلوہ گری کے ساتھ ایمان و آگہی کا دشمن واقع ہوا ہے اور مضر بے ہوش  
 خوش گلوئی کے ساتھ بکین و ہوش کا لوٹ لے جانے والا ہے۔

یاشیب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ نشا دامان باغبان و کفٹ گل فروش ہے  
 یا تو رات کو نظر کے سامنے وہ تماشا ہو رہے تھے کہ فرش کا ایک ایک کونہ پتھلوں کی  
 آرائشگی سے باغبان کا دامن اور گل فروش کا ہاتھ بنا ہوا تھا یعنی عجب دلچسپی اور دل فریبی  
 کے سامان جمع ہو گئے تھے اور ان کی تفصیل یہ ہے۔

لطف حرام ساقی و ذوق صدائے چنگ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے  
 ساقی کی ستانہ چال پامال کئے دیتی تھی اور چنگ و رباب کی آواز کھینچے لیتی تھی ایک طرف  
 تو نگاہ کے لئے جنت کا سماں دوبر وقت تھا اور دوسری طرف کمانوں کے واسطے فردوس کی نورانی



کے لطف حاصل ہو رہے تھے یہ گویا جوڑیں تھیں اور وہ طیور خوشنوا۔

یا صبحم جو دیکھئے آکر وہ بزم میں نے وہ سرود و سوز نہ جوش و خروش ہے  
صبح کے وقت جو آکر دیکھا تو بزم میں عجب اداسی اور بیرون فنی پائی جاتی تھی نہ تو وہ باجوں کی  
آر زین تھیں نہ وہ اہل بزم کا سوز و گداز تھا نہ وہ محفل کا جوش و خروش تھا۔

داغ فراق صحبتِ شب کی علی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے  
ان سب کیفیتوں اور سامانِ انبساط کے بدلے یہ نظر آیا کہ صحبتِ شب کی علی ہوئی اور داغ  
فراق سے افسردہ فضا پر ایک شمع باقی ہے اور وہ بھی کچھ تیل عاشق کی طرح بجھی ہوئی ہے۔

آئے ہیں غیب کے یہ مضامین خیال میں غالب صریحاً نہ نوائے سرودش ہے  
حق تو یہ ہے ایسی زبردست غزل کہ میرزا صاحب کا یہ مقطع لکھنا ہرگز تعلق میں اقل نہیں  
ہے بلکہ حقیقت حال ہے۔ فرماتے ہیں میرے خیال میں ایسے مضامین بلند غیب سے وارد  
ہوتے ہیں۔ اسے غالب میرے خاصہ کی آواز فرشتہ کی صدا سمجھنی چاہئے۔

آگ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے طاقتِ بیدار انتظار نہیں ہے غزل  
فرماتے ہیں آ اور غلبہ آ کہ میری جان زار کو صبر و قرار باقی نہیں رہا ہے اب مجھ میں  
بیدار انتظار رہنے کی طاقت باقی نہیں ہے۔

دیتے ہیں جنت حیات ہر کچلے نشہ باندازہ خمار نہیں ہے  
فرماتے ہیں جنتِ حیات کے بدلے جنتِ عطا فرمائی جائیگی لیکن دنیاوی تکلیفوں کی تلافی  
جنت سے نہ ہو سکے گی اور اس بیان کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ جس نے نشے کے آثار کی  
مصیبت بے انتہا اٹھائی ہو۔ اور اس کے بعد اسکو تموثری مقدار میں شراب پکائے تو کیا نشہ کر سکتی ہے  
گر یہ نکالے ہے تیری بزم سے کچھ بوائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

فرماتے ہیں میرا فنا تیری بزم سے مجھ کو نکال رہا ہے یعنی آئسو توڑ کتے نہیں اور میں شرم  
مذاقی سے بزم میں ٹھہر نہیں سکتا افسوس اس بات کا ہے کہ مجھ کو اپنے رونے پر بھی دل کی

طرح سے اختیار حاصل نہیں ہے۔ آنسوؤں کا روکنا میرے اختیار سے باہر ہے۔

ہم سے عجبے گمان بخش خاطر خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے  
 فرماتے ہیں ہم لوگوں سے بخش خاطر کا گمان بیفائدہ ہے عشاق تو ایک شست خاک  
 زیادہ حقیقت نہیں رکھتے جو زندگی میں خاک ہو گئے ہیں۔ ان میں غبار خاطر کو دخل نہیں ہے۔  
 دل سے اٹھا لطف جلو ہائے مولیٰ غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ جلوہ سانی آئینہ دل میں اسی طرح سے نظر آیا کرتا ہے جس طرح آئینہ گل میں  
 بہار کا حسن و جمال دکھائی دیا کرتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بار دے اگر عہد استوار نہیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ اس نے خدا خدا کر کے میرے قتل کرنے کا عہد تو کر لیا ہے یعنی یہ تو گہریا  
 ہے کہ تجھے ہم ضرور قتل کر دیں گے۔ ہائے اگر یہ عہد مضبوط نہیں ہے تو بڑا ستم ہو گا۔  
 تو نے میکشی کی کھائی ہے غالب تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے غالب تو نے میکشی کی قسم کھائی ہے تیری قسم سے یہ ثابت نہیں ہے  
 کہ ترک میکشی کی قسم کھائی ہے یا میکشی کرنے کی اور جب تیری قسم سے یہ دونوں پہلو جھٹک رہے  
 ہیں تو ہمیں تیری قسم کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔

عزل ہجوم غم سے یا تنک سرنگوئی مجھ کو حال ہے کہ تار اس وقت نظر میں فرق شکل ہے  
 فرماتے ہیں میرے ہمت میں اتنا غم آگیا ہے کہ اس کے بوجھ سے میرا سر میرے دامن تیار  
 اس طرح جابلا ہے کہ نظر کے تار اور قبا کے تاروں میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔  
 رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سون کی سمجھت کہ پاس در سے دیوانہ غافل ہے  
 فرماتے ہیں۔ زخم میں ٹانے لگانے سے مجھ کو لذت زخم سوزن مطلوب ہے اور اس لذت کو  
 حاصل کر کے جو میں بے خود در ہوش ہو جاتا ہوں اور پھر ہوش میں آکر لطف سے تڑپ  
 جاتا ہوں تو اس کو یہ نہ سمجھت کہ درد زخم کی وجہ سے دیوانہ غافل ہو گیا ہے۔

وہ گل جس گلشن میں جلوہ فرمائی کر رہا تھا  
 چمکنا غنچہ و گل کا صحنے خندہ دل سے  
 فرماتے ہیں۔ وہ گل اندام جس باغ میں اسے غالب سیر کے واسطے جاتا ہے اسکے صن و نگار کے  
 اثر سے گلاب کی کلیاں جھجکتی ہیں۔ ان میں سے خندہ دل کی آواز نکلتی ہے مطلب یہ ہے کہ اس  
 کو دیکھ کر باغ کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔

پایہ امن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرائے نور  
 خارِ پایہں جو ہر آئینہ زانو مجھے قطع  
 فرماتے ہیں میں صحرائے نور کی عادی تھا۔ بھوری پایہ امن ہو کر یعنی پاؤں توڑ کر گھر میں  
 بیٹھ رہا ہوں۔ صحرائے نور کے زمانے میں جو کانٹے میرے پاؤں میں چبھے تھے وہ اب آئینہ  
 زانو کا جوہر بن گئے ہیں زانو کو آئینہ سے تشبیہ دیتی ہے اور آئینہ فولادی کے جوہر کانٹوں سے شائبہ کہتے ہیں  
 دیکھنا حالت کے دلکی ہم آغوشی کے وقت  
 فرماتے ہیں ہم آغوشی کے وقت میرے دل کی حالت دیکھنے کے قابل ہوگی یعنی یہ دل  
 ہے جو برسوں تیری زلفوں میں اسیر رہ چکا ہے۔ اس لئے یہ تیرے ایک بال کو نگاہ آشنا سمجھا ہے  
 اور کسی دوست کے دل کا حال دوست کو خوب معلوم ہوتا ہے۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ  
 ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں چھپے تو مجھے  
 فرماتے ہیں میں وہ باجا ہوں جس میں تیری شکایت کا راگ بجا ہوا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو غیروں کے  
 سامنے مجھے نہ چھپے اگر تو مجھ کو چھپے لگا تو تیری شکایت کا راگ میرے دل سے نکلنا شروع ہو جائیگا  
 جس جنم میں تیرے گفتار میں آئے  
 جان کا لبد صورت دیوار میں آئے غزل  
 فرماتے ہیں: ازوار کے ساتھ جن جنم میں تو باتیں کرتا ہے اس مکان کی دیواروں پر جو  
 تصویریں لگی ہوتی ہیں۔ ان میں جان پڑ جاتی ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھر میں سرو صنوبر  
 تو اس قد نگار سے جو گلزار میں آئے  
 فرماتے ہیں سرو صنوبر سایہ کی طرح تیرے ساتھ ساتھ پھرتے ہیں۔ پھر گلزار کے پابند  
 نہیں اگر تو اس قد نگار سے ایک بار بھی مل نہیں جاتا ہے (تسے) کے معنی یہاں ساتھ یا ہمراہ ہے۔



اکثر اہل زبان محاورے میں اسکو اسی طرح استعمال کرتے ہیں میزرا کا یہ شعر بیت الغزل ہے  
تب تازگرا نائیکی اشک بجا ہے جب لخت جگر دیدہ خونبار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ ہم اسوقت اپنے آنسوؤں کو انمول موتی سمجھیں گے۔ جب جگر کے ٹکڑوں  
کے ساتھ اشکوں میں مل کر دیدہ خونبار میں آجائیں گے۔

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ شکر کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے  
یہ دوسرا شعر بھی حاصل زمین ہے ایسے گرا نقدر شعر ایسی سست زمینوں میں تکی کسی  
کو نصیب ہوا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو اپنی ستم گاری کا لطف اٹھانا ہے تو مجھ کو شکایت  
کی اجازت دیدے۔ اگر صبر و خاموشی کے ساتھ میں نے تیرے ظلم و ستم اٹھائے تو تجھ کو کب  
معلوم ہوگا کہ کون سا تیر جفا تیرا زیادہ کارگر ہوا اور کون سا نوک بیدا تیرا اوجھا ختم و اتساؤ لکل گیا  
اب چشم فسوں گر کا اگر ملے اشارہ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ اس کی چشم فسوں گر کا اشارہ پا جائے تو آئینہ بھی طوطی کی طرح باتیں کرنے لگے  
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یاز اکل بلہ پا وادی پر خار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ کانٹوں کی خشکے بانی پیاس کی وجہ سے ہے آبلو نکا پانی لجاے تو ان کی تسکی منع ہو  
مرداؤں کیوں رشک سے جڑ تن نازک آغوش خم حلقہ زنا میں آئے  
فرماتے ہیں۔ میرا معشوق زنا رہندہ ہے اس کے دوش پر زنا رو دیکھ کر مجھ کو رشک آتا ہے  
کہ وہ نازک جسم میرے آغوش میں تو نہ ہو اور حلقہ زنا میں ہو۔ میر جلنے کی جگہ ہے۔

غازگر ناموس نہ ہو گر ہو کس زر کیوں شاید گل باغ سے بازار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ گل کو ہوس زر ہے یعنی گلاب میں جو زیرہ ہوتا ہے اسکو زر گل کہتے ہیں۔ اب  
گل کو یہ ہوس ہے کہ اس زر کو زیادہ ہونا چاہئے۔ اس لئے ہوس زر سے اس کو بازار میں بکنے کے  
واسطے آنا پڑا اور اس صورت میں پر بادی ناموس ظاہر ہے یعنی شاہد بازار میں بن گیا۔  
تب چاک گریباں کا مزا ہے لالہاں جب اک نفس اکجھا ہوا بہارا میں آئے



فرماتے ہیں۔ اے دل تالاں گریاں چاک کر لے کامرہ یہ ہے کہ تارِ گریبان کے  
ساتھ سانس ہی کھینچ آئے اور تارِ نفس ٹوٹ کر دم نکل جائے۔  
آتشکدہ ہے سینہ مراراز نہاں کے اے دائے اگر معرضِ اظہار میں آئے  
فرماتے ہیں میرا سینہ راز نہاں کی گرمی سے آتشکدہ بن گیا ہے۔ اگر وہ راز ظاہر  
ہو گیا تو معلوم نہیں کہاں کہاں آگ لگ جائے گی۔

گنجینہ معنی کا طلسم اسکو سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ اے غالب میرے اشعار کا ایک ایک لفظ گنجینہ معنی اور طلسم معنی سمجھنا چاہئے یعنی میرے  
ایک لفظ میں کئی کئی معنی ہوتے ہیں اس لئے اسکو گنجینہ سمجھنا چاہئے اور طلسم اس وجہ سے اسکو  
کہا جاتا ہے کہ ایک ایک معنی میں کئی کئی پہلو نکلتے ہیں اور طلسم کی تعریف یہ ہے کہ شکل سے  
کھلے اور نہایت حیرت انگیز ہو اس لئے اسکو طلسم کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا کلام بہت  
دشواری سے سمجھ میں آتا ہے اور سمجھ جانے کے بعد اس کے معنی سے ایک حیرت پیدا ہوجاتی ہے  
حسنِ مرہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے اس کے میرا مرہ خورشیدِ جمال اچھا ہے  
دوسرے مصرعہ میں دعویٰ متضمن دلیل ہے۔ مشوق کو مرہ خورشیدِ جمال اس لئے کہا  
ہے تاکہ اس کو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے (از یادگار غالب)

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہر لحظہ نگاہ  
میرزا نے اس شعر میں حرص و آرزو مشوقانہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ فرماتے ہیں ہر لحظہ یعنی بار بار  
دل پر نگاہ ڈالتے ہیں جس سے دل کا سوال پیدا ہوتا ہے اور بوسہ دینے سے صاف انکار ہے چہرہ  
کے تغیراتِ ملی خیالات کے ترجمان ہیں دل تو یہ کہہ رہا ہے کہ مال اچھا ہے چھوڑنا چاہئے مگر ناز  
مشوقانہ جو حرص کا پہلو لئے ہوئے ہے وہ یہ تعلیم دے رہا ہے کہ اگر مفت میں مل جائے تو  
اس صورت میں اچھا مال ہے۔ پھر کسی موقع پر بوسہ کو جان کی قیمت میں لگانے لگے۔  
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جاگم سے یہاں جاگم سہاں اچھا ہے

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جام جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک مسمیٰ سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جسکی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے فائق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزہ میں بھی شراب پی جاسکتی ہے۔ اب قوت تخیل نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیکر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام سفال کے آگے جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بین کا ایک تقریب پیرایہ دیکر اس قابل کر دیا کہ زبان اسکو پڑھ کر زبان تملذذ اور کان اسکو سن کر محفوظ اور دل اسکو سمجھ کر متاثر ہو سکے اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا انجمنش ہے اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لبس بنیکر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اسکا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں انجمنش کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بھرپور غایت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بیاضی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے (از مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ) بے طلبی تو ہر اس میں ملتا ہے وہ گداحکو نہو جوئے سوال چھاپے

نہایت میں سوال کی تمنی عطا کی شیرینی کو بد مزہ کر دیتی ہے جو چیز بے طلب غنایت فرمائی جا اس کے لطف کا کیا کہنا ہے۔ وہ گداحکو عادات سوال کی نہ ہوا چھاپے اس شعر میں ریف کی نسبت ایسی زبردست واقع ہوئی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

ان کے آئینے جو آجاتی ہے رونق منہ پر وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور رنجوری ہوتی طبیعت بحال ہوجاتی ہے نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب عاشق اپنی حالت ارادہ اس کی بدن کو صدمہ نہ پہنچائے دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم

تھا کہ بعضی خوشی سے وقفہ ایسی بشت ہو سکتی ہے کہ رنج اور غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے اور اپنی بختشن نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح سے اپنی جدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اس وقت معشوق نہیں ہوتا اور جب معشوق ہوتا ہے اس وقت تکلیف نہیں رہتی اس حال میں بھی بختشن کا عمل معنّا اور لفظاً دونوں طرح بدرجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحب ذوق سلیم پر ظاہر ہے (از مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ)

دیکھئے پلے ہیں عشاق توں کے کیا ہیں اک بہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے گویا معشوق کی تنہا میں ایسا متفرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا یا با نہیں آنے کی لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ وغیرہ (از یادگار غالب)

ہم سخن پیشہ نے فریاد کو شیریں سے کہا جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے فرماتے ہیں۔ فریاد ایک مزدور پیشہ جو ان تھا اور شیریں اس کی معشوقہ ایکٹ سے دولت مند خاندان کی عورت اور نہایت با عصمت تھی مگر رنگتے اشی کے کمال نے فریاد کو شیریں تک پہنچا کر اس سے ہم کلام کر دیا دنیا میں کمال عجیب ہے۔ اہل کمال کی احتیاج بادشاہوں کو بھی ہوتی ہے۔ قطرہ دریا میں جوئل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے فرماتے ہیں مرغ کا اپنی اہل کی طرف رجوع کرنا زمانے کے سارے کاموں کا اچھا کام ہے خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز شاہ کے باغ میں یہ تازہ بہار اچھا ہے شاہزادہ خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے ایک صاحبزادے تھے۔ یہ شعر ان کی مدح میں ہے ہم کو معلوم ہے حبت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے فرماتے ہیں۔ اسے غالب ہم کو حبت کی حقیقت معلوم ہے لیکن دل کے بہلانے رکھنے کو یہ



خیال اچھا ہے میرزا صاحب نے اس مقطع میں قیامت کی شوخی برتی ہے۔

نہوئی گر مرے مرنے کی سہی امتحان اب بھی باقی ہو تو بھی سہی  
اس مطلع کی نسبت مولانا اہلباب نے لکھنوی تحریر فرماتے ہیں: اس شعر پر اگر غالب نے سخن چکا

دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ یہ سچ ہے کہ یہ مطلع بھی ویسا ہی تمثیل ہے کہ جیسا مرزا

صاحب کا اکثر کلام ہے۔ فرماتے ہیں میں نے وفا کا امتحان ایسی کامیابی سے دیا کہ انجام کار اپنی

جان دیدی اس پر بھی اگر آپ کی تسلی نہیں ہوئی اور آپ مجھے کامل وفادار نہیں سمجھا تو اب

جو آپ کے خیال میں امتحان اور وہ بھی میری نفس پر پورا کر دیا جائے یعنی میں نے آپ کے اور آپ کے

عشق میں اپنی جان دیدی اب میری نفس بھی اگر آپ چاہیں تو قیامت تک آپ کے کوچہ میں سکتی ہے

خار خاں الم حسرت دیدار تو سے شوق گلچین گلستان تسلی سہی

فرماتے ہیں۔ اگر شوق گلستان تسلی کا گلچین نہ بن سکا نہ سہی اس کے واسطے حسرت دیدار

کے کانٹے ہی کافی ہیں۔ مطلب یہ ہے، اگر شوق کو تسلی حاصل نہ ہوئی تو حسرت دیدار نے

بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا تسلی کے لئے حسرت دیدار کیا کم ہے۔

مے پرستان مہم مے منہ سے لگا ہی ایک دن گرنہ ہوا نزم میں ساقی نہ سہی

فرماتے ہیں مے پرستوں انتظار ساقی کے بعد بھی تو نزم مے کوٹنے لگا کر شراب پنی ہی پنی

اگر ایک دن نزم مے میں ساقی موجود نہ ہوا تو نہ سہی یعنی اگر ساقی ہوتا تو وہ خم سے شیشے اور صراحی

بھڑنا اور صراحی یا شیشے سے شراب گلاس میں نکال کر پیش کرتا۔ ہم نے اس کی غیر موجودگی میں

اگر شک سے منہ لگا کر پی لی تو اس میں کیا قیامت ہوئی۔

نفس قیس کہ ہے چشم چراغ صحرَا گر نہیں سمجھ سہ خانہ یلی نہ سہی

فرماتے ہیں قیس کا دم صحرا کے واسطے چشم چراغ کا حکم رکھتا ہے یعنی اس کے جگہ آباد ہو کر

روشن ہو گیا ہے۔ اگر قیس کو یلی کے یہ خانہ میں باریابی حاصل نہ ہوئی (اور وہاں سے دھسکار

دیا گیا) نہ سہی یلی کے گھر کو یہ خانہ تین غرض سے کہا گیا ہے۔ ایک کہ محبوں کو وہاں بار نہ ملی



نفرت سے اسکو یہ خانہ کہلہ دوسری بات یہ ہے کہ یہی کا رنگ کا لایا جان کیا جاتا ہے اس اعتبار سے بھی  
اس کا گھر یہ خانہ ہونا چاہئے تیسری رعایت یہ ہے کہ یہی ہمیشہ سیاہ خیمہ میں رہا کرتی تھی۔

ایک منگلاڑی موقوف گھر کی رونق نوحہ غم ہی کی نغمہ شادی نہ ہی

فراتے ہیں دنیا کی شادی و غم دونوں بے اصل ہیں۔ علاوہ ازیں نگار عارف میں نہ شادی  
کی کوئی وقعت نہ غم کی کوئی حقیقت گھر کی رونق کے لئے البتہ انجمن آرائی کی ضرورت ہے۔  
محل نشاط ہو یا بزم ماتم۔ لوگ دونوں صورتوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔

نہ تالش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ گر نہیں ہے مے کے اشعار میں معنی ہی

میرزا صاحب اس شعر میں ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں جو میرزا کے کلام کو مہمل یا دشواری  
کہتے تھے مطلب یہ ہے اگر کوئی ناقد روان کچھ صلہ یا انعام دینا چاہتا تھا تو نہ دے یا کوئی سخن شناس  
نہیں دلائل کرتا تھا تو نہ کرے۔

عشرت صحبت خجماں ہی غنیمت سمجھو نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ ہی

فرماتے ہیں جینوں کی صحبت میں جو ایک دم بھر کے واسطے ناپائیدار خوشی حاصل ہو جاتی ہے  
اے غالب اسی کو غنیمت سمجھو۔ اگر اس کو قیام نہیں ہے نہ ہی۔

غزل

عجب نشاط سے جلاد کے چلے میں آگے کر اپنے سایہ سے سر پاؤں کے قدم آگے  
فرماتے ہیں۔ این رخشی کے ساتھ قتل ہونے کے لئے ہم جلاد کے آگے آگے متکل کی طرف دوڑے  
ہوئے چلے جاتے ہیں کہ ہمارے پاؤں جو شوق قتل میں جلد جلد بڑھ رہے ہیں ہمارے سر کا سایہ  
ان سے بھی دو قدم آگے آگے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ آفتاب پشت کی جانب واقع ہو تو سنا  
آگے کی طرف پڑتا ہے۔

تفنن نے تھکے چاہا خراب پاؤں الفت فقط خراب لکھا بس نعل سکافلم آگے

فرماتے ہیں مجھ کو خراب پاؤں الفت لکھنا چاہا تھا مگر قلم سٹمد ہوش ہو کر ختم کیا اور بادۂ الفت  
نہ لکھ سکایا یعنی خراب پاؤں الفت کا جملہ نام تمام رہ گیا اور اسی وجہ سے میں خراب ہی و گیا یہاں اس

جہد کی : تمامی نے عجب لطف پیدا کر دیا اور اکثر کسی حالت کی نامی کا بیان زیادہ لطف مند ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس حالت کے تمام ہو جانے کے۔

غم زمانہ نے جھڑی نشا کی مستی رگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذت الم کے فرماتے ہیں۔ دنیا کے الم و غم نے سارے نشے ہرن کر دئے ورنہ ہم بھی غم عشق کی لذت کے لہٹ اٹھایا کرتے تھے۔

خدا کے واسطے داد اس جنون عشق کی دینا کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے فرماتے ہیں خط لکھ کر اس کے جواب کا دل میں ایسا شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم نامہ بر سے بھی پہلے مشوق کے دروازہ پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ غم بھر جو پریشانیاں اٹھانی ہیں ہم نے تمہارے آیوایے طرہائے خم خم آگے تیرے آگے آگے ایک دم کو کو سنا ہے۔ عورتیں اس محل پر تیرے دیسے گھنٹوں کے آگے آئے بولتی ہیں میرا فرماتے ہیں۔ اے طرہ ہائے پر خم مشوق یہ غم بھر جو ہم نے تمہاری وجہ سے پریشانیاں اٹھانی ہیں یہ تمہارے آگے آگے یعنی خدا تم کو ہمارے تکلیف دینے کا بدلہ دے۔ دل جگر میں بڑا نشان جو ایک موج خون ہے ہم اپنے زخم میں سمجھتے ہوئے تھے اسکو دم آگے فرماتے ہیں۔ ہم جس کو سانس سمجھ رہے تھے وہ ایک موج خون کی پیراقتانی ہے مطلب یہ ہے کہ غم نے دل و جگر کو لہو کر دیا ہے۔

قسم جانے پہ آنے کی میر کھاتے یہ غالب ہمیشہ کھاتے تھے جو میر بجان کی قسم آگے فرماتے ہیں۔ یا تو اس قدر محبت اور ایسا اتحاد تھا کہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے یا اب ایسی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ جنازہ پر آنے سے بھی صوف اٹھا کر کیا جاتا ہے۔

غزل شکوہ کے نام سے بے بہرہ تھا ہوتا ہے یہ بھی مت کہہ کہ جو کہتے تو کھل ہوتا ہے فرماتے ہیں۔ شکوہ کے نام سے اس کو ایسی نفرت ہو گئی ہے کہ اگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو (شکوہ سے نفرت ہو گئی ہے) تو اس بیان کو بھی وہ گلا سمجھتا ہے یعنی یہ بیان بھی داخل شکوہ سمجھا جاتا ہے

پہلوں میں شکوہ سے یوں اگ سے جینے اگ در پھیرے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں میں شکایت سے ایسا بھرا ہوں جیسا رگ سے باجا بھرا ہوا ہوتا ہے اور اگ در  
 مجھ کو چھڑ کر دیکھئے کیا ہوتا ہے یعنی میں کس قدر شکایت کرتا ہوں اور کیسے کیسے گلے میری زبان  
 پر آجاتے ہیں چھڑنا محاورہ میں آغاز گفتگو کو بھی کہتے ہیں اور باجا شروع کرنے کو بھی کہتے  
 ہیں اور ایسے مذاق کو بھی کہتے ہیں جس سے دوسرا آدمی برا مانے۔

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو شکوہ جو ر سے سرگرم جفا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں جس وقت معشوق سے ہم اس کے جور کی شکایت کرتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ انہی  
 کمسنی کی وجہ سے ہماری بات کا پہلو سمجھ نہیں سکتا مگر تاہم یہ حسنِ تلافی قابلِ دید بلکہ لائقِ  
 داد ہے کہ وہ جفا پر اور زیادہ اور کس قدر ہوجاتا ہے۔

عشق کی راہ میں ہے چرخِ بکوب کی وچا سست رُحیے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں عشق کی راہ میں آسمان ستارہ دار اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی آبلہ پا بہت  
 تکلیف سے آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ آسمان کو چرخِ بکوب کہہ کر اس کا آبلہ پا ہونا ثابت کیا ہے  
 خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بڑا کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں۔ زمانے کو ہم سے ایسی ضد پیدا ہو گئی ہے کہ ہمارا ہر کام برعکس مدعا ہوتا  
 ہے۔ اگر ہم پہلے ہی سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تو ہم اپنے بدخواہ بن جاتے اور ہماری خودی  
 ہماری مدعا براری کی صورت پیدا کر دیتی یعنی ہمارا ہر کام برعکس مدعا ہوتا ہے جب ہم اپنی بربادی  
 کی خواہش کرتے تو نتیجہ اس کا کار براری ہوتا۔ یہ شعر میرزا کی شوخی طبیعت کا ثبوت ہے رہا ہے  
 کیوں نہ تھیں ہر طرف ناوک سدا کہ ہم آپ اٹھالائے ہیں گریزِ خطا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں ہم تیر تم کے ایسے شائق ہیں کہ اگر کوئی تیر خطا ہوتا ہے تو ہم دودھ کر اس تیر کو اٹھا  
 لاتے ہیں اور ناوک افکن کی نظر کر دیتے ہیں کہ لیجئے پھر اسکو دوبارہ لگائے اور ہم کو بد فتنہ  
 ستم کنے بغیر نہ چھوڑے۔

نالہ جاتا تھا۔ پرے عرش سے میرا اور آپ لب تک تاسہ جویا ہی رہا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں: تو وہ کیفیت تھی کہ میرا نالہ سات آسمانوں سے گزر کر باب اجابت پہنچتا تھا  
 یا اب ضعف و نقاہت سے یہ حالت ہے کہ جو نالہ بہت ہی رہا ہوتا ہے وہ لب تک نہ جاتا  
 ہے۔ ورنہ ایسا نالہ تو سینہ ہی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

قلعہ

خامہ میرا کہ وہ ہے باربد بزم سخن شاہ کی مدح میں لعل نغمہ سرا ہوتا ہے  
 باربد ایک مشہور گوشتے کا نام ہے۔ فرماتے ہیں: میرا قلم وہ کہ بزم سخن کا ایک باربد  
 ہے۔ بادشاہ کی مدح میں اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے۔ یعنی  
 اسے شہنشاہ کو اکب سپہ و مہر علم تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے  
 اسے شہنشاہ گویا تارے تیری سپاہ ہیں اور مہر تیرا علم ہے تو اب بڑا بادشاہ ہے  
 تیری مہربانیوں کا حق کس شخص سے ادا ہو سکتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے تو وہ لشکر کا ترے نفل بہا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں: اگر ساتوں اقلیموں کا حاصل جمع کر لیا جائے تو وہ تیرے لشکر کا گویا نفل ہے  
 ہر مہینہ میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلا آستان پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں: چاند ہر مہینہ میں جو بدر بن جانے کے بعد کاہیدہ ہوتے ہوتے ہلال کی صورت  
 پکڑتا ہے یہ تیرے در پر ناصیہ سائی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئین عزت لخواہی میں یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں: میں جو آئین عزت لخواہی کو توڑ کر تیرا مدح سرا ہو جانا ہوں یہ تیرے کرم کی وجہ  
 سے ہے۔ یعنی تیرا کرم ذوق مدح سرا ہی بڑھاتا رہتا ہے۔

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوالی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سا ہوتا ہے  
 فرماتے ہیں: اسے غالب میری نوابائے تلخ کو سن کر تو بے مزا اور بے لطف نہ ہو۔



یہ غدر کے سبب ہے یعنی آج میرے دل میں در کسی قدر زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لئے میری زبان سے بڑا درد شعر نکل رہے ہیں۔

غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟ تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے  
فرماتے ہیں میری ہر بات کو سن کر آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تیری کیا حقیقت ہے یعنی  
مجھ کو آپ بہت ہی حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں۔ آپ یہ تو  
بتائیے کہ یہ گفتگو کا طریقہ کیا ہے۔

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں آوا کوئی بتائے کہ وہ شوخ تند خو کیا  
فرماتے ہیں ساگر اس کی تند خوئی کی وجہ سے اسکو شعلہ کہوں تو شعلہ میں یہ کرشمہ فناز کہاں ہے  
اور اگر شوخی کے سبب اسکو بجلی قرار دوں تو بجلی میں یہ انداز واد کہاں ہے۔ سمجھتے نہیں آتا کہ وہ  
شوخ تند خو در حقیقت ہے کیا۔ کوئی اگر بتا سکتا ہے تو مجھے بتائے کہ وہ کیا ہے۔  
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے سخن تم سے وگر نہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے؟  
فرماتے ہیں میں تو اس رشک کی وجہ سے پریشان اور فکر مند رہتا ہوں کہ وہ تم سے عکلام  
ہوتا ہے۔ وگر نہ مجھے خوف بد آموزی عدو کی کچھ پروا نہیں ہے وہ میری طرف سے تم کو خواہ  
کتنا ہی بھڑکائے میں اس بات سے نہیں ڈرتا۔

چپکے ہلے بدن پر لہو سے پیراں ہماری حیب کو اب حاجت تو کیا  
فرماتے ہیں ہمارے سینہ پر لہو کی وجہ سے گریبان چاک ہونے کے بعد چپک کر مل گیا ہے۔  
اب سکور فو کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس شعر میں خوبی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ لہو نکلنے کا سبب  
دیوانگی کی وجہ سے خود میرزا صاحب کو معلوم نہیں ہے۔ اس لئے اس کو بیان نہیں کر سکے خبر  
نہیں گریبان چاک کرنے کے وقت ناخن سے سینہ پر خراش آئی ہے یا لڑکوں کا کوئی پتھر  
خرائش کا باعث ہوا ہے یا بے خیالی میں خار و فیلان جا پڑے ہیں یا خون کے آنسوؤں سے روتے  
ہیں یہ سب احوال تعین نہ کرنے سے زیادہ لطف دے رہے ہیں۔

جلا جسم جہاں دل بھی گیا ہوگا کریدے ہو جہاں اکو جستجو کیا ہے  
 فرماتے ہیں جہاں جسم جدا ہے وہاں دل بھی چل گیا ہوگا۔ اب جو بیٹھے ہوئے راگہ کریدے  
 ہو تو تمہیں کیا جستجو ہے کس بات کی تلاش کر رہے ہو۔  
 رگوں میں دوڑتا پھر نیلے ہم نہیں قابل جب آنکھ تیری سے نہ پکا تو پھر لہو کیا ہے  
 فرماتے ہیں ہم اسکو لہو نہیں سمجھتے جو انسان کی رگوں میں دوڑتا پھر سے اور باعث حیات  
 سمجھا جاتے ہم تو اسکو لہو جانتے ہیں جو کسی پر عاشق ہونے کے بعد آنکھوں سے بہتا ہے وہ لہو ہے  
 وہ چیز جس کیلئے ہلکو ہو بہشت عزیز سوائے بادہ گلفام مشکبو کیا ہے  
 فرماتے ہیں بہشت میں سب سے بڑی نعمت شراب ہے اور شراب ہی کے لئے ہم بہشت  
 کو عزیز رکھتے ہیں۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں چار یہ شیشہ قدح و کوزہ و سبو کیا ہے  
 فرماتے ہیں شراب پیئے میں اسقدر عالی ظرف واقع ہوا ہوں کہ شیشہ قدح و کوزہ و سبو  
 سے تو مجھ کو سرور حاصل ہونا ناممکن ہے یاں اگر دو چار خم موجود ہوں تو میں شراب پیوں۔  
 یہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہنے کہ آرزو کیا ہے  
 فرماتے ہیں میں اس ضبط کا انسان تھا کہ آرزوی آرزو میں جان دیدی اور کبھی حرت آرزو  
 کو لب پر نہ لایا۔ اب تو طوق گفتار ہی باقی نہ رہی۔ مگر جب قوت گوئی بی پر قبضہ حاصل تھا  
 اسوقت بھی ناامیدی نے حرت شوق کو کبھی زبان تک نہ آنے دیا۔  
 سوا ہے شہ کا مصاحبت سے بے تر تار و گرنہ شہ میں غالب کی آبرو کیا ہے  
 فرماتے ہیں بادشاہ کی مصاحبت نے غالب کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ اب اتر آ پھر تار ہے  
 در نہ اس سے پہلے شہ میں اسکو کون جانتا تھا کہ یہ خوب مقطع کہا ہے اور کسی مرصع غزل لکھی ہے۔  
 میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں چل لکھتے جو مے پیئے جوتے  
 فرماتے ہیں میں ان کو چھیڑوں اور وہ اس کے جواب میں مجھ کو برا بھلا نہ کہیں یہ بڑا تعجب کی

بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شراب پئے ہوئے نہ تھے بس لئے بچھ گئے کہیں انکو چھڑا ہوں  
 قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کے تم میرے لئے ہوتے  
 فرماتے ہیں میں تو قہر بلا کے لئے مخصوص ہو گیا ہوں اور تم بھی سراپا غصہ اور سراپا شوقی ہو  
 کاش میری قسمت میں تم کو لکھا جاتا اور خصوصیت کے ساتھ تم میرے ہو جاتے معشوق کی شونجی و بخرابی  
 کی تصویر اپنے شوق و حسرت کے خاکہ کے ساتھ اس خوبی سے کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔  
 میری قسمت میں غم گرا تھا دل بھی یارب کئی دئے ہوتے  
 فرماتے ہیں۔ اس کثرت سے اگر میری قسمت میں رنج و غم لکھا گیا تھا تو یارب دل بھی ایک کے  
 بدلے دس میں عطا فرمادے ہوتے۔ ایک دل میں اتنا غم سما نہیں سکتا نہ درت بیان قابلِ داد ہے  
 آہی جاتا وہ راہ پر غالب کوئی دن اور بھی جسے ہوتے  
 فرماتے ہیں۔ اسے غالب وہ رفتہ رفتہ ہمارا کہا ان لیتا۔ تم حلدی کر کے مر گئے تمہیں اور  
 کچھ زندہ رہ کر اس کی التجا کرنی تھی۔

غیر محفل میں بوسے جام کے ہم میں یوں تشنہ پیغام کے  
 فرماتے ہیں۔ روزِ محفل منعقد ہوتی ہے۔ روزِ غیروں کے ساتھ کلچر سے اڑائے جاتے ہیں  
 اپنے ہاتھ سے بھر بھر کے جام غیروں کو دئے جاتے ہیں ہم پیغامِ طلب تشنہ لب یعنی محروم رہتے  
 ہیں کبھی ہم کو بھول کر بھی بزمِ ناز میں نہیں بلایا جاتا۔ الفاظ سے حسرت ٹپکتی ہے۔  
 خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ تھکھٹے ہیں خرچِ نیلی فام کے  
 فرماتے ہیں۔ اپنی تباہی اور بربادی کا گلا ہم کو تم سے نہیں ہے۔ یہ تو اس شخصِ آسمان  
 کے تم و جوہر کے ڈھنگ میں یہ ظالم رات دن نئے نئے چیلے یہاں نے تراشنا رہتا ہے۔  
 خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے  
 فرماتے ہیں۔ اگر خط لکھنے کے لئے کوئی نیا مضمون ہاتھ نہ آئے نہ ہوں۔ ہم تمہارے نام کے  
 عاشق ہیں تمہارا نام تو عنوانِ خط پر لکھتے ہیں اور مطلب اگر نہیں ہے تو نہ ہو۔

رات پی زمرم پہ مے اور صبح دم دھوئے دھتے جامہ احرام کے  
 فرماتے ہیں۔ رات کو چاہہ زمرم پہ بیٹھ کر شراب پی اور وہ بھی احرام باندھنے کی حالت میں پی  
 کہ جب تمام معاصی کا ترک کر دینا لازمی اور ضروری سمجھا جاتا ہے پھر صبح کے وقت جامہ احرام کے دھتے  
 جو شراب کے قطرے گرنے سے پڑ گئے تھے دھو کر پاک ٹٹا ہو گئے اس شعر میں مذہبی اور شوقی کی تھوڑی سی پچھڑی  
 دیکھو آنکھوں نے پھنسا یا کیا۔ مگر یہی حلقے ہیں تمہارے دام کے  
 لڑاتے ہیں۔ ہماری آنکھوں نے کیا بارے دل کو پھنسا یا مگر ایسا ثابت ہوتا ہے کہ ہماری  
 آنکھیں بھی تمہارے دام کے حلقے میں مبتلا ہے کہ عشاق کی آنکھیں عشاق کو تباہ کن  
 مشوق کرتی ہیں۔ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ آنکھیں عشاق کی حلقہ دام مشوق ہیں۔  
 شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر دیکھئے کب دن بھر میں حمام کے  
 فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے غسل صحت کی خبر گرم ہو رہی ہے دیکھئے کب غلام کی قسمت جاگتی ہے  
 عشق نے غالب نکما کر دیا در نہ ہم بھی آدمی تھے کام کے  
 صاف اور سیدھا شعر ہے اور پھر لطافت سے خالی نہیں۔

پھر اس انداز سے بہا آئی کہ ہوئے مہر و مہر تما شانی  
 فرماتے ہیں پھر دوبارہ موسم بہار اس خوش دہائی کے ساتھ آیا ہے کہ مہر و مہر اس کے تما شانی بن گئے ہیں۔

غزل

دیکھو اسے ساکنان خطہ فاک اسکو کہتے ہیں عالم آرائی  
 فرماتے ہیں اسے خطہ فاک کے رہنے والے یہ تما شہ دیکھو تمام عالم کا آراستہ کر دینا اسکو کہتے ہیں۔  
 کہ زمین ہو گئی ہے سرتاسر روکش سطح چرخ مینائی  
 یعنی زمین پر اس کثرت سے سبزہ و گل پیدا ہو گئے ہیں کہ زمین سطح چرخ مینا رنگ کی

قطرہ

مقابل بن گئی ہے سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ لی  
 بن گیا روئے آب پر کائی



فراتے ہیں سبزہ کے کثرت سے پیدا ہو کر جیساری زمین کو گھیر لیا اور اب کہیں اسکی وسیدگی کے لئے زمین پر جگہ باقی نہ رہی تو مجبوری سے پانی کے اوپر کائی کی شکل میں ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ سبزہ و گل کے دیکھنے کیلئے چشم نرگس کو دی ہے بنیانی فراتے ہیں چشم نرگس کو سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب اس کو باغبان عالم نے بنیانی عطائڑائی ہے تاکہ وہ سبزہ و گل کی کثرت کا تماشا دیکھے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر۔ بادہ نوشی ہے باد پیمانی  
یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اس میں باد پیمانی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دئے ہیں باد پیمانی عبت کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں۔ کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور جبکہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمانی یعنی حصول کلام ہے اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہو گا اور باد پیمانی۔ خیر و دسر معنی یہ ہیں کہ باد پیمانی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جسطرح بادہ پیمانی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح باد پیمانی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلیگا کہ آج کل ہوا کھانی بھی شراب پینی ہے (زیادہ گارغائب) کیوں نہ دنیا کو ہونوٹھی غالب۔ شاہ دیندار نے شفا پائی، فرماتے ہیں۔ اسے غالب دنیا یعنی سارے زمانہ کو خوشی کیونکر حاصل نہ ہو۔ دیندار بادشاہ نے مرض سے شفا پائی ہے

تغافل دوستوں میرا دماغ عجز عالی ہے اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

فرماتے ہیں میں تغافل پسند آدمی ہوں۔ میری طبیعت میں عجز و انکسار کا مادہ اسقدر زیادہ پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے حق میں بے اتفاقی اور بے توجہی کو بہ نسبت اتفاقات و توجہ کے زیادہ پسند کرتا ہوں مجھے پہلو تہی کرنی گویا میرے واسطے پہلو میں جگہ خالی کرنی ہے۔ میں اغماض کو اکرام سمجھتا ہوں۔ رہا آباد عالم امن جہت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جبکہ جام و سبوتیخا نہ خالی ہے یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو مگر تیشل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنادیا

ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا۔ جو دنیا کو محض چیز سمجھ کر اس کی طرف انتہات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی پس یہ جانت چاہئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل ہمت مفقود ہیں یعنی جس طرح میخانہ میں جام و سبک کا شراب بھر رہا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ میخانہ میں کوئی میخانہ نہیں ہے! اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل ہمت معدوم ہیں (از یاد نگاہ غالب)

غزل

کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبان میری

فرماتے ہیں پہلی دشواری و مصیبت تو یہی ہے کہ وہ میری کہانی یعنی میری مصیبت کا حال سنتا ہی نہیں اور پھر اس کے ساتھ دشواری پر دشواری اور مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ میری کہانی کب سنتا ہے۔ الفاظ کی نشست بندش کی چستی۔ بیان کی خوش اسلوبی۔ خیال کی بلندی یہ ساری باتیں اس مطلع میں بہ احسن الوجوہ واقع ہوئی ہیں۔ تعریف کے مستحق ہے۔

فلش غمزہ خونریز نہ پوچھ دیکھ خونابہ فشانی میری

فرماتے ہیں غمزہ خونریز کی کاوشوں کا حال مجھ سے کیا پوچھتا ہے میں کب اس کی فلشوں کو بیان کر سکتا ہوں۔ دل میں زخم کلیجہ میں ناسور ڈال دے ہیں۔ یہ دیکھ لے ہو کے آئیں اور باہر کیا بیاں کر کے مرار و مینگیار مگر آشفٹ بیانی میری

فرماتے ہیں مجھ میں کیا وصف ہے کہ جس کو بیان کر کے میرے دوست میرے مر جانے کے بعد روینگے۔ مگر میری آشفٹ بیانی ہے۔ شاید اسی کو یاد کر کے روئیں۔ آشفٹ بیانی نکار کی وجہ یہاں کہی گئی ہے۔ حق یہ ہے کہ میرزا صاحب کے بیان کی شوخیاں ایسی اچھوتی اور نرالی ہوتی ہیں کہ کسی شاعر کا بیان ان کے بیان کی خصوصیت کو نہیں پہنچ سکتا۔

ہوں زخود رفتہ بیدارے خیال بھول جانا ہے نشانی میری

بیدا۔ بالفتح بعض بیابان و وحشت۔ فرماتے ہیں صحرائے خیال کا زخود رفتہ ہوں۔ مطلب ہے کہ دوستوں کے خیال سے نکل جاتا ہوں اور احباب کا مجھے بھول جانا ہی میری نشانی ہے۔

متقابل ہے مقابل میرا      رنگ گیا دیکھ روائی میری  
میرزا صاحب نے اس شعر کی شرح خود ہندی میں تحریر کی ہے۔ فرماتے ہیں تقابل و تضاد کو کو  
نہ جانیگا۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ راحت و رنج و وجود و عدم لفظ متقابل اس مصرع میں معنی مرجع ہیں  
حریف کہ معنی دوست بھی متعل ہے مفہوم شرع کہ ہم نور دوست از روئے خوئے و عادت ضد ہمدگر  
ہیں وہ میری روائی دیکھ کر رک گیا۔

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں      سخت ازراں ہے گرانی میری  
گرانی کے سنی بجاری پن کے بھی ہیں اور پیش قیمت ہونے کے بھی۔ کتا ہے کہ میری قدر اس قدر  
کی سی ہے جو رام کے سر سے پر پڑا ہوا اور ہر شخص آتے جاتے اس پاؤں رکھ کر گزرے یعنی ہوں تو گزرتا  
مگر اس چھری طرح بے قدر ہوں پس میری گرانی کقدر ازراں ہے (از یادگار غالب)

گر دباو رہ بیتابی ہوں      صرصر شوق ہے بانی میری  
فرماتے ہیں۔ میں بگولے کی طرح سے بے قرار ہوں اور رہز بیتابی کا گرد دباو ہوں میری  
بیتابیوں کی بانی بانی صرصر شوق ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا      کھل گئی میچدانی میری  
فرماتے ہیں۔ اس کا دہن نتیجہ ہے۔ اس لئے مجھ پر ظاہر نہ ہوا اور میں اس کو نہیں جانتا اور  
جو شخص اس کے دہن کو نہ جانے وہ میچدانی ہے پس میری میچدانی سب پر ظاہر ہو گئی۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالب      تنگ پیری ہے جوانی میری  
فرماتے ہیں۔ اے غالب میں جوانی میں اس درجہ ضعیف و ناتوان ہو گیا ہوں کہ بوڑھے  
بھی اتنے کمزور اور نحیف نہیں ہوتے۔ میری جوانی تنگ پیری ہے۔

نقش نازبٹ طناز یہ آخوش قییب      پائے طاؤس پے خامہ مالی مانگے  
فرماتے ہیں۔ آخوش قییب میں اس بٹ طناز کی تصویر اس قدر نما اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہے  
کہ اس کے کھینچنے کے لئے یسے تو قلم پائے طاؤس دست مالی میں ہونا چاہیے مطلب ہے کہ جس  
غزل

طرح خاؤں کے پردہ بال اور اعضائے جسم میں دخول صورت مایہ فخر و ناز واقع ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس کے پاؤں بد رنگ اور بد صورت اس کے حق و جمال کے لئے موجب تنگد عار پیدا ہوئے ہیں اسی طرح ریشہ ہم آغوشی کی حالت میں اس کی ناز کرنے والی تصویر کی کیفیت ہے۔

تو وہ بد خو کہ تحسیر کو تماشا جانے غم وہ افسانہ کہ آشفٹہ بیانی مانگے

فرماتے ہیں تحیر میں خاموشی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے اور تو ایسا بد خو ہے کہ میری حیرت اور میری خاموشی کو تماشا کہتا ہے اور غم وہ افسانہ ہے کہ اس کے لئے آشفٹہ بیانی اور پریشان گوئی

درکار ہے اگر میں حیرت خاموشی کو دور کر کے غم دل زبان پر لاتا ہوں تو تو بے لطف و بے مروت ہوتا ہے

وہ تب عشق تنہا ہے کہ بھر صورت منع فعلہ نامہیں جگر ریشہ دوانی مانگے

فرماتے ہیں مجھ کو اسی تب عشق کی تمنا اہم آئے وہ ہے کہ جس کا شعلہ کی طرح جگر تک دوڑ جانے والا ہو۔

گلشن کو تری صحبت از بیکہ خوش آئی ہے ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

قطع

فرماتے ہیں رباع کو تری صحبت سے سرور و فیضیاب ہونا، استعد پر پند آیا ہے کہ ہر غنچہ

گل کا کھلنا تیرے شوق میں آغوش کشائی ہے یعنی تجھ سے بغیر ہوئے کائنات فی ہے۔

واں کنگرہ استغنا ہر دم ہے بلندی یں یاں نالہ کو اور الٹا دعویٰ رسائی ہے

فرماتے ہیں ان کا کنگرہ استغنا دن و نارات چو گنا بنے ہوتا چلا جاتا ہے اور ہمارا نالہ دن و ن

پست ہوتا جاتا ہے یعنی اب دل سے چکر لبت تک بھی نہیں آتا۔ سینہ ہی میں جہت بار کر رہا جاتا ہے۔

از بیکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے جو داغ نظر آیا اک چشم منائی ہے

فرماتے ہیں غم عشق مجھ کو ضبط کی تعلیم کر رہا ہے۔ دل میں جو نیا داغ پڑتا ہے وہ اس اتار

یعنی غم عشق کی چشم منائی کا کام دیتا ہے۔

کھ دیکھو یا رب اسے قسمت میں عذو کی جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی

غزل

فرماتے ہیں کہ ایسا زخم میں میں مانگے دئے جا سکیں اور جس کے مندل ہونے کی امید کی جا

وہ مجھ کو درکار نہیں ہے۔ دشمن کی قسمت میں اس زخم کو لکھ دیتا یا رب میں تو ایسے زخم کا خواہشمند



ہوں کہ جسے دیکھ کر چارہ گر بھی علاج سے دست بردار ہو جائے۔

اچھا ہے سر انگشت خانی کا قصہ۔ دل میں نظر آتی تو ہے اک بو ند ہو کی

نقطہ تو نے جو دوسرے صدمہ میں ہے یہ معنی پیدا کر دئے ہیں کہ آنکھ سے ہو روتے روتے

دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا۔ دوست کے سر انگشت خانی کے قصہ کو غنیمت

سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں ہو کی ایک بو ند تو نظر آتی ہے (از یادگار غالب)

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے وصلگی سے یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کس کو

بے وصلگی یعنی کم ظرفی۔ یاں سے مراد دنیا معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں

ڈرتا ہے کہ ہم عاشق ہو گئے تیرے ظلم و جبر سے تنگ آکر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے۔

کس لئے کہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔ (از یادگار غالب)

دشمن نے کبھی متہ نہ لگایا ہو جب گلو دشمن نے کبھی بات نہ پوچھی ہے گلو کی

فرماتے ہیں چھری نے کبھی جگر کو سنہ نہ لگایا ہو یعنی اس پر التفات نہ کیا ہو اور دشمن نے کبھی

گلو کی بات بھی نہ پوچھی ہو یعنی توجہ نہ کی ہو۔ دشمن دشمن سے ناز و انداز و ظلم و بیداد معشوق مراد ہے۔

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب حسرت میں ہے ایک بت عربہ جو کی

فرماتے ہیں۔ اسے غالب اس ناکام تمنّا کی حالت قابل ہنس ہے کہ جو عربہوں سے

ایک بت عربہ جو کی تمنّا میں زندگی بسر کر رہا ہو۔

سیاب پشت گرمی آئینہ دے یم حیراں کئے ہوئے ہیں دل میقار کے قطع

پشت گرمی یعنی پشتبانی و اعانت۔ فرماتے ہیں حسب طرح سیاب یعنی پارے کی قلعی سے آئینہ

روشن ہو کر صورت حیرت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح ہم کو دل بیتاب نے سراپا حیرت بنا رکھا ہے مطلب

یہ ہے کہ جس طرح آئینہ پارے کی قلعی سے عکس پذیر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح غنا

دل بیتاب کے ذریعہ سے معشوق کے جلوہ سے مضیاب ہونے کی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔

آغوش گل کشودہ برائے دداں ہے اسے خند لیب چل کہ چلے دن بہار کے

فرماتے ہیں پھول کا کھلنا۔ گلے لٹنے کے لئے باتھوں کا پھیلنا ہے اسے طیل جلد آ کر معاف  
ذہنت کرے کہ بہار کے دن صبح شام ہی میں جانے والے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ راحت کا  
زمانہ دنیا میں بہت ہی قلیل ہے جس طرح بیمار اور مہر آتی ہے اور نہ رخصت ہو جاتی ہے۔

نقطہ ہے مہل سحر عالم تمکین و ضبط میں معشوق شوق و عاشق دیوانہ چاہئے

فرماتے ہیں۔ اگر معشوق کے مزاج میں خود داری اور تمکین ہے اور عاشق کی طبیعت میں صبر  
ضبط کا مادہ ہے تو عین نسل میں بھی فراق کی طرح بے لطفی نصیب ہوگی مگر اس میں ہے کہ معشوق  
شوخ و میاں اور عاشق دیوانہ و گت رخ۔ کھل میں کلمیاں کے ساتھ لطف زندگی حاصل کر کے  
اس لیے کہ لہجہ جانیگا بوسہ بھی تو ہاں شوق فضول و جرات رندانہ چاہئے  
فرماتے ہیں کبھی تو اس کے لبوں کا بوسہ لہجہ جانیگا۔ ہاں اس کے واسطے شوق حد سے  
بڑھا ہوا اور جرات رندانہ درکار ہے۔

غزل

چاہئے اچھوں کو تہنا چاہئے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

فرماتے ہیں۔ اگر دنیا میں کسی سے محبت ہو تو وہ حسینوں سے ہو۔ اور اگر یہ لوگ خود بھی  
کسی کو چاہیں تو پھر کسی۔ و نعمت کی ضرورت ہی باقی نہیں ہے۔

صحبت نذاں سے واجبے حذر جانے سے اپنے کو کھینچا چاہئے

فرماتے ہیں۔ رندوں کی صحبت سے حذر واجب لازم ہے۔ بجائے شرب کھینے کے شراب سے  
اپنے کو کھینچنا چاہئے یعنی رندوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے اور اپنے سے اقرب و لازم  
چاہئے کہ تیرے کیا سمجھتا تھاں بابے اب اس سے بھی سمجھ چکا

فرماتے ہیں تیرے چہنے کو دل نے کیا سمجھتا تھا یعنی کہیں سمجھتا تھا۔ پہل سمجھتا تھا۔ کیا سمجھتا تھا  
اب اس نے بیکر دل سے دراجد کو اس چاہت کا بدلہ لینا چاہئے مطلب یہ ہے کہ ضبط عشق اور صبر نہ  
فراق کی تاب و طاقت نہ تھی تو کیا سمجھ کر عشق کیا تھا۔

چاکت کر جیب بے ایام گل کچھ اوصاف کا بھی اشارہ چاہئے

پھول کے کھلنے کو چاک گریبان سے عموماً تشبیہ دیجاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام ہجر کی ہدایت سے کرنا چاہئے پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ محبتوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے (از یادگار غالب) دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے فرماتے ہیں۔ تم جو ہم سے بیگانہ وار پردہ کرتے ہو اور منہ چھپا لیتے ہو اس پردہ میں لگاؤ جھلک کھاتی ہے اور دیکھنے والوں کو شہید پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ہم سے منہ چھپانا چھوڑ دینا چاہئے میرزا صاحب اس چال سے اپنا مطلب حاصل کرتا چاہتے ہیں۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے فرماتے ہیں۔ میری دشمنی میں غیر نے اپنے کو مشا دیا۔ یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ وہ میرا کس درجہ دشمن ہے۔

اپنی زبانی میں کیا چلتی ہے سی یار ہی ہنگامہ آرا چاہئے فرماتے ہیں ہم اپنی سعی کوشش سے اپنے کو رسوا بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری بدنامی بھی اسی کی ہنگامہ آرائی پر منحصر ہے یعنی وہ جس کو چاہے ذرا سی اپنی جھلک کھا کر مضطرب بیتا بنا دے اور یہ اضطراب دیتیالی بدنامی و رسوائی کا باعث بن جائے۔

مختصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اسکی دیکھا چاہئے فرماتے ہیں جس شخص کی امید کا حصر مرنے پر ہو اسکو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس درجہ کس حد تک ناامید ہو چکا ہے۔ بالکل نیا اور اچھوتا مسنون ہے اور اس خوبی کی تعظیم کیا ہے کہ توصیف مستثنیٰ ہے غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہئے والا بھی اچھا چاہئے فرماتے ہیں۔ اے غافل ان مہ جبینوں کے لئے چاہئے والا بھی خوبصورت اور وضعہ ہونا چاہئے چاہئے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے فرماتے ہیں۔ اور تماشہ دیکھے حضرت اسد بھی جبینوں کی چاہت کا دعویٰ کرتے ہیں ذرا



آپ کی صورت تو ملاحظہ فرمائیے یعنی ایسی بھونڈی صورت ہر کوئی خوش و مشوق کبائتفات کرتا ہے  
 ہر قدم دوری منزل سے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیابان مجھ سے  
 فرماتے ہیں میں جقدر آگے بڑھا جاتا ہوں اتنی ہی منزل مجھ سے دور ہوتی جاتی ہے۔ معلوم  
 ہوتا ہے جس چال سے میں بیابان طے کر رہا ہوں اسی چال سے بیابان بھی میرے آگے بھاگتا جا رہا  
 درس عنوان تماشا بتغافل خوش تر ہے کہ رشتہ شیرازہ مرثکاں مجھ سے  
 فرماتے ہیں دنیا کے تماشے سے عبرت کا سبق حاصل کرنا بھی تغافل کے ساتھ بہتر ہے مینی چپٹی  
 ہوئی نگاہ سے آغاز تماشے کو دیکھ لینا نتیجہ نکال لینے کے لئے کافی ہے اس لئے میری نگاہ شیرازہ  
 مرثکاں کا رشتہ بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا تغافل پسند ہوں کہ میری نظر بھی آنکھ کے  
 پردہ سے باہر نہیں نکلتی اور دنیا کی نیرنگیوں سے سبق حاصل نہیں کرتی۔

وحشت آتش دل سے شب تنہائی میں صورت دو دریا سایہ گریزاں مجھ سے  
 فرماتے ہیں۔ فراق کی راتوں میں میرا سایہ میری آتش دل سے دم کر کے اس طرح بھاگ  
 جاتا تھا جس طرح آگ سے دھواں بھاگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شب تنہائی میں میرا سایہ بھی  
 میرا ساتھ نہ دیتا تھا وہ بھی مجھ کو تنہا چھوڑ جاتا تھا۔

غم عشاق نہ ہوسادگی آموز بتاں کس قدر خانہ آئینہ سے ویراں مجھ سے  
 فرماتے ہیں۔ خدا ایسا نہ کرے کہ عاشقوں کا غم خوب و مشوقوں کو سادگی کی تعلیم دے اور  
 یہ لوگ ان کے سوگ میں زینت آرائش ترک کر دیں سادگی میرے ہی مرجانے سے کس قدر خانہ  
 آئینہ ویران ہو گیا ہے کہ اب اس میں حسن کا جلوہ نظر ہی نہیں آتا۔ یعنی میرے ماتم میں مشوقوں  
 نے آئینہ دیکھنا اور بناؤں گھار کر نابالکل ترک کر دیا ہے۔

اثر ابلہ سے جادہ صحرائے جنوں صورت رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے  
 فرماتے ہیں۔ صحر اور دی میں میرے پاؤں کے چھالے پھوٹ گئے ہیں خون ان سے جادہ  
 صحرائے جنوں پر پکا ہے۔ وہ جادہ رشتہ گوہر کی طرح چراغاں بن گیا ہے۔



بخود ہی بستر تمہید فراغت ہو جو پڑے سایہ کی طرح میرا شبتاں مجھ سے  
 فرماتے ہیں، خدا یا کرے کہ میری بخود ہی بستر تمہید فراغت ہو جائے۔ سایہ کی طرح میرا  
 شبتاں مجھ سے بھرا ہو ہے مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ بخود ہی کے عالم میں راحت و آرام سے  
 میں اپنے گھر میں اپنے بستر پر پڑا ہوں۔ کہیں خدا یا کرے۔

شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن ہر ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے  
 فرماتے ہیں۔ تو اگر شوق دیدار کی حالت میں میرا سر کاٹ بھی ڈالے تو میری نگاہیں سی  
 طرح نفل کر چاروں طرف تیری حق میں پھیل جائیں جس طرح شمع کا گل کتر دینے کے بعد اسکا  
 شعلہ زیادہ روشن ہو کر روشنی کو بڑھا دیتا ہے۔

بیکسی بائے شب بھر کی وحشت ہے سایہ خورشید قیامت میں پہنہاں مجھ سے  
 فرماتے ہیں شب غم کی نو اسی اور بیکسی سے میرا سایہ مجھ سے وحشت کر کے ایسا بھاگا اور  
 اس قدر ڈرا کہ آفتاب قیامت میں جا کر چھپ گیا۔ باد جو دیکھ آفتاب سے سایہ بھاگ جاتا ہے۔ لیکن  
 میرا سایہ مجھ سے ایسا گریزاں ہوا کہ آفتاب حشر میں جا کر پہنہاں ہو گیا۔

گردش ساغر صدف جلوہ رنگیں تجھ سے آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے  
 فرماتے ہیں۔ حیراں جلوہ رنگیں اس بزم میں ساغر شراب کی گردش کا کام دے رہا ہے یعنی وہ  
 بھی شراب تند کی طرح ہوش رہا ثابت ہوا ہے اور میرا دیدہ حیراں آئینہ داری کا نمونہ دکھا رہا ہے  
 مطلب ہے کہ قمر حسن سے لوگ مد ہوش ہو رہے ہیں اور میرا عشق کو دیکھ کر انسان حیرت میں مبتلا ہے  
 نگہ گرم سے اک آگ شکیلی ہے اسد ہے چراغاں حسن خاشاک گلستاں مجھ سے  
 فرماتے ہیں اے اسد میں جو فراق یار میں باغ کی سیر کو گیا ہوں تو میرے ضمیر میں آگ  
 لگ گئی ہے اور بچوں کو دیکھ کر میری آنکھوں سے ایسے شعلے نکلے ہیں کہ جن سے جل کر شبنم  
 خاشاک گلستاں چراغاں بن گئے۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو نائے نبی کیا بنے بات جہاں بات بنگانے غزل

فرتے ہیں۔ وہ شوخ نکتہ چیں ہے بن نہیں پڑتی کہ غم دل اسکو مٹا دیا جائے یعنی دو ایک ایک  
 نکتہ کی گرفت کر لیا اور پھر ارضِ جزیرہ گنگا۔۔۔ بات کیا بنے جہاں بات بنائے نہ بنے۔ بات بنانی جھوٹ  
 ہونا۔ مطلب ہے کہ اس کی نکتہ چینی کیونچہ سے ہمارا جھوٹ اس پر ظاہر ہو جائیگا اور بات بگڑ جائیگی۔  
 میں بڑانا تو ہوں اسکو مگر اسے جذبہ دل اس پہ نجائے کچھ ایسی کہ بنائے شے بنے  
 فرتے ہیں میں اسکو بڑاتا تو ہوں لیکن یہ امید نہیں ہے کہ میرے بلائے سے چھوڑ جائیگا۔ اسے  
 جذبہ دل تو اگر کچھ مدد کرے اور ایسی کشش اس پر ڈالے کہ بغیر آنے اسکو بن نہ پڑے تو وہ آسکتا ہے  
 کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول بچا کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ  
 فرماتے ہیں۔ وہ ستم و جور کو بھی کھیل سمجھ کر برتنا ہے۔ اس سے مجھ کو یہ خوف ہے کہ وہ ظالم کو  
 چھوڑ نہ دے بھول نہ جلے کاش ایسا ہی ہو کہ بغیر میرے ستائے اس کو چین نہ آئے اور ہر  
 روز پابندی کے ساتھ ستا رہے۔

غیر پھرتا ہے تے یوں ترے خط کو کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپا نہ بنے  
 فرماتے ہیں میرا رقیب اس طرح تیرے خط کو ہر جگہ لے پھرتا ہے کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ  
 یہ کیا چیز تیرے ہاتھ میں ہے تو وہ اسکو چھپا بھی نہیں سکتا۔ مطلب ہے کہ رقیب ایکٹ ایکٹ نہ  
 تجھ کو رسوا کر کے رہیگا۔

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے میں تو کیا بات آئیں تو انہیں بات لگائے شے بنے  
 فرماتے ہیں۔ ان کو کمالِ نازگی نے اس قابل نہیں رکھا کہ گروہ کسی مشتاق کے جتنے جڑو  
 جائیں تو کوئی مشتاق وصل کامیابی حاصل کر سکے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کسکی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اس لئے کہ اٹھائے نہ بنے  
 فرماتے ہیں یہ کون بتا سکتا ہے کہ کس کی جلوہ گری ہے۔ عالم امکان کو اس نے پیہ کر کے  
 ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ یہ پردہ کسی کے اٹھانے سے اٹھ ہی نہیں سکتا۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے شے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو ٹائے شے بنے

فراتے ہیں۔ موت کی جس کیوں راہ دیکھوں۔ اس کا آنا تو لازمی ہے۔ وہ بغیر انتظار کے بھی آئے  
وقت معین پہنچ کر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو تمہارا بلانا بھی ممکن نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے  
تمہارا بلانا موت کے آنے سے دشوار ہے۔

بوجھ وہ سہرے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے کام وہ آن پڑا ہے کہ ہٹائے نہ ہٹے  
دونوں مصرعوں میں اپنی خشکات کا بیان کیا ہے شعر صاف اور سیدھا ہے اور نہایت لطیف  
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

فراتے ہیں عشق پر کسی کا قابو نہیں چل سکتا۔ اسے غالب وہ آگ ہے کہ نہ ارادہ کے ساتھ  
لگائی جاسکتی ہے یعنی ناگرم یہ چاہیں کہ معشوق کے دل میں بھی اس عشق کی آگ کو بھڑکادیں  
تو یہ بھی ممکن نہیں اور ناگرم یہ چاہیں کہ اپنی لگی کو بجھا دیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

چاک کی خواہش اگر وحشتِ عریانی کسے صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کسے  
فراتے ہیں۔ اگر وحشتِ دل عریانی کی حالت میں گریبان چاک کرنے کی خواہش کرے  
تو یقیناً کامل ہے کہ صبح کی طرح میرا زخمِ دل بھی گریبان بن کر چاک ہو جائے۔

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گریختے خیال دیدہ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے  
فراتے ہیں۔ تیرے جلوہ کا وہ عالم ہے کہ اگر اس کو خیال بھی آجائے تو دیدہ دل کو حیرانی  
پیدا ہو جائے۔ اسی مقام کی بابت حضرت شیخ سعدی فراتے ہیں ۵

چہ شبہا نشتم دریں میرگم کہ حیرت گرفت استنیم کہ تم  
ہے شکستن سے بھی دل تو میدیاریہ کیتلک آہگینہ کوہ پر عرض گراں جانی کرے  
فراتے ہیں ہم کب تک بیٹھے ہوئے اس آرزو میں خیالی پلاؤں پکا یا کریں کہ ہمارا معشوق  
سنگدل ایک نہ ایک نہ ضرور ہمارے شیشہ دل کو سنگِ جفا سے توڑے گا۔ جس میں اس سے  
بھی ناامیدی ہے کہ وہ ہماری دل شکنی پر توجہ ہوگا۔

میکردہ گر چشم مستِ ناز سے پاشکست معنے شیشہ دیدہ ساغر کی مژگان کی کسے

فرماتے ہیں۔ اگر میکہ کو س کی چشم سست ناز توڑ بھی دے تو شیشہ شراب میں جو بال  
پڑ جائیں وہ دیدہ ساغر کے واسطے پکیں بن جائیں اور ساغر شراب اس آنکھ سے ابن چشم  
سست شراب ناز کو دیکھ کر حیران ہو جائے۔

خطا عارض نکلیا ہے رلف کے الفتے غبار  
میکلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے  
فرماتے ہیں خطا عارض جو اس کے زخاروں پر ظاہر ہوا ہے۔ یہ دراصل خطا عارض نہیں ہے  
بلکہ میری مجبوتی اس کی زلفوں کو یہ عہد نامہ لکھ دیا ہے کہ جو کچھ میرے بارے میں پریشانی  
کو کرنا ہو کرے سزا سزا مجھے منظور ہے۔

غزل

وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے  
مے مجھے پیش دل مجال خواب تو دے  
فرماتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ خواب میں آ کر تسکین اضطراب دے جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں  
ہے کہ میری پیش دل مجھ کو سونے کی اجازت دیدے۔ یہ ظالم یعنی میری پیش دل اس سنگ  
سے زیا وہ ظلم دھانے والی ہے۔

کرے ہے قتل لگاؤٹ میں تیرا رو دینا  
تیری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے  
فرماتے ہیں۔ لگاؤٹ سے تیرا رو دینا قتل کر دیتا ہے۔ تیری آنکھوں کے آنسو شیشہ نظر میں  
وہ آبداری پیدا کر دیتے ہیں کہیں تو ان کو دیکھتے ہی قتل ہو جاتا ہوں لفظ (تو) نے یہاں یہی پیدا  
کر دے ہیں کہ تیری طرح دوسرے مشوقانِ شکر تیغ نگاہ کو اس طرح کی آبداری دینی جانتے ہی نہیں۔  
دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو  
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جو اب تو دے  
رہتے ہیں جنبش لب ہی سے تلوار کا کام لے اور ہم کو قتل کر دے۔ ہم طالبِ بوسہ ہیں اگر تو  
دینا منظور نہیں ہے تو ممان جواب میرے یعنی بوسہ دینے سے انکار کر دے۔ ہم قتل ہو جائیں گے۔  
پلا دے اوکے ساتی جو ہم سے نفرت ہے  
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے  
فرماتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم سلمان ہیں۔ اگر کچھ کو یہ خیال ہے کہ میرا پیالہ بخش ہو جائے گا  
تو نہ دے۔ ہم شراب کے طالب ہیں ہم کو اوک سے پلا دے۔ شعر زندانہ ہے مگر کیا خوب کہا ہے۔



اسک خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں دالے دے  
 فرماتے ہیں! اے اسد فرط خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جب میں نے اس کی زبان سے  
 یہ سنا کہ ذرا میرے پاؤں دبا دے مطلب یہ ہے کہ اس کے قدموں تک میرے ہاتھوں کا پہننا  
 اس بات کی دلیل ہے کہ خوش نصیبی سے تنہا پوری ہونے کا زمانہ قریب آگیا۔

پیش سے میری وقف کشمکش ستر بستر  
 مرا سر سنج بالیں ہے مرا تن بار بستر ہے غزل  
 فرماتے ہیں۔ میرے ترپنے سے بچھوٹے کا ایک ایک تار تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے میرا  
 سر تکیہ کے واسطے ایک عذاب بن گیا ہے اور میرا جسم بستر کے لئے آفت ہو گیا ہے۔

سر شک سے بھرا دادہ نور العین دامن ہے  
 دل میدست یا افتادہ بر نور دار بستر ہے  
 فرماتے ہیں۔ میرا آنسو دامن کی آنکھ کا تارہ ہے اور میرا دل بیمار بستر مرض کا فرزند دل بند  
 مطلب یہ ہے۔ کثرت گریہ کی وجہ سے دامن کو آنسو سے انس پیدا ہو گیا ہے اور بستر بخوری  
 کو میرے دل بیمار سے دل تگی پیدا ہو گئی ہے۔

خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے،  
 فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے  
 فرماتے ہیں۔ میرا مرض بڑا اقبال مند ہے کہ تم ساپری پیکر اور مغرور میری عیادت کے لئے آیا  
 ہے۔ تمہارے قدم رنجہ کرنے سے شمع بالیں کی روشنی طالع بیدار بستر بن گئی ہے مطلب کہ  
 میری بیماری ذریعہ خوش نصیبی ہے کہ تم میری عیادت کے لئے آئے ہو۔

یہ طوفانگہ جوش اضطراب شام تنہائی  
 شعاع آفتاب صبح محشر تار بستر ہے  
 فرماتے ہیں۔ شب فراق میں اس قدر اضطراب اس درجہ تاریکی ہے کہ ہر ایک تار بستر آفتاب  
 صبح محشر کی کرن بن گیا ہے یعنی ہر ایک سفیت تار اس اندھیری رات میں اس طرح چمک رہا ہے  
 جس طرح سورج کی کرنیں چمکتی ہیں۔ مگر یہ شعاع آفتاب محشر کی شعاع ہے اس لئے کہ جوش اضطراب نے  
 ابھی آتی ہے بوالش سے اس کی زلف شکر کی ہماری دید کو خواب نے لیخا عا ر بستر ہے  
 فرماتے ہیں۔ ابھی تک نگہ سے اس کی زلف شکر کی بوا آ رہی ہے یعنی رات ہی کا تو واقعہ ہے کہ اس کی زلف

نصیب تھا۔ زنجی کی طرح حضرت یوسف کا دلیرانہ غلبہ میں جتنا ہر گز باعث ننگ و رنج نہ رہا۔ کہتا ہے کہ بھوکا دلی کیا حالت ہے بھیرا میں غالب کہ تینا بی سے ہر اک تار بستر خارا بستر ہے  
فرماتے ہیں اسے غالب میں کیا بیان کروں کہ چوڑا میں میرے دل کی کیا حالت ہے مختصر یہ کہ تڑپتے تڑپتے میرے بستر میں ستر ستر پڑ گئی ہیں کہ ایک ایک تار بستر چھو جانے کے لئے خارا بستر ننگ ہے  
خط ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جا  
غزور دوستی آفتب کا تو دشمن نہ ہو جا

قطع

رگ گردن کہ غزور اور غنیظہ غلب کی حالت میں پھول جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں معشوق کہ میری دوستی پر ستر کہ غزور کہ مجھ کو بت خوف پیدا ہو گیا ہے جس قدر خوار است بخت گ گردن ہو جا یعنی محبت ٹھٹھٹے سمجھ اس فصل کی کہ ہی نشوونما غالب اگر گل سڑ کے تو مت پیرا بن نہ ہو بلے  
فرماتے ہیں اسے غالب نفس پیر میں نشوونما کی کوئی تھنی چاہیے اگر گلاب کی پیس بڑھ کر اوپھل کرے۔ و کے دست پر پھولوں کو پیرا بن نہ پیرا دیں۔ نہ رت خیال اور نہ ش لقاہ تو ہیں دوتا

غزل

فریاد کی کوئی کے نہیں ہے نالہ پانہ نے نہیں ہے  
فرماتے ہیں۔ فریاد کے لئے کسی کے کی احتیاج نہیں ہے۔ یعنی بے ساختگی میں نصیب کو نصیب ہے۔ نالہ دل نے کا پابند نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی میں جو اثر ہوتا ہے وہ بناوٹ کی فریاد و زاری میں نہیں ہوتا۔

کیوں بولتے ہیں باغبان تو نے گرباغ گداے سے نہیں ب  
فرماتے ہیں۔ باغبان تو ہوں کی جلیں کس نے باغ میں بولتے ہیں اگر ن سے کشوں کہانی  
بناوٹ موڈ نہیں ہوتا۔ اس کو کشش سے ثابت ہے کہ باغ بھی گداے شراب ہے۔ شب  
یہ ہے کہ سبز و گل کی میر کا شمع شراب پی کر خوب حاصل ہوتا ہے۔

ہر چند ہر ایک میں ہے تو پر تجھ سی تو کوئی ش نہیں ب

فرماتے ہیں۔ ہر وجود یکہ ہر شے میں تیرا جلوہ قدرت جلوہ نما ہے۔ گرتیری۔ نہ کوئی چیز دنیا میں پیدا نہیں ہونی۔ یعنی توحیدانی تشبیہ سے منزہ ہے۔ شعر قصوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا

اور نہایت خوب ہے۔

ہاں کھانا موت فریب کستی ہر چند کہیں کہے نہیں ہے  
فرماتے ہیں۔ ہاں خبردار کہیں کستی کا دھوکہ نہ کھانا۔ ہر چند لوگ کہیں کہہتی ہے۔ مگر تو یہی  
سمجھنا کہ نہیں ہے۔

شادی سے گزر کر غم نہ ہوئے اُردی چونہ ہو تو ٹوٹے نہیں ہے  
فرماتے ہیں خوشی سے دست کش ہو جا پھر تجھے غم نہ ہو گا یعنی اگر تو بہار کے موسم سے لطف  
نشاط حاصل نہ کر لگا۔ تو غم خزاں کیوں لول ورنجیدہ ہو گا۔ اُردی بہار کا مہینہ ہے اور دُخزاں کا  
کیوں رو قدح کرے بے زائد ہے یہ گس کی تے نہیں ہے

گس کی تے یعنی شہد۔ زائد جو شہد پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب کے نفرت کرتا  
ہے۔ اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتنا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے۔ بلکہ  
وہ چیز ہے جو گس کی تے کرنے سے حاصل ہوتی ہے (انیا دگار غالب) شعر زندانہ ہے مگر خوب کہا  
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اسے غالب۔ تو جو یہ کہتا ہے کہ نہ کچھ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے۔ یہ تو ہیں بتا آخر  
تو کیا (اسے نہیں ہے) مطلب ہے کہ لفظ (نہیں ہے) کو اسم قرار دے لیا ہے۔ کہتے ہیں۔ اسے حضرت  
نہیں ہے۔ نہ تو آپ ہستی محض ہیں واجب الوجود کی مانند نہ آپ عدم ہیبت ہیں۔ مبتنع کی طرح اس  
صورت میں لازم ہے کہ جناب کا اسم گرمی (نہیں ہے) رکھ دینا چاہئے۔

نہ پوچھ نسخہ مرجم جراحت دل کا کہ اس میں ریزہ الماس جزا و عظم ہے  
فرماتے ہیں۔ زخم دل کے لئے جو مرجم کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے وہ نہ پوچھو۔ اس لئے کہ اس نسخہ میں  
دواؤں کا جزو اعظم میرے کی کئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زخم دل کے واسطے اس مرجم کا استعمال لازم  
ہے جس سے زخم دن و نوارات جو گناہ بڑھتا چلا جائے۔

بہت دنوں میں تفتان لے رہے پیدلی وہ اک محک کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

فرماتے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد تیرے تغافل نے ایک نگر پیدا کی ہے جو دیکھنے میں لگا رہے  
کم ہے مطلب یہ ہے کہ پہلے تو صرف تغافل یعنی ارادہ چشم پوشی کرتے تھے۔ مگر اب اس ارادہ کو چھوڑ کر  
ادائے اتفاقات برتن شروع کی ہے۔ یعنی پہلے تو میری طرف دیکھتے ہی نہ تھے۔ اب دیکھ لیتے  
ہیں۔ مگر ایک اچھٹی ہوئی نظر سے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارہ نہیں کرتے مرنے ہیں گران کی تمنا نہیں کرتے قطع

فرماتے ہیں۔ ہم کو ان کے عشق میں اپنی ذات سے بھی رشک پیدا ہو گیا ہے اس لئے جان دینی  
قبول کر لی ہے۔ مگر ان کی تمنا سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ یعنی تمنا کرینگے تو وہ آئینگے یا ہم کو ہاں  
بلائیں گے اور ان دونوں صورتوں میں اسٹکھیں ان کو دیکھیں گی۔ ہم کو رشک آئیگا۔ ہاتھ ان  
کے ہاتھ سے لینگا۔ ہم چلیں گے۔ دم ان کے کوچہ کی زمین پر پڑیں گے۔ ہم کو حسد پیدا ہو جائے گا  
اس لئے ہم نے ان کی تمنا ہی کو چھوڑ دیا۔

در پردہ نہیں غیر سے بے ربط نہانی ظاہر کلیہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ انہیں تو غیر سے پردہ میں محبت ملی ہے۔ یہ جو انہوں نے اس سے پردہ کی رسم ہو چوٹ  
کر دی ہے۔ یہ اس کی محبت کے چھپانے کی غرض سے ہے یعنی اگر وہ پردہ کرنے کی حالت میں  
چھپ چھپ کر اس سے ملتے تو رسوا اور بدنام ہو جاتے اب اس کے سامنے ہوتے ہیں کی محبت پردہ ڈالنے کی ہرگز  
یہ باعث امیدوار رہا ہے غائب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے  
فرماتے ہیں غائب تہا عاشق صادق تھا۔ جب تم اسکو برا کہتے ہو تو رقیب ہو ابو اس  
ان باتوں سے شکستہ دل ہو کر ناامید ہو جائیگا۔

غزل

کسے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ خط پیا لہ سرا سر نگاہ گلچیں ہے

فرماتے ہیں۔ شراب تیرے شرف ہونٹوں سے شوخی رنگ حاصل کرنی چاہتی تھی۔ جام پر جو  
خط پڑا ہوا ہے۔ یہ گویا گلچیں کو تار قطر ہے۔ جو تیرے پیول سے لبوں کو چمن رہا ہے۔  
کبھی تو اس سر شوریدہ کی بھی داد ملے کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے



قاعدہ ہے سوہا۔ اور جنوں کی حالت میں نیند آنی موقوف ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔  
 کبھی تو میرے سر شوریدہ کا بھی الفاٹ ہو جائے۔ کہ یہ برسوں سے تکیہ کی حسرت میں مبتلا ہے  
 مطلب ہے کہ وصل میں سوداے عشق کو کمی ہو کر ترکیب سے آشنا ہو جائیگا اور نیند بھی آجائے گی۔  
 بچا ہے گردن سے نالہ ہائے جلیل زار کہ گوش گل خم شبنم سے چنبہ آگیاں ہے  
 فرماتے ہیں۔ اگر پھول بلبل زار کے نالے نہیں سن سکتا تو معذور ہے۔ اس لئے کہ گوش گل  
 شبنم کے قطروں سے نبد ہو گیا ہے۔ گویا اس نے کان میں روئی ٹھوس لی ہے۔ اب کیا خاک  
 نالہ بلبل سن سکتا ہے۔

اسد بنزع میں حل یونفا پر اسے خدا مقام ترک حجاب دل تکمیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ اسد بنزع کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اسے یونفا خدا کے واسطے اس کے پاس حل  
 یہ ایسا ہی وقت ہے کہ بیش حرم و حجاب کو ترک کر دینا اور تکمیں و وقار کو رخصت کر دینا چاہئے۔  
 کیوں نہ ہو چشم تباں محو تغافل کیوں نہ ہو یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے  
 فرماتے ہیں حسینوں کی آنکھ محو تغافل کیوں نہ ہو۔ ضرور محو تغافل ہونی چاہئے۔ اس بیمار  
 یعنی حسینوں کی آنکھ کو نظارہ سے پرہیز ہے۔ چشم بیمار چشم معشوق کی صفت ہے۔

مرتے مرنے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی دوائے ناکامی کہ اس کا فر کا خضر تیز ہے  
 فرماتے ہیں دم نکلتے نکلتے بھی حسرت دیدار پوری نہ ہو سکے گی۔ دوائے ناکامی کا ش ایسا ہونا کہ  
 اس کا دم کا خضر کند ہوتا دشواری سے رک کے گلا گٹھا اور حسرت دیدار تمام و کمال پوری ہو جاتی۔  
 عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسعد پوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے  
 فرماتے ہیں۔ پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اسے اسد ہم کو اپنے دوست کے عارض گل رنگ یا  
 آگے فصل بہاراں جوش اشتیاق پیدا کرنے والی ہے۔

دیا ہے دل اگر اس کو شیر ہے کیا کہئے ہوا رقیب تو ہونا نہ پر ہے کیا کہئے  
 فرماتے ہیں۔ اگر نامہ بھی اس کے حزن و دلکش پر فریفتہ ہو گیا اور بوجہ بشریت کے اپنا دل ہوا ہے

مشتوق کو دے بیٹھا تو اس سے وہ بے خطا ہے۔ اس کو الزام نہ دینا چاہئے۔ ہمارے مشتوق کا  
 حشر دلکش ہی اس غصب کا ہے کہ چوتھوں اس کو دیکھ لیتا ہے ہمارا رقیب بن جاتا ہے اس امر  
 میں ناسہ ہر کی کوئی خطا نہیں۔ عجیب دلکش مطلع لکھا ہے۔

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے ہیں ہے قضا سے شکوہ میں کس قدر رہے کیا کہئے  
 فرماتے ہیں موت کا آنا تو لازمی اور ضروری امر ہے کسی نہ کسی روز کجغت بے جائے آدھ لگی  
 مگر اسکو ہم سے یہ ضد آپڑی ہے کہ آج شب فراق میں ہمارے بلانے سے نہیں آئی۔ زندگی بھر ہم  
 کو اس سے یہ شکایت رہے گی۔

رہے ہیں یوں کہ دیکھ کہ کوئے دست کو اب اگر نہ کہئے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہئے  
 فرماتے ہیں وقت بوقت جب ہم نے رقیب کو دیکھا ہے۔ کوچہ یا رہی میں پایا ہے۔ اب ہم کو نہ

نہ کہیں کہ کوئے دست اس کا گھر بن گئی ہے۔ اندھیرے اُجالے ہر وقت ہیں بڑا ہوا ملتا ہے۔  
 رہے کرشمہ کہ یوں سے رکھا ہے ہلو قریب کہ بن کہیے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہئے  
 فرماتے ہیں۔ اس کے ہر انداز ہر ایک ادا سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے دل کے

حال سے وہ خبردار اور واقف ہے پھر اس سے حال دل کہنے کی کیا ضرورت باقی رہی۔  
 سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرستش حال کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہئے

فرماتے ہیں۔ وہ ادا شناس یہ بات سمجھ لیتا ہے۔ کہ میرزا صاحب اپنی وصنداری کے سبب سے  
 میں مجھ سے گنگو کرتے ہوئے چھٹکے اور جواب میں فرمائینگے کہ یہاں بات چیت کرنے کا موقع نہیں  
 ہے۔ سر بازار مجھ سے دریافت کرتا ہے۔ فرماتے آپ کا کیا حال ہے۔

تمہید نہ ہے کشتہ وفا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہئے  
 فرماتے ہیں۔ تم کو شہہ و نیکو مشاق خیال نہیں ہے تم اس کے راز کو یا نکل بنو لے بیٹھ ہو غیب

بتاؤ تو ہماری مٹی میں کیا چیز ہے نہرت بین اور نظر فانی خیال اس شعروش یہ واقع ہونی بت کہ غیر  
 محسوس کو محسوس چیز قرار دے اور اس طرح یہ ہے کہ پہلے اس کا نام بھی لے دیتا ہے اور باوجود اس کے کہ

کے پھر یہ کہتے ہیں ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر تم بتاؤ کیا ہے تم کو تو رشتہ و نا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔  
 انہیں سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہے کیوں لٹے ہیں جو اسے قطع نظر ہے کیا کہے  
 فرماتے ہیں۔ وہ شوخ مجھ پر اور میرے سوال پر نظر کر کے یہ سمجھا ہے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے  
 جو مجھ سے ایسا دور از عقل سوال کرتا ہے اور مجھ کو جواب سے قطع امید ہے میں سوال کے بعد ان سے یہ نہیں  
 ہی نہیں رکھتا کہ مجھے میرے سوال کا جواب عینیت فرمائے یہ ہندیش اور ترکیب بیان اور بیاضی کے  
 ساتھ دونوں مصرعوں کا دو لخت ہونا کس کو نصیب ہوتا ہے۔

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے ستم بہلے ستار ہنر ہے کیا کہئے  
 یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کمال سخن کے لئے حسد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ مجبوری  
 ہے کیا کیا جائے اور ستار ہنر کی قیمت ستم روزگار ہے کیا شکایت کیجئے۔ دونوں شعر بیت بھنڑا میں  
 کہا کسی نے کہ غالب برا نہیں لیکن سوائے اسکے کہ آشفۃ مصرعے کیا کہے  
 کسی کا اشارہ معشوق کی طرف ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس نے یہ ارشاد کیا ہے۔ کہ غالب آدمی  
 برا نہیں ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ دیوانہ ہے اور اس کی نسبت کیا کہا جاسکتا ہے۔

دیکھ کر وہ پردہ گرم دامن انشائی مجھے کر گئی والبستہ تن میری عریانی مجھے غزل  
 یہ شعر قصوت میں ہے۔ فرماتے ہیں میں مجبور تھا۔ مجھ کو جہانیت سے تعلق ہی نہ تھا۔ مگر سرد گرم دامن  
 انشائی دیکھ کر مجھ کو میرے بھر دے قید جسم میں پھنسا دیا اور خود رخصت ہو گیا عریانی سے مراد پہلے تعلق ہے  
 بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں مرحبا میں کیا مبارک ہے گرا نجانی مجھے  
 فرماتے ہیں میں ایسا سخت جان واقع ہوا ہوں کہ تیغ نگاہ یار کے زخم کھاتا ہوں اور زخم ہوں  
 گویا سنگ فساں ہوں۔ کہ اس پر خواہ کتنی ہی تلوار کو آبدار کرنے کے لئے رگڑو۔ مگر وہ کٹا نہیں بھر  
 ثانی میں طنز آکھتے ہیں کہ میری سخت جانی میری جان کے لئے بہت مبارک ہو گئی ہے کہ اس نے  
 مجھ کو تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں بنا دیا ہے۔

کیوں نہ ہو بلے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے جانتا ہے مجھ پر شہائے پنہانی مجھے

فرماتے ہیں۔ اس کی طرف سے بے انتہائی کا اظہار کیونکر نہ ہو۔ اس ظالم کی خاطر جمع ہے  
یعنی وہ مجھ کو یہ جانتا ہے کہ یہ شخص میرے تصور سے باتیں کیا کرتا ہے اور خیالی پس منظر  
نہانی سے مست ہو رہا ہے۔

مجھے غمخانی کی قسمت جب تم بولنے لگی لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ روز ازل میں کاتب تقدیر نے میرے غمخانی کی قسمت رقم کی تھی اس وقت  
مجھ کو اپنے گھر کی ویرانی کا سبب قرار دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کی ویرانی میری ہی  
ذات سے علاقہ رکھتی ہے۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے ابرقدرتوں کو اسے مرغبتانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ مجھ کو خوشنویان چین کے زمزمے سننے کا شوق ہے۔ اور وہ کاؤ میز پر اس  
شوق سے بدگماں ہوتا ہے۔ اسے کاش مجھ کو یہ شوق نہ ہوتا۔

ہائے واں بھی شور مچانے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گوریں ذوق تن آسانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ افسوس ہے۔ قبر میں بھی مجھ کو شور قیامت نے جگا دیا۔ میں تو نیت بھر کے سونے  
کی غرض سے اور راحت حاصل کرنے کی غرض سے گوریں گیا تھا۔ بے مثل شعر کہا ہے۔  
وعدہ آئے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی بانی  
وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی بانی  
مجھے سوپ ڈی ہے بالکل نیا پیرائے بیان ہے لازماً دگر غالب اے نصیر شعر لکھا ہے۔

ہاں نشاطِ فصل بہاری واہ واہ پھر بولے تازہ سوداے غزلچوانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ ہاں اے نشاطِ فصل بہاری تیری کیا بات ہے تیری آمد آدھو دیکھو کچھ مجھ کو  
سوداے غزلچوانی تازہ ہو گیا ہے اپنی تیری مدد سے سرگرم غزلچوانی ہو گیا ہوں۔

ای مئے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی میرزا یوسفؔ، نالتب یوسفؔ ثانی مجھے  
میرزا یوسفؔ میرزا حبیب کے بڑے بھائی تھے چو غنچوان شہبازؔ میں دیا اٹنے ہو گئے تھے



یہ قطع ان کی صحت یا بی کی مبارکباد میں لکھا ہے مطلب یہ ہے کہ زندگی دوبارہ پانے سے دوسرا  
یوسف مل گیا ہے۔

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے سچہ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے غزل  
فارسی محاورہ میں یارب کے معنی خدا سے زیادہ کرنے کے ہیں اور سچہ زاہد سے ذکر خفی مراد  
ہے فرماتے ہیں مجھ کو شادی میں بھی شور یارب یاد ہے میرا مسکرا نا بھی گویا زاہد کا ذکر خفی ہے  
مطلب یہ ہے میں کسی حال میں یاد آتی سے غافل نہیں رہتا۔

بے نشادہ خاطر والستہ در رہن سخن تھا طلسم قفل ابجد خانہ کتب مجھے  
فرماتے ہیں جسطرح قفل ابجد حروف کے مل جانے سے واہو جاتا ہے یعنی جب تک  
پھر کیوں کو پھر اگر حروف سے وہ فقرہ نہ بن جائے سبکی ترتیب قائم ہونے سے قفل کھلتا ہے قفل  
کھل نہیں سکتا اسی طرح سخن سے میری طبیعت کھل جاتی ہے یعنی شعر کہتے وقت یا اچھا  
شعر سننے کے وقت میرا غنچہ خاطر کھلتا ہے۔

یارب ابر آشفگی کی داد کس سے چاہئے رشک آسائش یہ ہے زندانی کی اب مجھے  
فرماتے ہیں یارب میں اپنی معذرت کی داد کس سے چاہوں جب میں قید خانہ میں تھا  
تو بیابان گردی کا شوق مجھ کو پریشان رکھتا تھا اور اب میری آوارہ گردی ہو تو اہل  
زندہان پر مجھ کو رشک آتا ہے۔

طبع ہے مشتاق لہتہائے حسرت کیا کرد آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے  
فرماتے ہیں میری طبیعت حسرت و حیران کی مشتاق ہے یعنی مجھ کو حسرت و حیران میں  
لطف زندگی حاصل ہوتا ہے میں امید اسی غرض سے کرتا ہوں کہ وہ لوٹ جائے اور  
مجھ کو لذت حیران حسب وخواہ حاصل ہو جائے۔

دل لگا کر آپ بھی غالب بھی سے ہوئے عشق سے کہتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے  
فرماتے ہیں دل لگا کر غالب بھی جیسے عاشق بن گئے گوئی ان سے یہ تو چھو کہ میرزا صاحب

آپ تو مجھے ترک عشق کی نصیحتیں کیا کرتے تھے آپ نے کیوں دام عشق کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا  
یہاں (آپ) کا لفظ خطاب کے لئے نہیں ہے۔

غزل حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے چمن میں خوشنویان چمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے دربار میں شاعروں کا امتحان ہو رہا ہے اور یہ ایسی بات ہے گویا باغ  
میں خوشنویان چمن کا امتحان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دربار کے تمام و کمال شعر انفرز گو ہیں۔ ان کا  
امتحان ایسا ہی امتحان ہے جیسا باغ میں خوش الحان جانوروں کا جس شاعرہ میں میرزا حسن  
نے غزل پڑھی تھی۔ بادشاہ رونق افروز تھے۔

قد و گیسو میں کون کی آزمائش ہے جہان ہم میں ہاں اور سن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ مجھوں اور کون کون کے لئے جو بیستیں تھیں وہ صرف لیلیٰ و شیریں کے قد و گیسو کی  
محدود تھیں لیکن ہم کو ایسے ظالم سے پالا پڑا ہے جو عشق قیامت کی آگ میں دھار پر کھینچتا ہے اور  
سودائے زلف کی سزا پھانسی تجویز کرتا ہے۔

کریں گے کوہکن کے حوصلہ کا امتحان آخر ہنوز اس خستہ کے نیرے تن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ ابھی تو صرف کوہکن کی طاقت و دست باز کا امتحان لیا جا رہا ہے کہ اس کو جوئے  
شیر رکھنے اور کوہ بے ستون کلشنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبر ضبط کی طاقت آزمائی کا امتحان تو اس وقت  
ہوگا جب ایک پیرزن مرگ شیریں کی دغا خیز خبر لے کر اس عاشق و امرد کے پاس پہنچے گی۔ اور وہ کم حوصلہ  
تیشے سے سر پھوڑ کر مر جائیگا۔ گویا کوہکن پر طعن ہے کہ وہ کم حوصلہ جان دیکر میدان عشق سے بھاگ نکلتا  
نیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی اُسے یوسف کے پیر ہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ نیم مصر کو پیر کنعاں یعنی حضرت یعقوب کی کچھ ہوا خواہی نہیں ہے۔ اسے تو حضرت  
یوسف کی خوشبوئے پیر ہن کا امتحان منظور ہے۔ وہ مصر کے کنعان کی طرف اس خوشبو کو دیکھنے کو  
لے چلی ہے۔ کہ یہ خوشبو ہوا میں پھیل کر کتنی دور تک قائم رہ سکتی ہے اور کیا اثر پیدا کرتی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہنا پھر کہ غافل تھے شکست و صبر اہل اکہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ صبر و شکیب لوٹ لیجانے والا معشوق وہ سامنے بزم کے اندر آ گیا ہے دیکھو  
خبردار ہو جاؤ۔ پھر نہ یہ حذر کرنا کہ ہم غافل تھے۔ غفلت کی حالت میں ہم پر اس کا وار چل گیا اور  
یہ بھی ظاہر کئے دیتے ہیں کہ اسے صبر و قرار اہل بزم کا امتحان منظور ہے اس لئے اس نے یہاں قدم نہ  
فرمایا ہے جتن بیان اور بندش الفاظ تعریف سے کستنی ہے۔

بے دل ہی میں تیرا چھا جگر کے پار ہو بہتر غرض شست بت ناوک فگن کی آزمائش ہے  
فرماتے ہیں۔ تیرا خواہ دل میں رہ جائے۔ خواہ دل ہو جگر کو توڑ کر سینہ سے پار ہو جائے۔ دونوں  
صور توں میں غرض یہ ہے کہ بت ناوک فگن کا نشانہ دیکھا جائے کہ وہ قادر انداز ہے یا نہیں۔  
ارادے کے ساتھ اسکا تیر نشانہ پر بیٹھا یا خطا کر کے آگے۔ بیان کی خوبی کا کیا پوچھنا ہے۔

ہمیں کچھ سچہ و زتار کے پھندے میں گیزی وفاداری شیخ و برہمن کی آزمائش ہے  
فرماتے ہیں۔ سچہ و زتار کے پھندوں میں جو شیخ و برہمن رگڑ رہے ہیں اس میں سچہ و زتار کے پھندے  
کی مضبوطی نہ دیکھو۔ بلکہ یہ امتحان کرو کہ میدان وفاداری میں ان دونوں میں سے کونساں  
پورا اترتا ہے۔ یعنی زندگی بھر پابندی کے ساتھ اس منع کو کون نبھاتا ہے شیخ یا برہمن۔  
پڑا رہے دل وابستہ بتیابی سے کیا حال مگر پھر تار بنے لفت پر شکن کی آزمائش ہے  
فرماتے ہیں۔ اسے دل اسی طرح بندھا ہوا پڑا رہے۔ تھپ نہی۔ اگر تو تڑپے پھر کے گا تو زلف  
کے پھندے اور زیادہ کس جائینگے۔ تو بتیابی سے زلف پر شکن کے پھندوں کا کیا امتحان لیتا ہے بھلا  
تیری بتیابی سے کہیں وہ کھلنے والے ہیں۔

رگ پے میں حب اُتے ہر غم ٹپکتے کیا ہو ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے  
فرماتے ہیں۔ زہر عشق رگ پے میں جو کت سلاکت کرے وہ انجام دیکھنے کے قابل ہو گا ابھی  
تو آغاز عشق ہے صرف اس کی تلخی سے منہ کا مرہ کڑوا ہو گیا ہے۔ کام و دہن کا امتحان ہو رہا ہے

انجام بہت سخت ہونے والا ہے۔  
وہ اپنے مرے گھر وعدہ کیا دیکھنا غنا  
نئے منتوں میں اپنے کہن کی آزمائش ہے



نہرتے ہیں۔ وہ میرے گھر آئینگے نہیں۔ تھیامت تک آئینگے۔ اسے غالب ان کو اپنے وعدہ کالب خیال ہے۔ وہ تو اس کو بھنوں بھی گئے ہونگے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ آسمان کس کس بیست میں جتا کرتا ہے یعنی ان کی وعدہ خلائی سے اور نہ آنے سے یہ دیکھنا ہے۔ کہ آسمان ہم پر انکی حدائی میں کیا مصیبت توڑتا ہے۔

غزل کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گرا جائے مجھے جہاں میں کہانی یاد نہ سراجاے ہے مجھے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں۔ اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی نہیں کر سکتا۔ (از یادگار غالب)

خدا یا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے مجھے

ذرا تے ہیں! الٹی کیا میرے جذبہ دل میں الٹا اثر پیدا کر دیا ہے۔ کہ جب قدر میں اس کو اپنے جذبہ دل سے کھینچتا ہوں اسی قدر وہ مجھ سے آزدہ خاطر اور بیم مزاج ہوتا جاتا ہے۔

وہ بدخوا اور میری دانتان عشق طولانی عبارت محقر قاصد بھی گھبرا جائے مجھے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شوخ بیت بدخوا بد مزاج ہے دوسرے یہ کہ میری دانتان عشق اس قدر طولانی ہے۔ کہ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتی قصہ مختصر یہ کہ

قاصد بھی میرے پیام سنتے سنتے گھبرا جاتا ہے تو پھر بھلا مذاق بد خواتی لپی چوڑی داستان کب سنتی گواہ کر گیا ادھر وہ بدگمانی ہے اور دھریہ ناتوانی ہے

نیز پوچھا جگہ اس سے نہ بولا جگہ مجھ سے فرماتے ہیں وہ تو میری جانب سے ایسا بدگمان ہے کہ اس کو کسی طرح میری محبت کا یقین ہی نہیں

آتا جب میں اس سے کچھ کہتا ہوں۔ وہ کہہ دیتا ہے۔ تو جھوٹا ہے اور میں اس قدر ناتوان ہو گیا ہوں

کہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دلیل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ وہ بدگمانی کی حالت میں میرا حال مجھ سے

کیوں پوچھے اور میں ناتوانی کی صورت میں اپنی مصیبتیں کیونکر اس سے مفصل بیان کر سکو

ندرت بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

سنبھلنے دے مجھے ناامیدی کیا تھی کہ وہاں خیال یا چھوٹا ہے مجھے



فرماتے ہیں۔ اے ناامیدی کیوں مجھ کو گرائے دیتی ہے۔ ذرا تو سمجھنے دے دیکھ۔ دامن خیال ان  
میرے ہاتھ سے اب بھوٹ جائیگا۔ مطلب ہے۔ ناامیدی کی وجہ اسکا خیال دل سے نکلا جاتا ہے۔  
تکلف برطرف تنظارگی میں بھی ہیں لیکن وہ دیکھا جائے گی۔ کبت ظلم دیکھا جائے گا مجھ سے  
فرماتے ہیں۔ یہ میں نے انا کہ اس کے دیکھنے والوں میں میں بھی شامل ہوں۔ مگر یہ ظلم مجھ سے  
کبھی نہ دیکھا جائیگا کہ اس کو لوگ دیکھیں۔ بھلا یہ رشک مجھے کیونکر گوارہ ہو سکتا ہے۔  
ہوئے میں پاؤں ہی پہلے ہر عشق میں زخمی نہ بھاگا جائے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے مجھ سے  
اس میں وجدانی کیفیات کی تشیل محسوسات کیساتھ دی گئی ہے مطلب یہ کہ وہ قوی جن کے  
عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدید پر تحمل کرنے کی قدرت تھی۔ ابتدا سے عشق میں نہیں کو صد  
پہنچا۔ میں اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے۔ کہ اس پر صبر و تحمل کیا جاسکتا ہے (از یادگار غالب)  
قیامت کے موئے مدعی کا ہمسفر غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے مجھ سے  
فرماتے ہیں۔ قیامت کی بات ہے کہ اس کافر کو رخصت کرنے کے وقت میں یہ کہوں کہ  
جاؤ خدا کو سونپا۔ خدا حافظ تم کو خدا کی حفاظت دامن میں دیا۔ بھلا یہ رشک تو مجھ سے گوارہ  
ہی نہیں ہوتا۔ پھر یہ ستم دیکھو کہ وہ مدعی کا ہمسفر ہو۔

غزل  
زبکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے کشادہ لبست مژدہ سیلی اندامت کے  
فرماتے ہیں۔ ہر دنیا کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھنا ایک دیوانگی کی علامت ہے تماشا دیکھنے  
کی حالت میں آنکھوں کا کھلنا اور جھپکنا گویا اندامت کے طہا نچے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا نے  
ناپائند اس قابل نہیں ہے کہ کوئی اہل دل اسکا تماشا بن کر اپنا وقت ضائع کرے اور انجام  
کار خادوم و فحل ہو۔

نہ جانوں کیونکہ مئے داغ طعن بہ نہی تجھے کہ آئینہ بھی ورطہ علامت ہے  
فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں تیری بد عہدی کے وجہ سے کس پالی سے چھوٹیں گے۔ ہرے واسطے  
تو آب آئینہ بھی ورطہ علامت ہے یعنی تو آئینہ دیکھ کر عیروں کے دکھانے کو بناؤں گھبرا کر رہے

جو حقیقتاً بد عہدی میں داخل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے ساتھ جو جھوٹے وعدے کئے جاتے ہیں۔ وہ بھی غیروں سے وفا ہوتے ہیں۔

پیچ و تاب سے سلک عافیت مت توڑ      نگاہِ عجز سرِ رشتہ سلامت ہے  
 فرماتے ہیں ہوس کے پیچ و تاب میں پھنس کر سلک عافیت کو نہ توڑ۔ اگر سلک عافیت ٹوٹ جائیگی  
 تو پھر عافیت کا کیس پتہ بھی نہ ملے گا۔ نگاہِ عجز یعنی ترک ہوا و ہوس ایک سرِ رشتہ ہے۔ سلامتی کا مطلب  
 یہ ہے کہ ہوس رانی سے دونوں جہان کی راحت و آسائش برباد ہو جاتی ہے۔

وفا مقابلِ دعوٰی عشق بے بنیاد      جنونِ ساختہ و فہل گلِ قیامت ہے  
 اس شعر میں رقیبؔ الہوس پر طعن کی ہے۔ فرماتے ہیں معشوق و فدا دار تو وفا کر نے پر آمادہ  
 ہوا اور عشق کا دعویٰ جھوٹا کیا جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے سچا موسم بہار آگیا ہوا اور جنون  
 بنا دیا ہو اس سے زیادہ شرمناک اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

غزل      لا خراشا ہوں کہ گر تو نرم یں جاؤ مجھے      سیراز مددیکہ کر گر کوئی تبلا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ تو رقیب کے خوف سے مجھ سے ملنا کیوں ترک کرتا ہے۔ میں تو اس قدر لاغر ہو گیا  
 ہوں کہ اگر تو مجھے اپنی محفل میں بلائے اور اپنے پاس بٹھائے تو میں کسی کو نظر بھی نہ آؤں۔

کیا تعجب ہے کہ اسکو دیکھ کر آجائے رحم      داں ملک کوئی کسی حیلہ سے پہنچے دیکھے

فرماتے ہیں۔ میرا حال ایسا زبردست اور ہولناک ہے کہ اگر ان کے کوچہ تک کوئی شخص بہارا دے کہ  
 مجھ کو پہنچا دے اور ان سے میرا سامنا ہو جائے تو تعجب نہیں کہ آنکھ ملے ہی انکو بھی مجھ پر رحم آجائے۔

منہ نہ دکھلائے نہ دکھلا پر یہ انداز عشا      کھو لکر پردہ زرا آنکھیں ہی دکھلا دیکھے

فرماتے ہیں۔ اگر تو مجھ سے حجاب کرتا ہے۔ سلنے ہونے اور منہ دکھانے میں شرماتا ہے۔ تو

منہ نہ دکھا لیکن غصہ کے انداز سے پردہ ہٹا کر آنکھیں تو مجھے دکھا دے (آنکھ دکھانا۔ خفا ہونے کے

موقع پر بولا جاتا ہے) میں دیکھوں تو یہی کہ تیری آنکھوں میں کس قدر غصہ ہے اور غصہ کی حالت

میں تیری آنکھ کا کیا رنگ ہوتا ہے۔

یاں تلک میری گرفتاری وہ خوشی میں زلف گنجائوں قشائے میں الجھاؤ مجھے  
فرماتے ہیں۔ استقدر وہ میری گرفتاری سے خوش ہوتا ہے کہ اگر بالفرض محال میں اسکی زلف  
بن جاؤں جو گرفتاری کا ایک لہر ہے تو اس زلف کو بھی وہ شانہ میں الجھا دے اور گرفتار کر دے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرا گے ہوتا ہے شرب و زنا شامرا گے  
فرماتے ہیں۔ دنیا میری نگاہ میں ایک بازیچہ اطفال ہے ان فضیلتی حادثوں کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا  
رات دن یہ واقعات دیکھتا ہوں اور ان کو ایک بھان متی کا تماشا جانتا ہوں۔ پیشل مطلع لکھا ہے۔

ایک کھیل ہے، اوزنگ سلیمان کے ایک بات ہے اعجازِ مسیحی مرا گے  
فرماتے ہیں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا لہ کا دیکھنے والا ہوں۔ تختِ سلیمان میرے نزدیک ایک  
کھیل ہے۔ ایسی ایک معمولی شے ہے اور اعجازِ مسیحی میری نگاہ میں ایک معمولی درجہ کی بات ہے۔ بات کے  
نقطے اعجازِ مسیحی کے مقابل میں محبِ لطیف پیدا کر دیا ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

چیز نام نہیں صورتِ عالم مجھے نظر اس جزو ہم نہیں سستی اشیا مرا گے  
اس شعر میں فلسفہ اور تصوف کا ایک عجیب لہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ عالم کا نام ہی نام ہے  
اس کی صورت نظر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ سستی اشیا میرے روبرو سوکھ اوجھ کے اور کچھ نہیں ہے۔ مطلب  
یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا میں کسی شے کو موجود نہیں سمجھتا۔

ہوتا ہے نہاں گروں صحر امر گے گھستا ہے میں خاکِ دریا مرا گے  
فرماتے ہیں میں دیوانگی کے عالم میں استقدر خاک اڑاتا ہوں کہ جنگل گرد میں پوشیدہ ہو جاتا ہے  
اور آنکھوں سے استقدر اٹک بیٹا ہوں کہ دریا میرے آگے بہ نکلتا ہے۔ پانی کے زور کو جس  
رگڑنے سے تعبیر کیا ہے۔

مست پوچھ کہ کیا حال میرا ترے چچے تو دیکھ کہ کیا رنگ تیرا مرا گے  
فرماتے ہیں مجھ سے یہ نہ پوچھ کہ تیری حیوانی میں یہ کیا حال ہوتا ہے۔ بلکہ تو یہ دیکھ کہ تیرا  
میرے روبرو کیا رنگ ہے۔ یعنی تو میرے سامنے آکر استقدر پریشان اور مضطرب الحال ہو جاتا ہے۔

یعنی یہی حال میرا تیرے جی میں ہو جاتا ہے۔

سچ کہتے ہو خود میں خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

فرماتے ہیں۔ یہ تو سچ کہتے ہو کہ میں خود دین و خود آرا ہوں۔ لیکن جب تم سا آئینہ جیسے میرے آگے بیٹھا ہو تو میں کیوں نہ خود دینی و خود آرا بنی کر دوں۔

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار رکھدے کوئی پیام مر کے

فرماتے ہیں۔ پھر دیکھئے میری زبان سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ میرے آگے ایک گلاس اور شیش شراب کا بھر کر کوئی رکھ دے۔ مانگیا ہے کہ میرزا صاحب شام کے وقت پیار کرتے تھے اور شب کو غمگینی کے عالم میں عجب پیر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

نفرت کالماں گزے ہے میں شکست گزرا کیونکر کہوں لونا نہ انکار مر کے آگے

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص معشوق کا نام میرے سامنے لیتا ہے تو میں بوجہ رشک کے بے لطف ہو جاتا ہوں۔ لوگ اس کو نفرت نہ معمول کرتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں رشک کرنا چھوڑ دوں یہ تو کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ اس کا نام میرے آگے نہ لو۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ سے پیچھے ہے کلیا مر کے آگے

فرماتے ہیں۔ ایمان مجھ کو روکتا ہے یعنی کعبہ میری پشت کی جانب ہے جب آگے قدم بڑھاتا ہوں۔ تو کعبہ کی طرف کشش پیدا ہوتی ہے۔ اور کفر مجھ کو کھینچتا ہے۔ یعنی گر جا میرے منہ کے سامنے ہے اور وہ کھینچ رہا ہے کہ اوپر چلا آ۔

عاشق ہوں معشوق فریبی مرا کام مجنوں کو برا کہتی ہے بیل مر کے آگے

فرماتے ہیں۔ ہوں تو میں عاشق مگر معشوق فریب عاشق ہوں۔ یعنی ساری دنیا کے معشوق مجھے خبت رکھتے ہیں بیل میرے مقابلہ میں مجنوں کو برا کہتی ہے اور میری تعریف کوئی ہے۔

خوش ہوتے ہیں پر دل میں نہیں خوش آلی شب چراں کی تما مر کے آگے

فرماتے ہیں۔ سب عاشق و دل میں خوش ہو کر لے ہیں۔ مگر شادی مرگ نہیں ہو جاتے معلوم ایسا



ہوتا ہے کہ شب فراق میں جو میں نے مرنے کی تمنا اور آرزو کی تھی وہ وصل میں میرے سامنے آئی  
یہ شعر میرزا کے نشروں میں کا ایک نشتر ہے۔

سے موجزن اک قلزم فوں کاشن ہی ہو      آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ یہ جو اک شک خونی کا دیامیری آنکھوں سے بہ رہا ہے۔ کاش ایسا ہو کہ اسی  
معیت پر خاتمہ ہو جائے مگر نہیں دیکھئے ابھی کیا کیا آئیں اور مصیبتیں میرے آگے آتی ہیں۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے      رہنے دوا بھی سا غرو میں مگر آگے

یہ شعر بھی میرزا کے مشہور نشروں میں کا ایک نشتر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگرچہ اب ہاتھ حرکت نہیں کرتا  
اور جام اٹھا کر منہ سے لگانے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے لیکن ابھی تک آنکھوں میں جان باقی ہے

شیشہ دسا غرو بھی میرے آگے سے نہ اٹھاؤ۔ میں دیکھ ہی کر مست ہو رہا ہوں۔

ہم پیشہ و ہم مشرب ہمارا ہے میرا      غالب کو پرا کیوں کہوا چھامرا

فرماتے ہیں۔ غالب میری طرح سے عاشق بھی ہے اور میرا ہم مذہب بھی ہے اور راز دار بھی ہے

تم اسکو میرے سامنے کیوں بڑا کہتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ شوق ابھی حضرت غالب کو چھانتا نہیں ہے  
خود بدولت ہی اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ عجب پر لطف مقطع لکھا ہے۔

کہوں جو حال تو کہتے ہو بدعا کہئے      تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

غزل

فرماتے ہیں۔ میں اگر اپنا حال بتا بی شوق کہتا ہوں تو تم کہہ دیتے ہو کہ بدعا کہئے۔ حالانکہ تم میرے  
بدعائے دل سے بخوبی واقف و آگاہ ہو اور پھر تجاہل عارفانہ کرتے ہو۔ اب میں تم ہی سے پوچھتا

ہوں کہ تمہارے اس پوچھنے کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہئے۔

نہ کہنا طعن ہے پھر تم کہ ہم سنگریں      مجھے تو فو ہے کہ جو کچھ کہو یا کہئے

فرماتے ہیں۔ تم میری عادت سے بخوبی آگاہ ہو کہ میری یہ عادت ہے کہ تمہاری ہر بات پر میں  
درست اور بجا کہہ دیا کرتا ہوں پھر تم نے طعن سے کیوں کہا کہ ہم سنگریں۔ عادت کے موافق میری زبان

سے نکل گیا۔ کہ بجا و درست ارشاد ہوا۔ اب مجھ سے یہ وجہ آرزو کیوں ہوتے ہو پھر بھی طنز اپنے کو

شکر نہ کہتا۔ وہ میں تو بھی بھی بغیر سوچے سمجھے بجا کہہ دوں گا۔

وہ میشری پر دیکھیں جیسا تر جائے نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے  
فرماتے ہیں۔ یہ ہم نے نہ لیا کہ نگاہِ ناز بھی نشتر ہے۔ مگر جب دل میں اتر جائے یعنی لاشیں  
ہو جائے اور دل اس کو قبول کر لے۔ پھر نگاہِ ناز کے آتش کہنے میں کیا تردد ہے۔  
نہیں ذریعہ راحت جراثیم پکلیں وہ زخم تیغ ہے جسکو کو دکشا کہئے  
فرماتے ہیں۔ زخم پکیاں تیرا شرحِ خاطر کا شیب میں ہو سکتا جس زخم کو دکشا کہنا چاہئے۔  
وہ تلوار کا زخم دامن دار ہے۔ اس سے دل بپاش ہو جاتا ہے۔

جو مدعی بنائے نہ مدعی بنئے جو ناسر ا کہے اسکو نہ ناسر کہئے  
فرماتے ہیں۔ دشمنی کے مقابلہ میں دشمنی کرنی حسنِ اخلاق کے بے سود اور اہلِ طرف کا کام نہیں ہے  
اگر کوئی شخص ختم کو برا کہے تو ہم اس کے جواب میں اسکو برا نہ کہو۔ بُرائی کا بدلہ بھلائی سے بہتر ہے  
تم دشمنی کے مقابلہ میں احسان کرو۔

کہیں حقیقت جانکا ہی مرض لکھئے کبھی شکایت رنج گراں نشیں کہئے  
فرماتے ہیں کہیں تو جانکا ہی مرض عشق کی حقیقت لکھئے یعنی فراق و جبر میں دل پر جو کچھ صدمہ  
گزرتا ہے اس کی مفصل حالت اور کہیں ناسازی و فدا کی مصیبت بیان کیجئے۔ یعنی وصل بھی  
درِ عشق کے لئے ناموافق و وثابیت ہوتی ہے یعنی معشوق سے تکرار۔ شوق کی بیتیاں حصول  
کا کھٹکا۔ رشک رقیب کی خلش یہ سب باتیں وصل میں چھین رکھنے والی ہیں۔

کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجئے کہیں حکایت صبر گریز پا کہئے  
فرماتے ہیں۔ ہماری عمر سی غم و آلام میں گزر رہی ہے کبھی مصائب و ہجر کا دکھ اڑتے جیہٹے  
ہیں کبھی صبر گریز پا کی شکایتیں زبان پر آتی ہیں سننے والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ دشمن ہتے ہیں  
اجباب طعن زنی کرتے ہیں۔ ایک محبت کے ساتھ ہزار اذیتیں ہیں۔

ہے نہ جان تو قاتل کو خونہا دیجئے کئے زبان تو خنجر کو مرجھا کہئے

فراتے ہیں محبت میں دست نہ سنگ آمد و پیمان وفا کا معاملہ ہے۔ جان نکلے وقت قاتل کو  
خون بہا معاف کر دینا چاہئے اور زبان کٹ جائے تو خنجر کی مدحت سرائی کرنی چاہئے۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے **والی روش مستی ادا کہئے**  
فراتے ہیں معشوق کی عیب جوئی کرنی مذہب عشق میں گناہ عظیم ہے۔ اگر اسکو محبت نہیں ہے  
نہ ہو لیکن معشوق تو ہے اس کی خوبیاں بیان کرنی چاہئیں۔ اس کے ناز و انداز ادا و حسن کی تعریف  
بیان کرنی مناسب و ادلی ہے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے **طراوت چمن و خوبی ہوا کہئے**  
فراتے ہیں۔ بہار کو فرصت قیام نہیں ہے نہ ہو۔ مگر پھر بھی موسم بہار تو ہے۔ یہ شکایت  
چھوڑ کر طراوت چمن کی تعریف اور ٹھنڈی ہوا کی مسرت و خوشگوار سی بیان کرنی چاہئے۔  
**سفینہ جیکہ کنار پہ آنگا غائب** **خدا سے کیا تم و جوڑا خدا کہئے**

فراتے ہیں۔ اسے غالب مصیبت اور تکلیف کا وقت گزر جانے کے بعد ان کو بھول جانا چاہئے  
دل میں گروہ نہ باندھنی چاہئے بلکہ پھر کسی سے شکایت بھی نہ کرنی چاہئے۔ درحقیقت ان کے چار باتوں پر  
حکمت و اخلاق کا حصر رکھا ہے۔ ان میں سے دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں اور دو باتیں بھول جانے  
کی۔ موت کا آنا اور خدا کا حاضر و ناظر جانا۔ یہ دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں۔ اور کسی شخص پر احسان کر کے  
اور کسی شخص کی برائی برداشت کر کے یہ دو باتیں بھول جانی چاہئیں۔

**عزل** **رہنے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے** **دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاؤں گئے**

دھویا جانا۔ بے شرم و بیباک۔ پاک۔ آزاد یا شہداء مطلب ہے۔ کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں  
نکلے تھے تو اس بات کا پاس لگا دیا تھا کہ عشق کا راز کسی بہ ظاہر نہ ہونے یا نہ۔ مگر جب رونا ضبط نہ ہو  
اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے راز عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حیا  
ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے اس مطلب کو ان نغزلوں میں ادا کرنا کہ رونے  
سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے۔ بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے۔ (رازیہ نگار غالب)

صرف پیائے مے ہوئے آلات میکشی تھے یہ سی دوستانوں پاک ہو گئے

فرماتے ہیں: ظہور سے کی ایک نہر سست بنا رکھی تھی ہر روز ہر پرتال کرنی پڑتی تھی۔ برتنوں کا  
بگنا سنبھال نہیتی سامان کا نقل میں بند کرنا ان کی حفاظت کرنی غرض یہ کہ جان بقیہ میں آگئی  
تھی اکثر کلاس چاندی سونے کے تھے۔ ان سب کو بیچاران کے داموں کی شراب نوش فرمائی گئی  
کے قرضدار رہے نہ برتنوں کی حفاظت اور ان کے نیکھنے پڑھنے کا جھگڑا ماتی رہا۔  
ہوئے دہر کو ہوئے آوارگی سے تم بارے طبیعتوں کے توجہ لاک ہو گئے  
فرماتے ہیں اگرچہ آوارگی کے سبب تم زمانہ بھر میں بدنام و رسوا ہو گئے لیکن پھر بھی اتنا فائدہ  
حاصل ہوا کہ شمع طبیعت اور حاضر جواب بن گئے طبیعتوں کا چالاک ہونا محاورہ ہے جمع و مفرد دونوں  
طرح سے بولا جاتا ہے۔

کہتا ہے کون نالہ بلبل کو بے اثر ہرے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

فرماتے ہیں: نالہ بلبل کو بے اثر کون کہتا ہے۔ وہ کہنے والا ہمارے سامنے تو آئے۔ گل  
کے لباس میں لاکھوں جگر چاک ہو گئے۔ پھولوں کے کھلنے کو جگر چاک ہونے سے تعبیر کیا ہے غرض  
یہ ہے کہ عاشق کی فریادیں اثر کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود عدم اہل شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

فرماتے ہیں: اہل شوق کا وجود عدم کیسا ہے اپنی آتش شوق میں خود ہی گھاس بھوس کی طرح  
سے جل گئے اہل شوق سے یہاں عاشقان الہی مراد ہیں جو شب و روز کسب فی اللہ میں مشغول  
رہ کر اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں۔

کرنے گئے تھے اس تغافل کا ہم گلد کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہد حقیقی کا جو معاملہ جو غیر عاشق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کے ساتھ اور عاشق کے معاملہ  
کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے۔

لے زائد و عاشق از تو روز نالہ و آہ دور تو ہنر یک ترا حال تباہ

رباعی



کس نیست کہ جان از تو سلامت ببرد      آزار بہ تغافل کشی این را بہ نگاہ  
 پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ  
 کے خواستگار ہوئے تھے جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔ راز یا ہمارا غالب  
 اس رنگ کے اٹھائی کل اُس نے اس کی تعریف      دشمن بھی جسکو دیکھ کے غمناک ہو گئے  
 فرماتے ہیں۔ اس نے غلات توقع اس توقیر اور عزت کیا تھا کل میرزا اسد اللہ خاں صاحب  
 غالب کی میت اٹھائی کہ جس کو دیکھ کر دشمنوں کے کلیجے میں رشک کی آگ بھڑک اٹھی۔  
 نشہ شاداب رنگ سازِ مست طرب      شیشہ سے سرو سبز جو ببارِ نغمہ ہے  
 فرماتے ہیں۔ نئے رنگ سے شاداب ہو گئے ہیں اور سازِ نشہ طرب کے سرشار نظر آتے ہیں یعنی  
 شراب نے غم میں اور نغمہ نے شراب میں اس درجہ سرایت کر لی ہے کہ مینائے شراب سرو جو ببارِ نغمہ  
 بن گیا ہے۔

ہنشینِ مست کہ کہہ کر نہ برجم عیش و      واں تو میرے مالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے ہنشین تو مجھے مالہ کرنے سے کیوں روکتا ہے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اسکی صحبت عیش  
 کو میرا مالہ درہم برہم کر دینا نہیں ایسا نہیں ہے میرا مالہ تو اس کی محفل میں پہچکر نغمہ کا کام دیتا ہے۔ مطلب  
 یہ ہے کہ وہ میرے مالہ کو سن کر اور خوش ہوتا ہے۔ میری فریاد سے اسکا عیش کیوں شخص ہوگا۔ غزل  
 عرضِ ناز شوخی و مذاں برائے خند ہے      دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خند ہے  
 فرماتے ہیں۔ دانتوں کو اپنی شوخی و خوبی پر حقد راز ہے اس کا اظہار کرنا صرت ہنسی کے واسطے  
 ہوا کرتا ہے یعنی ہنسنے کے وقت دانت نظر آ جاتے ہیں۔ احباب کی جمعیت اتفاق کا دعویٰ کرنا اور  
 اس پر بھروسہ کرنا ہنسی کے قابل بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بڑھا پے میں دانت ایک دوسرے  
 سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دوستوں میں بھی جدائی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل      یکجاں زانو تا مل در فحائے خندہ  
 فرماتے ہیں۔ غنچہ کھل جانے کے بعد معدوم ہو گیا ہے یعنی گل بن گیا اور گل شکر اس سے چھپا

جتلا ہو گیا۔ کہ دیکھتے گل بن جائیگا انجام کیا ہوتا ہے لیکن اس فکر و تامل کی مقدار مہلت زانو بدلتے ننگ کی مدت ہے۔ یعنی ننگ اور سوچ کے وقت انسان سر بڑا نو ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں تھک جانے کے بعد زانو بدلتا ہے۔ یا سر کو زانو پر سے اٹھا لیتا ہے۔ گویا اتنی سی دیر میں پھول کو اپنا انجام نظر آ جاتا ہے اور وہ کھلا جاتا ہے یا جھڑ جاتا ہے۔

**کلفت افسردگی کو عیش بیتابی حرام**      **ورنہ دندان و دل افشردن بخندہ**  
 فرماتے ہیں۔ افسردگی دل کے وقت بیتاب بے صبر ہو جانا حرام ہے ورنہ بیتاب ہو کر دل کو دانتوں کے چباؤ آتا۔ افسردگی اور انقباض کو فوراً مٹا سکتا ہے یعنی جب دل کو زخمی کر دیا تو زخم خندہ اس سے حاصل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ افسردگی خاطر ایسی مصیبت ہے کہ اس کے مقابلہ میں بیتابی و بے صبری گویا عیش کا حکم رکھتی ہے۔

**سوزش باطن کے ہیں احباب شکر و نریاں**      **دل محیط گریہ لب آشنائے خندہ**  
 فرماتے ہیں۔ ہمارے احباب ہماری سوزش باطن یعنی خنوع و خشوع کے ننگ میں ورنہ ہر دل در و سوز سے بھرا ہوا ہے، اور ہمارے لب آشنائے خندہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر میں رندانہ حالت رکھتے ہیں۔ اور باطن میں صاحب وجہ و حال ہیں

**حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ**      **آئینہ زانوئے فکر اختر اع جلوہ**      غزل  
 فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ حسن بے نیاز اور بے پروا ہے لیکن پھر بھی اسکو ظاہری آرائش اور جلوہ گری کی خواہش و آرزو ہوتی ہے اور آئینہ اس کے واسطے زانوئے فکر کا کام دیتا ہے۔ یعنی آرائش حسن میں نئے نئے ایجاد کرنے کی فکر آئینہ ہی دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔ ننگ کے وقت سر بڑا نو ہو جانا عادت میں داخل ہو گیا ہے۔

**تا کجا اسکا گئی رنگ تماشا با حسن**      **چشم و اگر ویدہ آغوش و دواع جلوہ**  
 فارسی میں ننگ یا حقن اور رنگ شکستن رنگ بدھنے کے معنی پر استعمال ہوتا ہے اور یہاں تماشا سے مراد تماشا کے عالم ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے آغوی تو کب تک رنگ تماشا کو بدلتی رہیگی

اور کس وقت تک تماشاے عالم کی موجودہ کیفیت میں مشغول و محو رہے گی۔ کھلی ہوئی سبکدوشی  
چشم تماشا کی جلوہ کے رخصت کرنے کے لئے گویا آغوش و دایع ہے۔ یعنی عالم بے ثبات پر چشم  
تماشا و اگر ناگوار اس کے رخصت کرنے کے لئے آغوش کشانی ہے۔

جب تک ہاں زخم نہ پیدا کرے کوئی مشکل کہ تجھ سے راہ سخن واکرے کوئی غزل  
ہموں کی اصطلاح میں عداوت و مسافرت (یعنی عہد و معبود کے درمیان گفتگو ہوئی دو  
مرتبہ ہیں جو کالمین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہ حقی کے ساتھ اس معمولی لب و لہجہ  
سے بات چیت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے دہان زخم پیدا کرنا چاہئے۔ یعنی جب تک دل تیغ  
عشق سے مجروح نہ ہو۔ یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

عالم غبار و حشت مجنوں ہے سرسبز کبتک خیال طرہ یسی کرے کوئی  
فریستے میں ہستی عالم ایک نمائش مراب ہے۔ کبتک دھوکے میں پڑ کر اسکو موج دریا سمجھتے رہینگے  
افسردگی نہیں طرب افزائے اتفاقات ہاں درد بکے دل میں گر جا کرے کوئی

فراتے ہیں۔ افسردہ خاطر کی ایسی چیز نہیں ہے جسکو دیکھ کر معشوق اپنے عاشق پر نظر اتفاقات  
ڈال کر خوشی پیدا کرے۔ البتہ عاشق کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ سراپا درد بن جائے۔ اسوقت معشوق اتفاق  
ہو سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ عاشق کی افسردہ خاطر دیکھ کر معشوق یہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص بالہوس ہے جو  
عشق کی سختی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اس خیال سے وہ بھی بے پروا ہی اور کم توجہی ظاہر کرتا ہے ہاں  
سراپا درد بن کر معشوق کے سامنے اگر عاشق پیش ہو تو معشوق اسکو نظر اتفاقات سے دیکھے۔

روئے سے اے تدیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدہ دل واکرے کوئی  
فراتے ہیں۔ اے تدیم مجھ کو دل کھول کے رونے سے نہ روک اور برا بھلا نہ کہہ۔ انصاف  
شرط ہے کبھی تو دل کی گرہ کھلنی چاہئے۔

چاک جگر سے جب پریش واپوئی کیا فائدہ کہ نیب کو رسوا کرے کوئی  
فراتے ہیں عشق میں ہم نے اپنے جگر کو اس لئے چاک کیا تھا کہ وہ ہمارا حال دیکھ کر ہر حال کی

پیشتر فرماتے۔ یہ بات نہ ہوئی۔ اب گریبان بھاڑ کر اپنے گورسوا اور بدنام کرنے سے کیا فائدہ ہے۔  
 تخت جگر سے ہے رگ بر خار شاخ گل تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں صحرا نوردی کے عالم میں میرے جگر کے ٹکڑے جو آنسوؤں میں میری آنکھوں سے  
 ٹپکے اور ان سے جنگل کا ایک ایک کاشا شاخ گل بن گیا۔ اب صحرا کی مہار میں اور کوئی بات باقی رہی۔  
 جو کوئی باغبان بن کر جنگل کی آرائشی بڑھاتا رہے۔

ناکامی نگاہ ہے برق نظر سارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں طود پر جس صاعقہ نے گر کر نگاہ میں خیرگی پیدا کر دی تھی۔ وہ تیرا جلوہ نہ تھا۔ بلکہ وہی  
 ناکامی نگاہ برق بن کر طور پر گر گئی تھی۔ تو اور تیرا جلوہ ایسا نہیں ہے کہ کسی شاق جمال کے دیکھنے  
 میں آسکے مطلب یہ ہے کہ نہ موسیٰ نے تیرا جلوہ دیکھا تھا نہ اور کوئی تجھ کو دیکھ سکتا ہے۔

ہر سنگ و خشت ہے صدق گوہر شکست نقصان نہیں جنوں کا جو سودا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں۔ لڑکے جو ڈھیلے اور پتھر سر پر مارتے ہیں۔ وہ گویا ایک صدف ہے جس کا ہوتی زخم سر  
 کھجا جاتا ہے۔ اس لئے جنون کا سودا اپنے سر لینے میں کسی قسم کا نقصان واقع نہیں ہوتا۔  
 سر پر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر فرصت کہاں کہ تیری تماشا کرے کوئی  
 یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گزر گئی۔ پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی ہے۔  
 (از یادگار غالب)

ہے وحشت طبیعت ایجاد یا س خیز یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں یعنی آفرین اور خلقاتی مضامین اور ایجاد دہ رت بیان اور اختراع نہش الفاظ  
 کچھ ایسا وحشی فن ہے جس سے ہمیشہ یا س پیدا ہوتی ہے بائیں ہر سب لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ گویا  
 یہ درد ایسا نہیں ہے کہ اسکو کوئی پیدا نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعری ایک بہت دشوار کام ہے  
 لیکن اس میں مزاجی ایسا ہے کہ ہر شخص اس کی طرف رغبت رکھتا ہے۔

بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹے کا شغل جب ہاتھ لوٹ جائیں تو پھر کیا کر کوئی



فرماتے ہیں جنہوں کے لئے ایک نہ ایک شغل لازمی اور ضروری ہے جب تک جسم پر لباس نہ  
 گریبان چاک کرے رہے۔ جب اتنا راجد ہو گئے سر مٹنے کا شغل مل گیا پیکار بیٹھے بیٹھے طبیعت  
 گھبرا گئی۔ دامن و گریبان کی دھجیاں اڑھکیں شغل کے لئے سر پٹنا شروع کر دیا۔ اب دیکھنے  
 کی یہ بات ہے کہ اگر ہاتھ بھی ٹوٹ جائیں تو کوئی کیا کرے۔

حسن فروغ شمع سخن دُور ہے اسد پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں پہلے شمع کی طرح دل گداختہ کوئی پیدا کر لے تو اس کے بعد فروغ شعلہ سخن  
 کی مٹا اور آرزو کر لے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے زمانہ کا سچا ہے تو میری بلا سے ہوا کرے۔ میں توجہ  
 اس کا تالی ہوں کہ میرے درد محبت کی کوئی دوا کرے۔

شرع وائین پر مدار سی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں۔ ہم نے یہ مانا کہ آج کل زمانہ میں شرع کی پابندی بھی ہے اور قانون گورنمنٹ  
 بھی جاری ہے جس کے ذریعہ سے قاتل کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ مگر ایسے قاتل کا کوئی کیا  
 کر سکتا ہے جو بغیر تلوار کے عاشق کو قتل کر دیتا ہے۔ یعنی تیغ نگاہ یا تیر نظر سے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر دل میں ایسے کے جا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں۔ ایسے معشوق کے دل میں جگہ پیدا نہیں کی جاسکتی جسکی بے انسانی کی چال  
 کڑی کمان کے تیر سے مشابہت رکھتی ہے۔ ہنر مند اولیٰ مقام و کمال محاورہ ہے۔ کمان جب قدر  
 سخت ہوگی اتنا ہی تیر تیز پرواز ہوگا۔

بات پرواں زبان کشتی ہے وہ کہیں اور بنا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں۔ اُن کے خلاف اگر کچھ کہا جاتا ہے تو اس جرم میں وہ زبان کاٹ لیتے ہیں  
 اس لئے اُن کی بات خواہ درست ہو یا نادرست خاموشی کے ساتھ سنی پڑتی ہے کسی کی فتنہ

نہیں ہے کہ اُن سے یہ کہہ سکے کہ تم یہ بات غلط کہتے ہو۔ جیشل شعر لکھا کرے۔  
 بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں۔ جوش کے عالم میں ہٹے بڑے راز بیان کر رہا ہوں۔ خدا کرے میرے  
 کہنے کو کوئی سمجھے نہیں جس طرح مجذوب اپنی بڑی بہت سی کام کی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔  
 اور عام لوگ ان باتوں سے کچھ مطلب نہیں نکال سکتے۔

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی نہ کہو گر بُرا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں اخلاق کی یہ خوبی ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو بُرا بھلا کہے تو اس کے کہنے پر  
 توجہ نہ کرو اور اگر کوئی بُرا کام کرے تو تم اس کو مطعون و خلاق نہ کرو۔

روک لو گر غلط ملے کوئی بخشو گر خطا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص غلط بات پر چل رہا ہو تو تم اسے فوراً روک دو اور اس کی غلطی  
 اس کے ذہن نشین کر دو۔ اور اگر کوئی شخص تمہاری کچھ خطا کرے تو تم فوراً اسے بخش دو۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند کس کی حاجت روا کرے کوئی  
 فرماتے ہیں زمانہ میں ہر شخص حاجت مند ہے۔ اگر وقت پہ کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے تو اس سے  
 گلہ مند نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ دوسرا بھی ہماری طرح سے کوئی ضرورت رکھتا ہوگا۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنا کرے کوئی  
 اس شعر میں خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے حضرت خضر سکندر کو چہرہ آب حیات  
 پرے گئے تھے سکندر نے یہ دیکھ کر چہرہ کے گرد بہت سے آدمی چلنے پھرنے لگے بیٹھنے سے منع و  
 مصلحت گوشت کی طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے آب حیات نہ پیا۔ فرماتے ہیں حضرت خضر نے سکندر  
 کی کیا مدد کی باوجود رہنمائی کے سکندر آب حیات سے محروم واپس آگیا۔ اور خضر سے ہی عرصے  
 بعد دنیا سے چل بسا۔ اب کوئی کسی کو کیا رہنا بتائے۔

جب تو قہر ہی مٹ گئی غالب کیوں کسی کا کھل کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ توقع کی صورت میں گلہ شکوہ بھی اسے غالب زیبا ہے۔ ایسی کی حالت میں کہیں کسی کا گلہ کیا جائے۔

غزل

بہت ہی غم گیتی شراب کم کیا ہے غلام ساقی کو شرہوں میں جو غم کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مانا کہ دنیا میں غم و رنج بہت ہیں مگر غم کے مقابلہ میں شراب بھی  
مقدار میں کم نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم دنیا بھلانے والی چیز شراب ہے اور میں چونکہ ساقی  
کوثر کا غلام ہوں اس لئے مجھ کو شراب کے حاصل کرنے کی فکر نہیں ہے۔ ابدال آباد تک برابر ملے  
جائے گی۔ یہاں بھی پیار ہا اور وہاں بھی پیار ہو گا۔

تمہاری طرزِ رفتن جانتے ہیں ہم کیا رقیب ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے  
فرماتے ہیں تمہاری عادت سے ہم خوب آگاہ ہیں کہ تم رشک کی آگ عاشق کے دل میں  
بھڑکا دیا کرتے ہو۔ رقیب پر تمہارا لطف کرنا ہمارے لئے ستم کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی یہ لطف جہنم  
رقیب کے حق میں برتتے ہو وہ ہمارے واسطے ستم بن جاتا ہے۔

کئے تو شب کہیں کئے تو شب کہلا گئے کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ تمہاری زلفِ خم بہ خم کی یہ دونوں صفیں ہیں۔ یعنی درازی میں وہ شبِ فرقت  
کے برابر ہے۔ اور اس کی محبت ایسی زہریلی ہے کہ اس میں سانپ کے کاٹے کا اثر ہے۔ اب کون بتا سکتا  
ہے کہ وہ درحقیقت ہے کیا چیز۔

لکھا کرے کوئی احکامِ طالع مولو کس خبر ہے کہ وان جنیش قلم کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ یہ جواہرِ تخمِ بچہ کی پیدائش کے وقت اس کا زائچہ بنا کر احکام لکھتے ہیں۔ یہ  
بے فائدہ ہیں کسی کو معلوم نہیں کہ کاتبِ قسمت نے اس کی تقدیر میں کیا لکھ دیا ہے۔

زہرِ و نشر کا قائل شکیں و ملت کا خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ وہ کارِ بدکیشِ شرطِ اسلام کے موافق نہ قیامت کے آئے کا قائل ہے اور نہ کسی  
ذہب و ملت کا ماتھے والا ہے پھر خدا کے واسطے ایسے شخص کی قسم کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔

وہ داد و دید گرا تا یہ شرط ہے ہمد  
 و گریہ مہر سلیمان و جام و جم کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ اسے ہمد انش و شش الہی اور اس تماشائے عالم کا دیکھنا عجائبات کی قدر و قیمت کا ہاش  
 ہو سکتا ہے و گرنہ بے دیکھے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مہر سلیمان و جام و جم کیا چیز ہیں۔  
 سخن میں خاتمہ غالب کی آتش افشا  
 یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں ہم کیا  
 فرماتے ہیں فن سخن میں خاتمہ غالب کی جادو و نگاری کے ہم قائل تو ضرور ہیں لیکن اب اس میں  
 بڑھے ہو جانے کی وجہ سے کچھ دم نہیں رہا ہے۔

غزل  
 باغ پاکر خفائی یہ ڈراتا ہے مجھے  
 سایہ شاخ گل افنی نظر آتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ باغ نے جو مجھ کو خفائی مزاج پایا ہے تو وہ اب مجھے ڈراتا رہا ہے۔ گویا سایہ شاخ  
 گل افنی بن کر مجھ کو نظر آتا ہے۔ خفائی آدمی اکثر اپنے وہم کی وجہ سے ڈر جایا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے  
 کہ باغ میں پھولوں کی تردد و بازی و لکشی کا اثر رکھتی ہے اور انجام محبت جاں گس ہو کر رہا ہے۔  
 جو ہر تیغ بہ سر چشمنہ دیگر معلوم  
 ہوں میں سبزہ کہ ہر آب گلانا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ جو شیر شیر جس طرح زہر آب چھڑکنے سے ابھرتا رہا ہے اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں جس کی  
 نشہ و مہم و فتنہ سے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری سرشت میں غم و فتنہ ہے۔

مدعا محو تماشائے شکستہ دل ہے  
 آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں میرے مدعا کی دشواریوں اور غمتوں نے میرے دل کو توڑ دیا ہے اور میرا مدعا  
 دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا تماشائی بن گیا ہے۔ دل جب ثابت تھا تو آئینہ تھا۔ آئینہ ٹوٹ کر میت  
 سے آئینے پیدا ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے میرا پہلو آئینہ خانہ بن گیا ہے۔

نالہ سرایہ یک عالم و عالم کف خاک  
 آسمان بیفہ قمری نظر آتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ سارے عالم کا سرایہ صرف نالہ ہے اور خود عالم ایک مشت خاک ہے اور آسمان  
 بیفہ قمری یعنی حاصل دنیا نالہ کشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ گویا دنیا دار محض ہے اور آسمان نالہ کا پیدا کرتا  
 جب قدر نکلیں اور پھٹیں دنیا میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان سب کو آسمان پیدا کرتا ہے۔



زندگی میں وہ محفل سے اٹھاتے تھے دیکھو اب سرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں زندگی میں تو وہ مجھ کو اپنی محفل سے اٹھا دیا کرتے تھے۔ اب سر جانے کے بعد مجھ کو کھینا  
 ہے کہ کون اٹھاتا ہے۔ یہاں اٹھانے کے نفاذ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں۔ ایک یہ کہ دیکھو  
 اب اپنی محفل سے کیونکر میں اٹھایا جاسکتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

تعلق

روندی ہوئی ہے کو کبہ شہر یار کی اترائے کیوں خاک سرور گزار کی  
 کو کبہ۔ خادمان شاہی جو اردلی میں رہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

جب اسکے دیکھنے کیلئے آئیں بادشاہ لوگوں میں کیوں نمود نہ ہوا لالہ زار کی  
 بہار کے موسم میں سیرالہ زار کے واسطے اکثر بادشاہ تشریف لایا کرتے تھے۔

بھوکے نہیں ہیں سیرگتال کے چم لے کیونکر نہ کھائے کہ ہوا ہے بہار کی  
 فرماتے ہیں۔ ہم کچھ سیرگتال کے بھوکے نہیں ہیں۔ یعنی لذات دنیا کی خواہش نہیں رکھتے۔ لیکن  
 بہار کا موسم بھی ایک نعمت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہے اس لئے اسکی سیر ضرور کرنی چاہئے۔

غزل

ہزاروں خواہشیں اسی کہ ہر خواہش دم نکلے بہت نکلے مرے کاربان لیکن بھر بھی کم نکلے  
 خواہش بہم نکلنا اس کے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنی چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلنا  
 جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو۔ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرع میں مقصائے مقام یہ نفاذ

کہ دل میں باقی ہیں مقدر ماننے جا نہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں (از یادگار غالب)  
 دے کیوں میرا قاتل کیا رہ گیا اسکی گردن وہ خون چم تر سے عمر بھر یوں بہم نکلے

فرماتے ہیں میرا قاتل مجھے قتل کر کے ڈرتا کیوں ہے میرا خون میرے جسم میں تو رہا ہی نہیں آئندہ  
 کے ساتھ آنکھوں سے ہمیشہ نکلتا رہا ہے۔ قاتل کی گردن پر کیا رو سکتا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سننے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر تم سے کوچے بہم نکلے  
 دوسرے مصرع میں بہت کے نفاذ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی  
 کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔ بہت خوب شعر لکھا ہے۔

بھرم کھنکھائی کا عالم یہ قیامت کی درازی کا  
 فرماتے ہیں۔ اسے ظالم لوگ تجھ کو سرفقامت اسی وقت تک سمجھے ہوئے ہیں جب تک  
 تیری زلفیں خم دار ہیں۔ اگر ان کے گھونگر کھول دے جائینگے تو تیرا قد چھوٹا نظر آنے لگے گا۔  
 مگر لکھوائے کوئی اسکو خطا تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے کانچ پر رکھ کر قلم نکلے  
 فرماتے ہیں۔ ہمارا معشوق عالم آشتاب۔ اکثر لوگوں سے اور اس سے خط و کتابت ہوتی ہے  
 صفائیں خطوط معلوم کرنے کی تدبیر اس بہتہ اور کوئی نہیں ہے کہ ہم نامہ نویسی کریں اور ہر شخص کے  
 مدعا دلی سے خبردار ہوتے ہیں۔

ہوئی اس قدر میں منسوب مجھ سے بادشاہی  
 پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے  
 فرماتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں شراب خوری کے واسطے حمید اور اس کا جام غموم تھا جو آج تک  
 ضرب المثل چلا آتا ہے اس زمانہ میں حریف جم میں ہوں اب میرزا اسے جام جم کی شہرت ہو گی۔  
 ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی دہم سے کبھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے  
 فرماتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کو اپنی کار براری کا دریغ سمجھتے تھے۔ جب ان کو ٹٹول کر دیکھا  
 تو وہ لوگ ہم سے بھی زیادہ ظلم فلک کے شاکی نظر آئے۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا  
 اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فریہ دم نکلے  
 محبت میں مرنے جیسے کا اختیار باقی نہیں رہا ہے جس کو دیکھ کر روح تازہ ہوتی ہے۔ اسی  
 کافر پر ہمارا دم بھی نکلتا ہے۔ حاصل زمین شعر کھتا ہے

کہاں سینا نہ کا اور وارہ غالب اور کہاں غلط  
 یہ مقطع میرزا صاحب کے نشروں میں ہا ایک نشتر ہے۔ میان میں ایک عجیب شامی برتی ہے۔ فرماتے  
 ہیں۔ اس بات سے تو ہم کو بھی تعجب کہ سینا نہ کے دروازہ سے قلاب و اعظ کو کیا تعلق۔ گزرتی  
 بات ضرور ہے۔ کل کے روز ہم سینا نہ سے باہر نکلے تو ہم نے یہ دیکھا کہ واعظ بھی ادھر سے گزرا ہے  
 لطف اس شعر میں یہ ہے کہ صاف صاف یہ نہیں بتایا گیا کہ واعظ کہاں جاتا تھا۔ آیا سینا نہ میں

ایمانہ کے سامنے سے گذر کر کسی اور طرف۔

کوہ کے ہول بار خاطر گر صدا ہو جائے بے تکلف اسے شرارت جتہ کیا ہو جائے  
 فرماتے ہیں۔ اگر ہم آواز کی طرح سبک اور لطیف ہو کر ترہیتے ہیں تو بھی کوہ کے بار خاطر  
 ہیں یعنی پہاڑ آواز کو رو کر دیتا ہے جس سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ ہم پہاڑ کے بار خاطر  
 اس نے ہم کو قبول نہ کیا اور واپس کر دیا۔ اسے شرارت جتہ اگر ہم تیری طرح خود رفتہ و بے تکلف  
 ہو کر ترہیتے تو خبر نہیں ہمارا کیا حشر ہوتا۔ مطلب یہ ہے۔ جہان شک ممکن ہو حالت اضطراری کو  
 ضبط کرنا چاہئے۔ شرارت پھر سے نکلتا ہے۔ اور صدا پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔

بیضہ آسانک بال اوپر ہے کنج نفس از سر نو زندگی ہو کر رہا ہو جائے  
 فرماتے ہیں جس طرح بیضہ سے پرند پیدا ہو کہ زندگی کا آغاز کرتا ہے اسی طرح اس  
 کنج نفس یعنی بیضہ فلک سے رہا ہو جانے کے بعد نئی زندگی شروع ہوگی مطلب یہ ہے کہ  
 مرجانے کے بعد عالم ارواح میں از سر نو زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے مہج شراب یک مژہ خوابناک ہے  
 فرماتے ہیں۔ ساقی کی غفلت شعاریوں کی ادائیں مستی کو بھی ہلاک کر رہی ہیں اور مہج  
 شراب اس ذوق و شوق میں بخود و مد ہوش ہو کر ساعز کی مژہ خواب آلود بن گئی ہے۔

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو جیب خیال بھی ترسے ہاتھوں کے چاک ہے  
 فرماتے ہیں۔ آرزو دل نے زخم تیغ ناز کی صورت پیدا کر لی ہے جیب خیال یعنی دل تیرے  
 ہاتھوں سے چاک ہے۔ اور جیب دل چاک ہو گیا تو اس میں آرزو کا قیام ناممکن ہے۔

جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں استر مہر جاری آنکھ میں یکمشت خاک ہے  
 فرماتے ہیں۔ تماشائے مہر سے اس قدر جنون میں جوش پیدا ہو گیا ہے کہ اب کچھ نظر  
 نہیں آتا۔ گویا مہر جاری آنکھ کے واسطے ایک خاک کی ٹپکی بن گیا ہے یعنی جس آنکھ میں

دک کے ذرے پڑ جائیں اس کو کیا دکھائی دے سکتا ہے۔



لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی قیامت کشتہ لعل تال کا خواب انگلیں ہے

لعل تال لب لعل تال فراتے ہیں کشتہ لب عیسیٰ کی نیند کس قیامت کی نیند ہے کہ حضرت عیسیٰ اعمیاز اب بھی اس کو زندہ نہیں کر سکتا جب تم کہتے ہیں تو اس کی نیند اود گہری ہو جاتی ہے۔

غزل آبدیلا ب طوفان صدائے آبے نقش پا جو کان میں گھٹا ہے انگلی جادہ کے

فراتے ہیں۔ دنیا میں ہر شے کو فنا کا کھٹکا لگا ہوا ہے چنانچہ نقش پا بھی جادہ راہ کی

انگلیاں کانوں میں دئے ہوئے پڑا ہے اس کو بھی یہ خوف پیدا ہو گیا ہے کہ ایسا نہ ہو سیلا

آجائے۔ آبتاروں کی آواز سننی نہیں چاہتا اس لئے اس نے کانوں میں انگلیاں دے لی

زں۔ اور سمجھتا ہے کہ فصل گل میں بھیڑیں کر مجھ کو فنا کر دیگا۔

بزم مے و خستہ ہے کسلی چشم مست کا شیشے میں ٹھن پری پہناں موج بادہ کے

فراتے ہیں بزم مے کو کس معشوق کی چشم مست نے وحشت کدہ بنا دیا ہے کہ موج شراب

نبض پری پیکر شیشے میں پوشیدہ ہو گئی ہے گویا پری انسان کے شیشے میں بند ہو گئی ہے

ہوں میں بھی تماشا کی نیزنگ تماشا مطلب نہیں کہ اس کے مطلب بھی برکے

فراتے ہیں میں تو صرف نیزنگ تماشا کا تماشا کی ہوں یعنی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تماشا کیا

کیا رنگ بدلتی ہے اور دل کو کس قسم کی لذت بخشی ہے میری مراد یہ نہیں ہے کہ میری مراد ہی پوری ہو

سیاہی جیسے گرجائے دم کا تیر کا غنچہ پر مری قسمت میں اس تصویر شہا بچراں کی

فراتے ہیں جس طرح ٹھکنے کے وقت سیاہی گر کر حرفوں کو چھپا لیتی ہے اسی طرح میرے نوشتہ

قسمت میں شہائے بچراں کی تصویر کھینچ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ جدائی کی راتوں نے میرے

نوشتہ قسمت کو ایسا چھپا لیا ہے کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ امدہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے

غزل ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک اصفاں ہے غموشی ایشہ صد فیتاں حسن بدن داں ہے

فراتے ہیں۔ باوجود ہجوم نالہ کے حیرت لے عرض فقاں سے عاجز کر دیا ہے۔ گویا خاموشی نے

نیتان کو جس میں سیکڑوں بانسریاں موجود ہیں خس بدن داں کر رکھا ہے مطلب یہ ہے کہ باوجود قوت



گویائی کے رازداری کے لحاظ سے لب سی دے ہیں۔

نکلف بر طرب جانسان لطف بخوایں نگاہ سحباب از تیغ تیر عریاں ہے

فرماتے ہیں۔ مشوتوں کا لطف ستم سے بھی زیادہ جانسان ہے گویا نگاہ ناز ایک شیر آبدار

ہے اور جب وہ بے حجاب ہو گئی تو تیغ عریاں بن گئی۔ اب اس کو قتل کرنے میں کیا حجاب باقی رہا۔

ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی کہ صبح عید محکو بدتر از چاک گریباں ہے

فرماتے ہیں۔ کثرت غم سے اس قدر کیفیت شادی مٹ گئی ہے کہ میری نگاہ میں صبح

عید چاک گریباں سے بھی زیادہ بد بین و نامہارک ہے۔

دل وین نقد لاساقی سے گریو کیا چاہا کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گداں ہے

دست گداں اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو نقد قیمت پر بچی ہو۔ فرماتے ہیں۔ اگر ساقی میخاد عشق سے

شراب محبت کی خریداری منظور ہے۔ تو دل وین کو فوراً دے کر اس سودا پہلے اس بازار میں

یعنی بازار عشق میں ساغر محبت کی قیمت پہلے وصول کر لی جاتی ہے۔

غم آغوش بلا میں پرورش کر لے عاشق کو چرخ روشن اپنا قندرم مصر کامر جاں ہے

فرماتے ہیں غم عشق آغوش بلا میں عاشق کو پرورش کیا کر لے۔ قاعدہ ہے۔ ہوا سے چراغ

مغل ہو جایا کرتا ہے لیکن طولان آب دریا میں مرجان کا چراغ نہیں بجھا کر لے۔ اسی طرح عاشق کا چراغ

بھی مصر کے طوفان میں روشن رہا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کا مصیبت اور تکلیف کچھ نہیں بگڑتا۔

خوشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے ترے سر مرہ سا نکلتی ہے

قطعہ

سر مرہ کھانے سے آواز بیٹھ جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں تیری خاموشیوں میں بھی ایک ادائے

الہام رپائی جاتی ہے۔ گویا تیرے دل کے ارادہ سے جو نگاہ نکلتی ہے وہ سر مرہ سا نکلتی ہے یعنی آواز

بے صورت ہوتی ہے۔ گویا صاع

خوشی معنی دار دکھ در گستن سے آید

نثار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

فرماتے ہیں۔ اگر صبا خلوت غنچہ میں بھولی بھکی جاتی ہے تو غنچہ اُسکو آغوش میں لے کر ایسا بھیجتا ہے کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو کر شبنم بن جاتی ہے۔

نہ پوچھ سینہ عاشق سے آب تیغ نگاہ کہ زخم روزن در سے ہوا نکلتی ہے

فرماتے ہیں دل عاشق سے تیغ نگاہ کی آبداری کا حال نہ پوچھو۔ یہ دیکھو کہ جس روزن در سے وہ جھانکتے ہیں اس روزن کو تیغ نگاہ نے ایسا زخم بنا دیا ہے جس میں سے ہوا نکلنے لگی ہے۔  
ہو جس زخم میں سے نکلتی ہے۔ وہ زخم بہت مہلک سمجھا جاتا ہے۔

غزل

جس جالیم شانہ کش زلف یار ہے نافہ دماغ آہوئے دشت تیار ہے

فرماتے ہیں جس سرزمین پر نیم زلف یار کی خوشبو پھیلا دیتی ہے وہاں آہوئے دشت تیار کا دماغ بھی شک نافہ بن جاتا ہے۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کے اے خدا آئینہ فرسش جہت انتظار ہے

فرماتے ہیں اے خدا یہ تو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ حیرت کس کے جلوہ کا پتہ لگانا چاہتی ہے جو اس فرسش جہت انتظار کو آئینہ مذکور دیا ہے اور یہ چاہتی ہے کہ کہیں تو اس کا عکس جلوہ نظر آجائے۔

ہے ذرہ ذرہ تنگی جال سے غبار شوق گردام یہ ہے وسعت صحرا شکار ہے

فرماتے ہیں جبکہ کی تنگی کی وجہ سے غبار شوق ذرہ ذرہ ہو کر پھیل گیا ہے اور بہت سے ذرے پریشان ہو کر دام بن گئے ہیں۔ فرماتے صحرا جن کا شکار ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ غبار شوق صحرا پر جال کی طرح پھیل گیا ہے۔

دل مدعی و دیدہ ہست مدعا علیہ نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے

فرماتے ہیں۔ دل نے آنکھوں پر یہ دھوی دائرہ کر دیا ہے کہ ان کی نظارہ بازیوں کے فتور سے میں مبتلا بنے پہنچ و بلا ہو گیا ہوں میری دامتسی شہ گاہ سرکار عشق سے ہونی لازم و واجب ہے۔

چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پر آب اے عنذلیب وقت و داع بہار ہے

اس شعر میں میرزا صاحب نے ایران کی رسم کو بیان کیا ہے۔ وہاں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص

سفر کرتا ہے تو سفر کی پشت پر آئینہ رکھ کر اس آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ محنت عاقبت سے عزت و ابرو کے ساتھ واپس آنا نصیب ہو۔ فرماتے ہیں شہنشاہ آئینہ برگ گل پر پانی چھڑک رہی ہے۔ اے میلِ دواغ بیمار کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔

تیج آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے یہ یاں انتظار ہے  
 فرماتے ہیں ہم کو اپنی بات کا بنانا منظور ہے۔ یعنی معشوق سے جو آئے کلام وعدہ لیا ہے۔ وہ اس امر کا تقاضی ہے کہ وہ وعدہ فراموش اپنے اقرار پر آئے نہ آئے مگر ہم کو اس کے انتظار میں رات بھر جاگتے رہنا لازمی ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

بے پردہ سچے وادی مجنوں گنہ گار ہر ذرہ کی نقاب میں دن بھر آواز  
 فرماتے ہیں۔ وادی مجنوں کا ذرہ ذرہ دل بیتاب کا حکم رکھتا ہے۔ ایسے مقام پر مجھ کو پہنچے سفر کرنا چاہئے۔

اے غمزدگ کفِ حسن بہر آشیاں طوفان آمد آمد فصل بہار ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے میل اگر گل میں تجھ کو باغبان کی نظر سے چھپ کر لطیف بیمار ٹھکانا منظور ہے تو ابھی سے دو چار تنکے لے کر آشیانہ بنا رکھ ورنہ فصل بہار کے جوش و خروش میں کھسکے ہوئے گل کو کھترے گی۔ بہار آ کر سارے باغ کو سبزہ زار بنا دے گی۔

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی اے بے دماغ آئینہ تمثالِ وار ہے  
 فرماتے ہیں۔ دل کو برباد مت کر اگر وہ معرفت الہی سے باخبر دار نہ ہو اتنا سہی سیر کا لطیف تو حائل ہو جائیگا اے بے دماغ آئینہ دل میں بتوں کی تصویریں تو نظر آرہی ہیں۔ اگر تجھ کو تو کہہ نہ بن سکا نہ سہی ممت خانہ میں بھی ایک کیفیت تو موجود ہے۔

غفلت کفیل عمر و اسد ضامنِ نشاط اے مرگنا کہاں تجھے کیا انتظار ہے  
 فرماتے ہیں غفلت نے تو عمر اسد کی کفالت پر مکر باندھ لی ہے اور اسد نے دائمی نشاط کی ضمانت کر لی یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمیشہ عیش و راحت میں زندگی بسر ہوگی۔ اس صورت میں کبھی انجام کا خیال

بھی نہیں مانتے پاتا۔ اسے ناگہانی موت تو کیوں نہیں آجاتی تجھے کس بات کا انتظار ہے۔ میرے خیال میں تو جو شخص غفلت میں عمر بسر کرے اور اپنی موت کو بھولتا رہے۔ انجام کی دُور اندیشی کے خیال کو اپنے پاس نہ بٹھکے دے۔ اس کو ناگہانی موت آجاتی چاہئے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں ہے  
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں ہے  
غزل  
فرماتے ہیں میں آئینہ کو تیرے رویہ کیوں نہ پیش کر دوں۔ کہ اس کو دیکھ کر تو حیران ہو جاؤ  
اور لوگوں کو تیری حیرانی تماشا بن جائے۔ ایسا حسین دوسرا کہاں سے پیدا کروں۔ کہ جس کو دیکھ کر لوگ تجھ سا کہیں۔

حسرت نے لار کھاتری بزمِ خیال میں  
گلدستہ نگاہ سویدا کہیں ہے

فرماتے ہیں حسرت نے میرے دل میں کہ وہ تیری بزمِ خیال ہے۔ ایک گلدستہ نگاہ لاکر رکھ دیا ہے جس کو سویدا کہتے ہیں (سویدا اس سیاہ داغ کو کہتے ہیں جو دل کے اوپر ہے) مطلب یہ ہے۔ گویا سویدا دل ایک گلدستہ ہے حسرت بھری نگاہوں کا۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں ایندا  
افسون انتظارِ مست کہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اسے خدا کس نے گوشِ محبت میں ایسا افسون انتظار پھونکا دیا ہے کہ جس کو متنا کہتے ہیں۔ تعجب اس بات پر مانتا ہے کہ محبت ہوتے دیر نہیں ہوتی متنا بھی پیدا ہو گئی۔

سر پہ بھوم در دغری سے ڈالے  
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحر کہیں ہے

فرماتے ہیں بیوطنی کی تکلیفوں نے مجھ کو ایسا دیوانہ کر دیا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے دیوانوں کی طرح اپنے سر پر خاک ڈالوں مگر وہ خاک ایک مٹھی سے زیادہ نہ ہو۔ مگر ایسی ہو کہ جس کو صحر کہیں۔

یعنی لوگ سمجھیں کہ اس نے سارے خنجر کی خاک اٹھا کر سر پر ڈال لی ہے۔

جسے چشمِ حشر دیدار سے ہناں  
شوقِ عشاںِ گسختہ دریا کہیں ہے

فرماتے ہیں۔ میری چشمِ حشر دیدار سے ہناں  
پوشیدہ ایسا آنسوؤں کا جوش بھرا ہوا  
ہے کہ جس کو بے سائلہ دریا کہہ سکتے ہیں۔



درکار ہے شگفتن گلہائے عیش کو صبح بہار پیہ سینا کہیں جسے  
 فرماتے ہیں۔ معمولی صبح بہار سے تو باغ کے پھول کھلا کرتے ہیں۔ ہم ایسی صبح بہار کے  
 طالب نہیں ہیں ہم کو تو ایسی صبح بہار کی ضرورت ہے جس سے گلشن عیش و نشاط کے پھول کھلیں  
 اور اس صبح بہار کو ہنسیہ مینا کہتے ہیں۔

غالبِ زمانہ مان جو واعظِ برا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے  
 فرماتے ہیں۔ اے غالب تجھ کو رند سمجھ کر اگر واعظِ برا کہتا ہے تو تو کیوں برا ماننا ہے۔ ایسا  
 آدمی تو دنیا بھر میں کوئی نہ ہو گا کہ جس کو سارا زمانہ اچھا کہے۔ زمانہ کا دستور یہی ہے کہ ہر آدمی  
 کسی کو اچھا کہتے ہیں تو ایک برا بھی کہتا ہے۔

غزل شبنم بگل لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغ دل بیدار و نظر گاہ حیا ہے

فرماتے ہیں۔ گل لالہ پر جو اس کے قطرے نظر آ رہے ہیں یہ بھی اندازِ ادا سے خالی نہیں  
 ہیں وہ گویا اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ دل میں داغ تو ہے لیکن درد و سوہنہ نہیں ہے بلکہ  
 اُن کی بونہیں ہرقی انفعال کا کام دے رہی ہیں گویا گل لالہ اس شرم سے پسینے پسینے ہو گیا ہے۔  
 دلِ سخن شدہ کشکشِ حسرتِ دیدار آئینہ بدستِ بت بدستِ حنا ہے

فرماتے ہیں۔ حسرتِ دیدار کی کشکش نے دل کو خون کر دیا تھا اب وہ گویا آئینہ بن کر بت  
 بدستِ حنا کے ہتے چڑھ گیا ہے گراں اس کے ہاتھوں میں بھی اس کے قائل کا اظہار کر رہا ہے۔ بدست  
 حنا سے مراد ایسا معشوق ہے جو مہندی رچالے کے شوق میں از خود رفتہ ہو گیا ہو۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہو شعلہ سے نہ جوی جی کس قدر افسردگی دل پہ چلا ہے  
 فرماتے ہیں۔ وہ بات شعلہ آتش سے بھی نہیں ہو سکتی جو ہوس شعلہ نے دل کے ساتھ کی ہے  
 یہاں شعلہ سے مراد شعلہ عشق ہے مطلب یہ ہے کہ جب دل میں شعلہ عشق اس حد تک بھڑک سکا  
 کہ دل جل کر خاک ہو جاتا تو دل کی ناکامی پر جی جل گیا۔

تمثالِ مہرِ سی ہے شوقِ کینہِ شوق آئینہ باندازِ گلِ آغوشِ کشا ہے

فراتے ہیں تیری تصویر میں بھی ایسی شوخی کوٹ کوٹ کر بھردی گئی ہے کہ اس پر جو آئینہ لگا یا گیا ہے وہ بھول کی طرح شوق جہ آشوبی میں آغوش کشا ہو گیا ہے۔

قمری کعب خاکستر و طیل قفس رنگ اسے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے  
فراتے ہیں۔ قمری جو ایک کعب خاکستر سے زیادہ ہستی نہیں رکھتی اور طیل جو ایک قفس رنگ کے  
سوا وقعت نہیں پاسکتی گران کے بولنے اور چپکنے سے عالم میں ایک دھوم مچ گئی ہے اور سب کے جان لیا  
ہے کہ قمری سر کی شیدا ہے اور طیل بھول کی عاشق۔ گویا جگر سوختہ یعنی عشق کا نشان ان کے ناموں  
سے ملا ہے۔ میرزا صاحب نے اس شعر میں لفظ (اے) کو (جذ) کی جگہ استعمال کیا ہے۔

خونے تری افسر کیا وحشت دل معشوقی و بے چوگی طرہ بلا ہے  
فراتے ہیں۔ رنگ و لٹ کے موقع پر تیری کم توہمی اور مفاض کی عادت نے جوش عشق کو کم کر دیا  
معشوق بن کر ایسا کم جو صلہ ہونا ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔

مجبوری دعوائے گرفتاری الفت دست بنگ آمد و پیمان وفا ہے  
فراتے ہیں عشق بے اختیار یار شے ہے یعنی ارادہ کے ساتھ پیدا نہیں کیا جاسکتا عشق پیدا ہو جانے  
کے بعد گرفتاری عشق کا دعویٰ کرنا ایک ایسی بات ہے جیسے کسی کا ہاتھ ایک بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو  
اور وہ یہ کہے کہ میں نے اس پتھر سے وفا کا عہد باندھا ہے۔ میں کبھی اپنا ہاتھ اس پتھر کے نیچے سے نہ کھینچوں گا  
حالانکہ پتھر کے نیچے سے ہاتھ کھینچ لینا امکان سے باہر ہے۔

معلوم ہوا حال شہیدان گذشتہ تیغ ستم آئینہ تصویر نما ہے  
فراتے ہیں تیرے تلوار کھینچ لینے اور قتل پر آمادہ ہو جانے سے ہم کو شہیدان گذشتہ کا رونا  
ہو گیا تیری تیغ ستم آئینہ تصویر نما ہے یعنی جس طرح بیکسی کے عالم میں توجہ کو قتل کرنا چاہتا ہوں  
ہوتا ہے کہ تو نے اسی طرح اور مظلوموں کے بھی غلے کاٹے ہوں گے۔

اے پر تو خورشید جہاں تاباں نہ رہی سایہ کی طرح ہم پر عجب وقت پڑا ہے  
یہ شعر میرزا صاحب کے شعروں کا ایک آبدار شعر ہے۔ خدا بچے حضرت ادا دی مولانا حالی

اس شعر کی شرح میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ بہتم بوجہ اور فی الواقع اس کی کچھ سہتی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لگاؤنگن ہو جائے تو یہ دھوکہ جاتا رہے اور ہم فانی آتش ہو جائیں۔ اس لئے کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کا نور ہوا۔

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی طرح یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں۔ اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہئے۔ (از یادگار غالب) بیگانگی خلق سے بیدار ہو غالب کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے فرماتے ہیں۔ اسے غالب کوگوں کی کم تو جی سے تو بیدل کیوں ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی تیرا معاون و مددگار نہیں ہے تو نہ ہو خدا تو ہے۔

غزل منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد رخ سے ظہور کی یہ شعر نعت میں ہے۔ فرماتے ہیں تجلی الہی کو تیری نورانی صورت ظاہر ہونا منظور تھا۔ گو یا تیرے قد و رخ کے حسن و دلکش سے ظہور کی قسمت کھل گئی۔

اک غنچہ نکال کفن میں کر ڈروں شاہیں پڑتی ہے اس کے تیرے شہیدانِ جہاد کی یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے۔ مگر یہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چپاں ہے (از یادگار غالب) میرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر یہ شعر بھی ہے۔

واغضانہ تم پیونہ کسی کو پلاسکو کیا بات ہے تمہاری شرابِ ظہور کی فرماتے ہیں۔ اسے داغظنہ تم خود پی سکتے ہو نہ اور کسی کو پلاسکتے ہو اور تعریف اس شہد کے ساتھ کرتے ہو تو معلوم ہوا تمہاری شرابِ ظہور صرف خیالی شراب ہے جس کے بیان سے اپنا دل خوش کر لیتے ہو۔ نئی قسم کی شوخی برتی ہے اور بہت ہی مزے کا شعر کہتا ہے۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا گویا ابھی سنی نہیں واتو صورت کی



فرماتے ہیں مجھ سے میرا قاتل حشر میں لڑتا ہے کہ تو بغیر میرے حکم کے کیوں زندہ ہو گیا۔ یعنی میں نے  
 بچہ کو قتل کیا تھا میں اٹھاتا تو اٹھتا اور سلامتی سے تغافل کا یہ حال ہے گویا ابھی تک صبر کی آواز بھی  
 نہیں سنی ہے۔

آدب پارسی ہے جو بیل چنمہ سنج اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیر کی  
 فرماتے ہیں بیل کی نغمہ سنجی بے نیسبیں ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بیمار اب آئے عیالی ہے۔ اگرچہ  
 کامل یقین تو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایک اڑتی سی خبر سنی گئی ہے اور وہ بھی کسی مستبر کی زبان سے  
 نہیں بلکہ طیور کی زبان سے۔

گووان نہیں واک نکالے ہو تو ہیں کعبہ ان تہوں کو بھی نسبت دے دو کی  
 فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم نے، نا کہ اب خانہ کعبہ میں بت نہیں ہیں مگر کبھی پہلے تو وہاں تھے اور وہاں  
 سے نکال دئے گئے ہیں اس لئے ان تہوں کو کعبہ سے ایک دور کی نسبت ہے۔  
 کیا فرض ہے کہ سب کے لئے ایک جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی  
 کیا خوب شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہ تو کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ہر شخص کو حضرت موسیٰ کی طرح  
 جواب صاف ہی مل جائے بلکن ہے کہ ہماری درخواست منظور ہو اور جلوہ دیدار دکھا دیا جائے۔ پھر  
 کیوں نہ ہم کوہ طور کی سیر کریں۔

گرمی بھی کلامیں لیکن نہ اس قدر کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی  
 فرماتے ہیں۔ شوخ زبانی اور حاضر جوابی کوئی بُری بات نہیں ہے اگر حد اعتدال سے تجاوز  
 نہ کر جائے۔ وہاں تو یہ حد مل ہے کہ وہ جس سے بات کرتے ہیں وہ ان کی شوخ زبانی کی ضرورت شکایت  
 کرتا ہے۔ عجب گرم شعر کہا ہے۔

غالب اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لیں جج کا ثواب نذر کرونگا حضور کی  
 اس شعر سے میرا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانہ میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ  
 مراد کا ارادہ حج کو جانے تھا۔ میرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرے



ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے منت مانتے ہیں۔ مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی  
نذر کر دینا اور سفر حج کا وہ اشتیاق اور ہرج حج کے ثواب کی یہ بقدری (زیادہ گارغالب)  
غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے یہ رنج کہ کہ ہے مے گلفام بہت ہے  
فرماتے ہیں۔ رنج و غم سب سے دل ناکام اس قدر بودا اور کمزور ثابت ہوا ہے کہ اس  
معمولی سی بات کا افسوس کہ آج شراب گلنگ بھوڑی مقدار میں باقی رہ گئی ہے۔ اس کے  
حق میں غم کا ایک پہاڑ بن گیا ہے۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے  
میں قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی لمبٹ بھی میرے لئے کافی ہے مگر اس خیال  
سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم بہت اور قانع ہیج نہ سمجھے اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا (زیادہ گارغالب)  
نے تیر کماں میں ہے نہ صیا و کمیں میں گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے  
یعنی جو شخص گناہی اور کس مہر سی کی حالت میں ہوتا ہے اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں  
ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار و نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں (زیادہ گارغالب)  
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گر چہ ریائی پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے  
فرماتے ہیں۔ میں اس زہد و عبادت کا قائل نہیں ہوں جس کے انعام میں جنت کی  
امید اور حور کے ملنے کی توقع شامل ہو۔

میں اہل خرد کس و رش خاص ہیں پائنتی رسم و رہ عام بہت ہے  
فرماتے ہیں۔ کوئی رسم و راہ خاص عقل مند لوگ ناز کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ عیسائیہ رسموں  
کی پابندی سے زیادہ بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ پھر روش خاص برتنے کا دعویٰ کرتے  
مگر مزم ہی پہ چھوڑو۔ مجھے کیا طون حرم ہے آلودہ بہ مے جامہ احرام بہت ہے  
فرماتے ہیں۔ مجھ کو تو جاہ و مزم ہی پر چھوڑ دو کہ میں بیٹھا ہوا اپنے دامن سے شراب کے دھبے دھو  
رہوں مجھ کو طواف خانہ کبر سے کیا ثواب حاصل ہو سکتا ہے جب میرا جامہ احرام شراب میں آلودہ ہے

ہے تہر گراب بھی نہ بنے بات کہ اُنکو انکار نہیں اور مجھے ایرام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ اگر اب بھی میری مزد پوری نہ ہو تو ستم ہے۔ ان کو وصل سے انکار نہیں  
 اور مجھ کو بے انتہا اصرار ہے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے پیکانیں مار گئے رہتے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ اہل ابتدا عشق میں کیوں مجھ سے مرنے کا تقاضا کرتی ہے ابھی مجھ کو محبت کے  
 کوچہ میں پڑا رہنے دے جگر کا خون ہونا۔ آنکھوں سے بہنا۔ میرا کوچہ و بازاریں رسوا ہونا اور اسی قسم کی  
 بہت سی دلتیں اور مصیبتیں مجھ کو اٹھانی باقی ہیں۔ ان سب کاموں کو انجام دے لوں تو پھر مزیکا ارادہ کروں  
 ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو تہ جائے شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ کوئی ایسا ہی بد نصیب شخص ہوگا جو غالب کو نہ پہچانتا ہو جبکہ وہ اچھا  
 شاعر ہے اتنا ہی مشہور بھی ہے۔

غزل مدت ہوئی ہے یار کو ہماں کئے ہوئے جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں بہت ہی دن ہو گئے یار کی بہانداری نہیں کی اور شراب آتش پیالوں میں  
 بھر کر اپنے عزیز ہماں کے سامنے نہیں رکھی جس سے بزم چراغاں کا لطف حاصل ہو۔ یعنی ایک  
 ایک جام ایک ایک چراغ کا کام دے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر بخت بخت کو عرصہ ہوا ہے دخوت مرگان کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ پھر بیٹھا ہوا ان جگر کے ٹکڑوں کو جن ریاہوں جن کو پہلے بھی مرگان یار کے  
 رو بردیش کر چکا ہوں۔

پھر وضع احتیاط سے نہ کئے لگا ہے دم برسوں ہوئے میں جاگ گیاں کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں پھر ضبط جنوں سے دم گھٹنے لگا ہے۔ برسوں ہو گئے کہ گریباں کو چاک ہی نہیں کیا۔  
 پھر گرم نالہائے شراب بار ہے نفس مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ پھر بھی جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح ویسے نالے کروں کہ جن سے شراب بے لگن

نت بد گئی چراغاں کا تماشا دیکھے ہوئے۔

پھر پشیم جرات دل کو چلا ہے عشق سامان صدمہ ہزار نمکداں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر شو عشق زخم دل پر نمک چھڑکنے کے سامان بیم ہتھیار ہوا ہے۔

پھر بھر رہا ہے خانہ مژگاں بخون دل ساز چمن طرازی داماں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ میں نے خانہ مژگاں کو پھر خون دل میں اس غرض سے ڈوبا ہے کہ صفحہ دامن پر گلکاریاں کروں۔

باہد گر ہوئے ہیں دل دیدہ پھر رقیب نظارہ و خیال کا سامان کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ آپس میں پھر دل و دیدہ رقیب بن گئے ہیں۔ دل سے جمال یار کی خیالی تفتہ کھینچی ہے اور آنکھ نے نظارہ روئے نگار کی حسرت ظاہر کی ہے۔

دل پھر طواف کئے ملامت کو چائے ہے پندار کا ضخم کردہ دیراں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر دل نے کوچہ ملامت کے طواف کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ عزور خود داری کے ثبت خانہ کو توڑ ڈالا ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب عرض متاع عقل دل و جاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر شوق کسی خریدار معشوق کو ڈھونڈ رہا ہے اور اس نے یعنی شوق دل نے متاع عقل دل و جان کی دوکان نگالی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر کوئی معشوق خریدار بن کر ہم سے عقل و دل و جان کا سودا کر لے

دکھے ہے پھر ہر ایک گل لالہ پر خیال صد گلتاں نگاہ کا سامان کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر خیال حسنیوں کی طرف دوڑنے لگا ہے۔ نگاہ میں سیکڑوں باخوں کا سامان فراہم کئے ہوئے۔

پھر چاہتا ہوں نامہ ولد دار کھولنا جاں نذر تقریبی عنوان کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ میں پھر بار کا فضا کھولنا چاہتا ہوں اس نے جو لفظ پر میرا نام دپتہ لکھا ہے وہ

دلفریب ہے کہ میں اس کو جان نذر کرنی چاہتا ہوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں پھر میری آرزو ہے کہ کوئی مستوق سیاہ زلفیں چہرہ پر پریشان کئے ہوئے  
کوٹھے پر سے مجھ کو جھانک رہا ہو۔

چلبے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمہ سے تیز دشنہ مڑگاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ مجھ کو آرزو ہے کہ پھر کوئی میرے مقابلہ میں مڑگان کی جھڑی کو ستر  
سے تیز کئے ہوئے آجائے۔

اک نو بہارِ ناز کوتاہ ہے پھر نگاہ چہرہ فرس غم سے گستاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ پھر ایک نو بہارِ ناز کو نظر تاک رہی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ چہرہ کو فروغ  
مے سے باغ کا ہسر بنا کر سامنے آجائے۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پٹے میں سر زیر بارِ مثبتِ دریاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ پھر جی میں یہ بات سمائی ہے کہ کسی مستوق کے دروازہ پر دربان کا احسان  
سر پر لئے ہوئے پڑے رہیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے ہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ پھر جی یہ چاہتا ہے کہ گزرے ہوئے زمانہ کی طرح ایسی فرصت مل جائے  
کہ رات دن تصورِ یار کئے ہوئے خاموش بیٹھے رہیں۔

غالب ہمیں نہ چھیر کہ پھر جوشِ اشک سے بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ اے غالب ہم کو نہ ستا کہ ہم پھر جوشِ اشک سے طوفاں برپا کرنے کا ارادہ  
کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔

غزل

نویدا من ہے بیدار دوستِ جاں کیلئے رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے  
فرماتے ہیں ظلمِ دوستِ ہمارے حق میں بیعتِ مبارک ثابت ہوا اس لئے کہ ظلمِ ہتم کے تینے طریقے



تھے وہ سب بہت لئے گئے۔ گویا جتنے ظلم تھے وہ ختم ہو گئے۔ اب نئی طرز ستم آسمان ایجاد نہیں کر سکتا۔  
 پھر ظلم کرے تو کیونکر کرے مطلب یہ ہے کہ ان کے ستم سہہ کر آسمان کے ظلم سے عمر بھر کے لئے محفوظ ہو گئے  
 بلا سے گمرۂ یار نشہ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مڑگان خود نکشائے

فرماتے ہیں میں کیا کروں۔ اگر مڑۂ یار بھی اور خون کی پیاسی ہے۔ میں اس کے حصہ کے موافق  
 خون دل اسکو پلا چکا۔ اب حقد ر خون دل میں باقی ہے وہ میری مڑۂ خون نشاں کا حصہ ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ میں دشمن خلقِ حقیر نہ ختم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے  
 نئی طرح کی شوخی ہے۔ حضرت تھضر علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ کہ دیکھئے زندگی  
 اسکا نام ہے۔ کہ ہم دنیا میں رہ کر لوگوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ آپ نے اگر عمر جاوداں حاصل کر لی  
 لی تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ لوگوں کی نگاہوں سے تو آپ پوشیدہ رہتے ہیں ایسی حیاتِ جاوداں  
 کس کام کی جس کی بدولت چشمِ خلایق سے پوشیدہ رہنا پڑے۔

ربا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ شک بلانے جان سے ادائیری اک جہان کیلئے  
 فرماتے ہیں۔ کاش میں اکیلا مبتلائے بلا ہوتا۔ تیری ادا اگر بلا تھی تو صرف میرے واسطے ہوتی  
 بلائے رشک تو چھکارہ حاصل ہوتا۔ ستم یہ ہے کہ تیری اداساری دنیا کی بلائے جان قرار پا گئی ہے۔  
 فلک دور رکھ اس مجھے کہ میں نہیں دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لئے  
 فرماتے ہیں۔ اے فلک تو نے مجھ کو اس قاتل سے کیوں دور رکھ چھوڑا ہے۔ ایک میں ہی تو اس کے  
 ستم و چور کے لئے مخصوص نہیں ہو گیا ہوں۔ اوروں پر بھی تو اس کی دراز دستی کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ کیا  
 ضرور ہے کہ وہ مجھ کو دیکھتے ہی قتل کر ڈالے۔

مثال میری کوشش کی ہو کہ مرغِ آفر کمرے قفس میں فہم خنیاں کے لئے  
 اس سے زیادہ کوشش کی تھی کسی پر ایسے میں بیان نہیں ہو سکتی (از یادگار غالب)  
 گدا سمجھ کے وہ چپھامری جو شامت اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نہ یا ساں کھلے  
 ارمغزل میں ایسے بلخ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزاد وہ جو مزار کی طرز کو نام کھتے

تھے۔ وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پروا نہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ مارک کیا ہے یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ میرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسان سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں صریح نہ کہ یہ میں ادا کی گئیں ہیں۔ مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر فقط شاعریت اور دوسری پر قدم لینا صریح دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نہ میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں (از یاد نگار غالب)

بچہ شوق نہیں طرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہئے وسعت کے بیان کے لئے

فرماتے ہیں غزل کا میدان تنگ میرے شوق بیان کے واسطے کافی نہیں ہے۔ مجھ کو اس سے بہت زیادہ وسیع میدان درکار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے غزل سرانی چھوڑ کر مدح سرانی شروع کرتا ہوں۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے بنا ہے عیش تجل حسین خاں کے لئے

یہ چند شعر نواب فرخ آباد کی صج میں لکھے ہیں جنہوں نے میرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا۔ مگر غالباً میرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں عیش اور مخلوق کو بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور وہ صرف اس غرض سے کہ میرے مروج کو نظر نہ لگ جائے ورنہ حقیقت میں تو عیش صرف تجل حسین خاں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا کہ میرے لطف نے یو سیری زبان کیلئے

فرماتے ہیں۔ ابھی میری زبان پر کس با اقبال شخص کا نام آگیا ہے کہ جس کے اثر سے میرے لطف نے میری زبان کو جو م لیا ہے۔

نصیر دولت میں اور معین ملت ملک بنا ہے چرخ بریں جلی آستان کے لئے

فرماتے ہیں۔ وہ نصیر دولت و دین بھی ہے اور معین ملت و ملک بھی اور وہ ایسا شخص ہے کہ چرخ بریں اس کے آستانہ کے واسطے بنایا گیا ہے۔

زمانہ مہدیہیں اسکے ہے محو آرائش **پیشگی اور تارے آبِ سماں کے لئے**  
فرماتے ہیں۔ اس کے وقت میں زمانہ محو آرائش ہو گیا ہے یہ موجودہ تارے آرائش فلک کے لئے کافی نہیں تھے اس لئے اور تارے بننے کی ضرورت واقع ہوئی ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر شے کو کامل تر حالت دیکھنا چاہتا ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے **سفینہ چاہئے بن کر پیکر ان کے لئے**  
فرماتے ہیں۔ ورق ختم ہو گیا اور تعریف ابھی باقی ہے۔ ایک دفتر مدکار ہے۔ اس دریائے اوصاف کے لئے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے تہہ کمر **صلائے عام ہے یارانِ نکتہ دان کے لئے**  
فرماتے ہیں غزل میں مدح لکھی۔ غالب کی ادائے خاص ہے۔ دوستوں کو چاہئے کہ وہ بھی یہ طریقہ اختیار کریں۔

## قصائد

سازِ نیک فرہ نہیں فیض چمن سے بیکار **سایہ لالہ بے داغ سویدا بہار**  
فرماتے ہیں چمن میں ایک خاک کا ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جو شبنم بہار سے فیضیاب ہو ا ہو۔ یہاں تک کہ سایہ لالہ بیدار بھی دل بہار کے لئے سویدا کا حکم رکھتا ہے اگر لالہ کو داغدار کہا جاتا تو اس کا داغ سویدا سمجھا جاتا اس لئے لالہ بے داغ کہا ہے کہ اس کا سایہ سویدا کا کام دے سکے۔

ہستی باد صبا سے ہے بعض سبزہ **ریزہ شیشہ سے جو ہر تیغ کہار**  
تیغ کوہ۔ تلہ کوہ کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ باد صبا اس قدر مست ہو گئی ہے کہ اس کی تاثر سے وہ سبزہ جو ہر تیغ کہار سمجھا جاتا تھا۔ ریزہ مینائے مے بن گیا ہے شیشہ کی کرپیں شکل و رنگ



میں جبری گھاس سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سبزہ کھار یہ مطلب ظہر کر رہا ہے کہ باد صبا کی مستی سے جو ہر تیغ کھار ریزہ مینا کے بن گیا ہے۔

سبزہ ہے جام زمرہ کی طرح داغ پلنگ تازہ ہے ریشہ نازخ صفت رنگ شہار  
فرماتے ہیں۔ جیسے کے داغ لیا ہوا کرتے ہیں۔ بیدار کے اثر سے جام زمرہ کی طرح سبز ہو گئے  
ہیں اور شرار ریشہ نازخ کی طرح تر و تازہ ہو گیا ہے۔ دونوں شبہیں نہایت بدیع و نادر واقع ہوئی ہیں  
مستی ابر سے گلچین طرب بے سرت کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فثار  
فرماتے ہیں۔ ابر کی ستارہ خرامی سے حسرت بھی گلچین طرب یعنی اس طرب اندوز کیفیت  
سے دونوں جہان کے غموں کا خاتمہ نظر آ رہا ہے۔

کوہ و صحرا بے مصوری شوق بلیل راہ خوابیدہ ہوئی خندہ گل بیدار

راہ خوابیدہ وہ رستہ جس پر لوگوں کی آمد و رفت مدت سے نہ تھی اور انسان بڑا ہوا تھا  
فرماتے ہیں۔ کوہ و صحرا تمام عندلیبان خوشنوا کے چہچہوتے سمور ہو گئے ہیں اور غنچوں کے چلنے کی آوازوں  
سے سوئے ہوئے رستے بیدار ہو گئے ہیں یعنی ان پر لوگ تماشائے بہار کے لئے چلنے پھرنے لگے  
سوئے بے فیض ہوا صوت مژگان یتیم سرنوشت دو جہاں ابریک سطر غبار  
فرماتے ہیں۔ باد بہاری سے ہر چیز کو ایسی سیراب حال ہو گئی ہے کہ ایک سطر جو غبار میں لکھی ہوئی  
ہو سرنوشت ابریک دو صد ابر بھی جاتی ہے۔ پھر اس سطر غبار کو مژگان یتیم سے تشبیہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے  
کہ جس طرح کسی یتیم بچے کی مژگان خاک آلود ایک سطر غبار ہو یعنی جس کی سرنوشت میں ساہیا  
سال کا ردنا لکھا ہو۔ وہ بھی فیض باد بہاراں سے سرور اندوز ہو گئی ہے۔

کا ٹکر کھینکے ناخن تو بانداز ہلال قوت نامیہ کو بھی نہ چھوڑے بیکار

فرماتے ہیں۔ آجکل ناخن بھی اگر تراش کر پھینک دیا جائے تو اس کو بھی قوت بانداز ہلال کی طرح  
بڑھاتے بڑھاتے بدرکامل بنا دے۔

کف ہر خاک بگرد و شہ قمری پُر اندر دام ہر کاغذ آتش زدہ طاووس سکار



فرماتے ہیں۔ بہار نے ہر چیز میں جان ڈال دی ہے۔ یہاں تک کہ مٹی بھر خاک قمری بن گئی ہے اور ہر شعلہ آتش طاؤس بن گیا ہے۔ قمری کا رنگ خاکی واقع ہوا ہے اس لئے کف خاک سے قمری کا بن جانا ثابت کیا ہے اور کاغذ جو بل کر شبت جاتا ہے اس واسطے اس کو دام طاؤس سے تشبیہ دی ہے

میکدے میں ہو اگر آرزوے گل چینی بھول جا یکسج بادہ لطاف گلزار

فرماتے ہیں اگر تجھ کو یہ تمنا ہے کہ سیکدے میں میٹھا ہوا بھول چنا کرے تو ایک کام کر اور وہ کلام یہ کہ ایک جام شراب طاق گلزار پر رکھ کر بھول جا۔ تھوڑے دن کے بعد باغ میں اسی طرح ایک شراب خانہ پیدا ہو جائیگا جس طرح ایک بیج سے درخت پیدا ہو کر سیکڑوں شاخیں نکال لاتا ہے۔ گویا ایک جام شراب شراب خانہ کا تخم ہے جو دیوار باغ کے طاق پر رکھ دینے سے باغ میں بخانہ پیدا کر دینگا۔

موج گل دھونڈھ نہ خلوت کد غنچہ باغ گم کرے گوشہ مخیخانہ میں اگر تو ستا

فرماتے ہیں۔ اگر تو نشہ کی حالت میں شراب خانہ کے کسی کونے میں اپنی پگڑی رکھ کر بھول جائے تو غنچہ باغ کے خلوت خانہ میں اسکو جا کر دھونڈھ وہ موج گل تنگنی ہے۔ ..... بجھ کر مل جائے گی اور تجھ پر ہوائے بہاران کی اعجاز منائی ظاہر ہو جائے گی۔

کھینچے گرائی اندیشہ چین کی تصویر سب شای خطا تو خیر ہو خطا پر کار

فرماتے ہیں اگر صورت فکر چین کی تصویر کھینچے تو بڑہ خطا کی طرح بدکار کی کھینچی ہوئی بیکر سبز ہو جائے لعل کی ہے مئے زمزمہ مدحت شاہ طوطی بڑہ کہار نے پیدا منتظار

فرماتے ہیں بنقبت سرائی کے لئے لعل سے طوطی بڑہ کہار نے زبان پیدا کر لی ہے لعل بھی بہار میں ہوتا ہے اور سبزہ زار بھی بہار پر۔

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیر سرا چشم حیرت مل ہوئی قابضت دیوا

فرماتے ہیں۔ وہ شہنشاہ جس کی تعمیر محل کے لئے حضرت حیرت مل کی آنکھ آئین شانے کا سانچہ تنگنی ہے فلک العرش جو خم دوش مزدور رشتہ فیض ازل سا زطناب معمار

فرماتے ہیں اس کے قصر کی تعمیر کے واسطے آسمان ہفتم دوش مزدور کی طرح خم ہو گیا ہے اور

فیض انہوں میں کے مہار کا وہ سوت ہے جس سے سحر و دیوار کا سیدھا پن دیکھتے ہیں۔  
 ہرگز نہ چھوڑیں دیکھتے ہیں پست اپنا دم  
 نصرت بہت نصرت ایک افواج حصار  
 سب سے خوشی۔ ذات انہوں سے مراد ہے۔ فرماتے ہیں۔ نواۓ نون کی بلندی اور اس کا باہر تھ  
 برابر ہے۔ وہ سب سے سحر میں کہتے ہیں۔ سحر و نون کی بلندی بہت اور اس کے تھ کی چوڑی و تھ  
 مسدودات کے درجہ رکھتی ہے۔

ناں کی خشک سے فصاحت جو ہے کثرت کا  
 ڈر ہے مروجہ نال پر ہی سے ہزار  
 فرماتے ہیں۔ وہوں کی خشک و خشک سے جس کو ایک پر ہو بھی میرا آج کے وہ تھ عمر  
 پر ہی کے چنگے سے ہزار ہے۔

خاک صحرائے نجف چہ سیر عرفا  
 چشم نقش قدم آئینہ نجف بیدار  
 فرماتے ہیں۔ بھرائے نجف کی خاک عرفوں کی سیر کا یہ ہر ہے اور چشم نقش قدم نجف بیدار  
 کو آئینہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ اہل عرفان خاک نجف کو بوجہ نظر سمجھتے ہیں۔ اور سفر نجف کے وقت  
 اپنے نقش پا میں بخت بیدار کی صورت شاہد کر لیتے ہیں۔

ذرہ اس لکھ خورشید کو آئینہ ز  
 گرد اس مشت کی امید کو احرام ہزار  
 فرماتے ہیں۔ وہاں کی خاک کا ذرہ آفتاب کے لئے خورشید کے آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔ آئینہ زور آئینہ  
 جس میں منہ دیکھتا ہے خورشید زبور اور وہاں کے جنگل کی خاک امید کے لئے فضل ہمارا کا جامہ احرام ہے۔

آفرینش کو ہے اس طلب سنی ناز  
 عرض خمیازہ ایجاد ہے ہر موج غبار  
 فرماتے ہیں۔ دین آفرینش کو سنی خورشید کی طلب ہے۔ گویا موج غبار انگڑائی ہے۔ ایسی دیکھ  
 مطلب ہے کہ جس طرح نئے کے تار کے وقت انگڑائی آتی ہے اسی طرح وہاں کی موج غبار بلند ہو کر  
 بتاتی ہے۔ کہ شراب خورشید زکات اُنز گیا ہے۔ پھر اس کی طلب میں انگڑائیاں لی جا رہی ہیں۔ گویا  
 وہ سرزمین ایسی ہے کہ پیدا کر کے آفرینش کو بھی باہر اس پر خورشید ہوتا ہے۔

فیض سے تیرے ہے شمع شبت انکار  
 دل بردانہ چراغاں پر پیل گلزار  
 مع ثانی

فرماتے ہیں۔ اسے شمع شبستان بہار تیرے فیض سے پروانہ کا دل چراغاں بن گیا ہے اور  
پر تیل گلزار ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی دلی مرادیں تجھی سے حاصل ہوتی ہیں۔  
شکل طاؤس کے آئینہ خانہ پرواز      ذوق میں جلوہ کے تیرے ہیوا دیدار  
فرماتے ہیں۔ طاؤس کی طرح سارا آئینہ خانہ اڑنے لگے تو کیا عجیب ہے۔ تیرے جلوہ کے ذوق  
اور تیرے دیدار کے شوق نے اس کو پر لگا دئے ہیں۔

تیری اولاد کے غم سے بچے گرہ لیا      سلک اختر میں نہ نو مژہ گوہر بار  
فرماتے ہیں۔ تیری اولاد کے غم سے آسمان پر سلک اختر میں نہ نو مژہ گوہر بار بن گیا ہے۔  
یہ ہے کہ اس غم میں رونے سے آنسوؤں کو موتیوں کا رتبہ مل جاتا ہے۔

ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر ناز      ہم ریاضت کو تھے جو صلہ استغفار  
فرماتے ہیں۔ تیرا نقش قدم عبادت کے واسطے سجدہ گاہ کا حکم رکھتا ہے۔ اور ریاضت کیلئے  
تیرا حوصلہ پشت پناہ کا کام دیتا ہے۔

راج میں تیری نہاں مژمہ نعت نبی      جام سے تیرے عیاں بادہ جوش اسرار  
فرماتے ہیں تیری راج میں زمرہ نعت نبی پوشیدہ ہے۔ گویا جس نے تیری مدح لکھی۔ اس نے  
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح لکھی۔ اور جس نے تیرا جامِ محبت پی لیا۔ وہ گویا بادہ اسرار سے بخود و سرشار ہو گیا۔

جو ہر دست دعا آئینہ یعنی تاثیر      یک طرف نازش مژگان و گریہ غم خار  
فرماتے ہیں۔ تیرے دست دعا کا ایک ادنیٰ جوہر یہ ہے کہ وہ تاثیر کا آئینہ ہے۔ یعنی ادھر باتھ دعا  
کے لئے اٹھے اور ادھر دستِ بے اثر سامنے آمو جوہر ہوا۔ ایک طرف تو مژگان کو بوجہ اشک سے پہونے کے  
جو دعا قبول ہونے کا ذریعہ ہے غم و ناز ہے۔ دوسری طرف جو ہر تاثیر خدا حسرت کے واسطے موجب  
رنج و ملال ہے۔ یعنی جب دعا قبول ہو گئی تو حسرت پامال ہو گئی۔

مژگم سے ہر عجز اخلاہ اقبال نگاہ      خاک کی تھے جو نیم نہ ہو آئینہ دار  
فرماتے ہیں۔ جو آنکھ تیرے خاکِ در کی آئینہ دار نہ ہو۔ یعنی خادم و فرمانبردار نہ ہو۔ اس کی نظر ستارہ

واقبال کا عزا خانہ بن جائے اور اس کی مرہ سب سوا سو گشتیوں میں شمار کی جائے۔  
 دشمن آل نبی کو یہ طرب خانہ دہر عرض خمیازہ سیلاب طاق دیدار  
 فرماستمبر آل نبی کے دشمن کو اس طرب خانہ دنیا کی ایک ایک محراب اور ایک ایک  
 طاق موج سیلاب بن کر ڈبو دے۔

ویدہ مادل اسلہ آئینہ یک تو شوق فیض معنی سے خطا سا غم شرار  
 فرماتے ہیں۔ آنکھ سے لگا کر دل تک اسے اسد پہ تو شوق کا آئینہ دار بن جائے۔ اور فیض  
 معنی سے خطا سا غم شرار ہو جائے

## قصیدہ دہر

دہر جز جلوہ یتانی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا تو میں  
 فرماتے ہیں۔ اس دنیا کا وجود جلوہ یتانی معشوق کا آئینہ ہے۔ اگر حسن کو اپنے دیدار کی  
 طلب نہ ہوتی تو ہم کہاں سے ہوتے۔ گویا ہم کو آئینہ بنا کر اپنا جہل بے مثال دیکھا ہے شعر  
 تمام و کمال تصوف کے ایک مسئلہ سے لعلق رکھتا ہے۔

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت نہ ذوق بکسی لے تنہا کہ نہ دنیا ہے نہ دین  
 فرماتے ہیں۔ افسوس ہے ہم نے ایسی بیدلی کے ساتھ اس دنیا کے ناپائدار کے تماشے کیے  
 کہ جس سے نہ عبرت حاصل ہوئی نہ کچھ لذت ملی اور تنہا ایسی بکسی کی حالت میں رہی کہ جس سے دین  
 ہی ملانہ کچھ دنیا کا ہی فائدہ حاصل ہو سکا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تماشے سے اگر انسان کو عبرت  
 حاصل ہو تو دین کا فائدہ ہے اور اگر اس کے دیکھنے سے لطف ہو تو دنیا کے عجز ہے۔ ہماری  
 بیدلی نے اور ہماری بیدمانی نے ان دونوں فائدوں سے ہم کو محروم رکھا۔

ہرزہ ہے نعمت زبردیم ہستی و عدم لغو ہے آئینہ فرق جنون و تسکین  
 فرماتے ہیں۔ وجود باری تعالیٰ کے سوا کسی دوسری شے کے وجود و عدم کی نسبت گفتگو



کرنی یا جنون و تمکین کے متعلق کوئی فرق ثابت کرنا لغو و بیفائدہ ہے۔

نقش معنی عہد خمیازہ عرض صورت سخن حق ہمہ پیمائش ذوق تحسین

فرماتے ہیں۔ جو لوگ سنی شناسی کے مدعی ہیں۔ ان کو صرف ظاہر داری منظور ہے۔ اور جو لوگ

حق گوئی کے دعویدار ہیں۔ ان کو نقطہ اپنی تحسین و تائید مستی مقصود ہے یعنی شناسی ایسی ہونی

چاہئے جس میں ظاہر داری کامل نہ پایا جائے اور حق گوئی اسکا نام ہے جس میں اپنی کوئی غرض غفلتی

لاٹ دالتش غلط و نفع عبادت معلوم دردیک ساعز غفلت ہے چہ دنیا چہ دین

فرماتے ہیں۔ جو آدمی دنیاوی معاملات میں عقلندی کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ غلطی پر ہے۔ اور جو

جو کوئی دین کے معاملات میں عبادت سے نفع کی امید رکھتا ہے۔ اسکا خیال بے جا ہے۔ واقعی بات

تو یہ ہے کہ دین و دنیا دونوں غفلت کی بدولت خراب ہیں۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح

شراب کی تلچھٹ اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے دین و دنیا ساعز غفلت میں پیشینیا

مثل مضمون وقابا و بدست تسلیم صورت نقش قدم خاک بفرق تمکین

فرماتے ہیں دنیا ایسی جگہ ہے کہ یہاں تسلیم و رضا جیسی قابل قدر دولت بیکار اور بیفائدہ

ثابت ہوتی ہے اور اسی طرح وقار تمکین سے مثل نقش قدم ذلت و رسوائی حاصل ہوتی ہے یعنی جس

طرح نقش قدم خاک بسر ہوتا ہے۔

عشق بیزبطی شیرازہ اجزا حواس وصل زنگار رنج آئینہ حسن یقین

فرماتے ہیں۔ ہوشیار لوگوں کے نزدیک اس زمانہ میں بخود دی و دیوانگی کا نام عشق رکھ لیا گیا

ہے اور اصحاب اہل یقین کی نظروں میں آئینہ یقین کا زنگار وصل معشوق ہے۔ اگر آئینہ یقین بجلی

ہوتا۔ تو معشوق کا جلوہ خود اپنی ذات میں نظر آتا اور پھر اس سے کبھی مفارقت نہ ہوتی۔

کوہ کن گرسنہ فرد و رطب گاہ قریب بے ستون آئینہ خواب گران شیرین

فرماتے ہیں۔ فریاد کے عشق کو ہم عشق کامل تسلیم نہیں کرتے وہ تو صرف خسرو کے محل کا ایک مزین

نقشہ اس کے جذب محبت کا شیریں بجچہ بھی اثر نہ ہوا۔ گویا کوہ بے ستون شیریں کے خواب غفلت کی

ایک تصویر سایہ دار ہے جس پر پتھر کاٹے کاٹے کو کین تیشہ سے اپنا سر پھوڑ کر مر گیا۔  
 کس نے دیکھا نفس اہل وفا اسٹش خیز کس نے پایا اثر نالہ دلہائے حزن میں  
 فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں نفس اہل وفا کو آگ لگا دیتے ہوئے کس نے دیکھا ہے اور کس نے  
 درد مندوں کی فریادیں اتر پائے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ اب اہل وفا کی آہ میں گرمی ہے نہ  
 ٹوٹے ہوئے دلوں کے تالیں اثر ہے۔

سامعِ ہزیمہ اہل جہاں ہوں لیکن نہ سرو برگ تالش نہ دماغِ نفیس  
 یہاں ہزیمہ کا لفظ طنزاً بجانے ہرزہ سرائی استعمال ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اہل جہاں جو  
 کچھ ہرزہ سرائی کرتے ہیں۔ بیوہ میں بھی سن لیتا ہوں۔ مجھ سے نہ تو ان کی تعریف کی جاسکتی ہے  
 اعدائے ان کی مذمت کرتا ہوں۔

کس قدر ہرزہ سرائیوں کہ عیاذ اللہ یک قلم خارج آداب و وقار و تسکین  
 یہ شعر گریز کا ہے۔ اہل دنیا کی ناہمی کی نسبت لکھتے لکھتے فرماتے ہیں کہ خدا کی پناہ میں کس قدر  
 ہرزہ سرائیوں میں نے باتیں اور بیانی کی ہیں وہ یک قلم خارج آداب و وقار و تمکین نہیں۔  
 نقشِ لاجول لکھ اسے خامہ ہزیاں بخیر یا علی عرض کرے فطرتِ سواس قریں  
 فرماتے ہیں۔ اسے قلم ہزیاں کے رفع کرنے کو لاجول کا تعویذ لکھ اور اسے فطرتِ سواس  
 کے رفع کرنے کو یا علی کا وظیفہ پڑھ۔

متکلفِ فیضِ خدا جان و دل ختمِ رسل قبلہ آلِ نبی کعبہ ایک یقین  
 فرماتے ہیں۔ وہ فیضِ خدا کا کلام بر کرنے والا ہے۔ اور خاتمِ رسل کا جان و دل ہے اور  
 وہ قبلہ آلِ نبی ہے اور کعبہ ایک یقین۔

ہو وہ سرایہ ایجا دجہاں گرم خرام ہر کفِ خاک ہے و اں گروہِ تصویریں  
 فرماتے ہیں۔ وہ باعثِ نازش ایجا د عالم جہاں سر گرم خرام ہو۔ وہاں کی ہر کفِ خاک  
 کو زمین بن جائے۔

جلوہ پرواز ہو نقش قدم اس کا جس جا وہ کف خاک سے ناموں و عالم کی امن  
 فرماتے ہیں۔ ان کا نقش قدم جس جگہ جلوہ پرواز ہو جائے ان کے قدموں کے اثر سے  
 اس کف خاک سے دونوں جہان کو عزت و آبرو حاصل ہو۔

نسبت نام سے اسکے ہے یہ رتبہ کبر ہے ابدائیت فلک خم شدہ ناز زمین  
 فرماتے ہیں۔ اس کے نام کی نسبت سے زمین کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ کہ ابد تک  
 پشت فلک نازش زمین سے خم رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علی کی کنیت ابو تراب  
 ہے اور تراب مٹی کو کہتے ہیں۔ اس سبب سے زمین نازاں ہے۔

فیض خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا آسمان بوئے گل سے نقش باد صبا عطر آگین  
 فرماتے ہیں۔ بوئے گل سے جو باد صبا عطر ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پھولوں  
 کو میرے ممدوح نے خلق کا فیض پہنچایا ہے۔

برش تبع کا اسکی ہے جہاں میں چرچا قطع ہو جائے نہ سر رشتہ ایجاد کہیں  
 فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کی برش شمشیر کا سارے جہان میں پھروا ہے۔ کہیں  
 ایسا نہ ہو کہ رشتہ ایجاد اس کی شہرت کے خوف سے قطع ہو جائے۔

کفر سوز اسکا وہ جلوہ ہے کہ جس کے ٹوٹے رنگ عاشق کی طرح رونق بخانہ چیں  
 فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کا جلوہ ایسا کفر سوز واقع ہوا ہے کہ جس سے رنگ  
 عاشق کی طرح بت خانہ چین بھی شکستہ ہو جاتا ہے۔

جان پناہ دل و جان فیض رسا نا شاہا وحی ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقین  
 فرماتے ہیں۔ اسے جان کے پناہ دینے والے اور دل و جان کو فیض پہنچانے والے  
 ختم رسل کا وحی تو ہی ہے اور اس کا فتویٰ یقین تک پہنچ گیا ہے۔

جسم اظہر کو ترے دوش ہمیر منبر نام نامی کو ترے نا صیہ عرش نگین  
 فرماتے ہیں۔ تیرے جسم اظہر کے لئے دوش ہمیر منبر ہے۔ اور تیرے نام نامی کا نگین

عرش کی پیشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے دوش پیر پر چڑھ کر کعبہ کے بیت توڑے ہیں اور تیرا نام عرش معلیٰ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔

کس سے ممکن ہے تیری مدح بغیر ازدا شعلہ شمع گر شمع پہ باندھے آئین

فرماتے ہیں۔ تیری مدح خدا تعالیٰ کے سوا کون کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ تیری ذات کو فنا فی اللہ ہو جانے کے سبب ایسا ربط حاصل ہو گیا ہے جیسا شمع کو شعلہ سے حاصل ہے یعنی شعلہ ہی سے شمع کو زینت حاصل ہوتی ہے۔

آستان پر ہے ترے جو ہر آئینہ سنگ رقم بندگی حضرت جبریل امین

فرماتے ہیں۔ تیرے آستان پر جبریل امین نے جو سجدے کئے ہیں وہ سنگ آستان پر اسی طرح ہویدا ہو گئے ہیں جس طرح آئینہ میں جو ہر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا حضرت جبریل کے سجدوں کے نشان تیرے سنگ آستان پر جو ہر آئینہ کا کام دیتے ہیں۔

تیرے در کیلئے اسباب نثار آمادہ خاک یوں کو جو خدا نے دئے جان و دنیا

فرماتے ہیں۔ تیرے دروازہ پر تصدق ہونے کے لئے یہ سب آمادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو جان و دل و دین بخشے ہیں۔

تیری مدحت کیلئے ہر دل جان کلام و زبان تیری تسلیم کو میں لوح و قلم دست و جبین

فرماتے ہیں۔ تیری مدح سرائی کے لئے دل و جان کلام و زبان بن گئے ہیں اور تیرے آداب بجالانے کو لوح و قلم دست و جبین ہو گئے ہیں۔

کس سے ہو سکتی ہے مداحی حمد و تحمید خدا کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس میں

فرماتے ہیں اس کی مداحی کس سے ہو سکتی ہے جو حمد و تحمید خدا ہو اور سوا خدا کے فردوس میں کی آرائش کس سے ہو سکتی ہے مطلب یہ ہے کہ تیرے مدح کے واسطے بہشت میں آراستہ کی جاتی ہے۔

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد اللہ کہ سوا تیرے کوئی اسکا خریدار نہیں

فرماتے ہیں جس کا نام اسد اللہ ہے اور تخلص تیسرے ہے وہ بازار معاصی کی ایک جنس ہے



اور گنہگار کا حامی اور خریدار ترے سوا کوئی نہیں ہے۔

شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب ہے ترے حوصلہ نقل پر آریک لقیں

فرماتے ہیں۔ مطالب مدح کا بیان جو اس قدر شوخ واقع ہوا ہے وہ ترے حوصلہ اور بخشش کے یقین کی وجہ سے ہے۔

وے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین  
فرماتے ہیں۔ میری دعا کو ایسا حسن قبول کا مرتبہ عطا فرما دے۔ کہ میرے ایک ایک حرف پر سو سو بار اجابت آمین کہے۔

غم شبیر سے ہو سینہ بہاں تک لبریز کہ میں خون جگر سے مری آنکھیں زنگیں  
فرماتے ہیں۔ حضرت شبیر کے غم سے میرے دل کو اس قدر لبریز کر دے کہ خون جگر کے اثر سے میری آنکھیں سرخ رہنے لگیں۔

طبع کو الفت و دل میں سرگرمی شوق کہ جہاں تک چلے اس قدم اور مجھ سے جہیں  
فرماتے ہیں۔ میرے دل کی محبت میں مجھ کو یہ شوق پیدا ہو جائے کہ جہاں وہ زمین پر قدم رکھے۔ میں اپنی جہیں اس کے ٹم کے نیچے فرش کر دوں۔

دل الفت نسب و سینہ توحید فضا نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں  
فرماتے ہیں۔ دل میں جوش محبت ہو اور سینہ میں نور عرفان نگاہ جلوہ پرست ہو اور نفس صدق گزیں صرف اعدا اثر شعلہ و دود و دوزخ  
فرماتے ہیں۔ میرے اعدا کے لئے آگ کا شعلہ اور دوزخ کا دھواں مخصوص ہو جائے اور احباب کے واسطے فردوس بریں کے گل و سنبل وقف کر دے جائیں۔

قصیدہ

ہاں بہ نوین ہم اسکا نام جسکو تو جھک کے کر رہا ہے سلام  
فرماتے ہیں۔ اے ہلال عید ہم کو اس کا نام بتا دے جس کو تو جھک کے سلام کر رہا ہے۔

دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح یہی انداز اور یہی اندام  
 فرماتے ہیں بچھیں اور چھیں کی شب کو صبح کے وقت ہم نے تجھ کو دیکھا تھا۔ ایسا ہی  
 نازک اندام تھا اور یہی انداز سے ایک جانب بھکا ہوا تھا۔

باسے دو دن کہاں رہا غائب بندہ عاجز ہے گردش ایام  
 یہ تو جتا تو دو دن تک کہاں چھپا رہا اور کہاں غائب ہو گیا تھا۔ بندہ عاجز ہے دنوں  
 کی گردش سے ایسا ہوا کرتا ہے۔ بندہ عاجز ہے۔ گردش ایام۔ یہ سارا مصرعہ تشیل ہے۔  
 اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا آسماں نے بچھا رکھا تھا دام  
 فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تو اڑ کے کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ تھماں  
 نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔

مرحبا اے سرور خاص خاص حذا اے نشاط عام عوام  
 فرماتے ہیں مرحبا۔ اے خاص انخاص لوگوں کے سرور پہنچانے والے اور حذا اے تمام  
 مکالم لوگوں کو نشاط بخشنے والے۔

عذر میں تین دن نہ آنے کے لے کے آیا ہے عید کا پیغام  
 فرماتے ہیں تین دن نظر نہ آنے کے عذر میں عید کا پیغام لے کر آیا ہے تاکہ تجھ سے  
 غیر حاضر رہنے کی باز پرس نہ ہو۔

اسکو بھولا نہ چا سئے کہتا صبح جو چائے اور آئے شام  
 فرماتے ہیں۔ اسکو بھولا نہیں کہتے جو صبح کا بھولا شام کو آجائے یعنی چھبیسویں ساتویں  
 کی صبح کو چاند نکل کر پھر اسی کی شام کو نظر آتا ہے۔

ایک میں کیا کہ سب کے جان لیا تیرا آغاز اور ترا انجام  
 فرماتے ہیں۔ ایک میں ہی نہیں۔ یہ تو سارے زمانہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو بد سے گھٹتے  
 گھٹتے بھٹ جاتا ہے اور پھر تیرے سر سے تیرا آغاز ہو کر تو کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے یعنی بد پہنچتا

راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا؟ مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں غلام  
 فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے اپنا راز دل کیوں چھپاتا ہے۔ کیا تو نے مجھ کو کوئی نماز سمجھا ہے۔  
 جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک ہی ہے امید گاہ انام  
 فرماتے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آج سارے جہان میں ایک ہی بارگاہ ایسی ہے کہ  
 جہاں سے لوگ مرادیں پاتے ہیں۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش غالب اسکا مگر نہیں ہے غلام  
 فرماتے ہیں۔ یہ میں نے ان لیا کہ تو اس کا حلقہ بگوش غلام ہے تو کیا غالب اس کا غلام نہیں ہے؟  
 جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو تب کہا ہے بطر زرقاں  
 فرماتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں۔ کہ تو بھی اس بات سے واقف ہے کہ مجھ کو بھی اس کی غلامی  
 کا فخر حاصل ہے۔ اسی وجہ سے میں نے بطر زرقاں انکار سی تجھ سے دریافت کیا ہے۔

مہرتا ہوں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ قرب ہر روزہ کربیل و دام  
 فرماتے ہیں۔ مہرتا ہوں کو مدوح کی بارگاہ سے قرب ہر روزہ ہمیشہ کیلئے حامل ہو تو ہو لیکن اے؟  
 تجھ کو کیا یا یہ روشناسی کا جز بتقریب عید ماہ صیام  
 تجھ کو یہ رتبہ بجز عید کے کس دن حاصل ہو سکتا ہے۔

جانتا ہوں کہ اسکے فیض سے تو پھر بتا چاہتا ہے ماہ تمام  
 فرماتے ہیں۔ تو تو اپنے غل سے میرے مدوح کا نام بھی مجھ کو نہ بتاتا غلہ میں تجھ کو یہ بتائے دیتا ہوں  
 کہ تو پھر اسکے فیض سے ماہ کامل بنا چاہتا ہے۔ اب تجھ گیا ہو گا کہ تجھ سے زیادہ میری دہاں رسائی ہے۔

ماہ بن ماہتاب بن میں کون مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام  
 فرماتے ہیں۔ ماہ بن۔ ماہتاب بن میں کون ہوں جو تجھ پر رشک کروں۔ مجھ کو کیا تو اپنا انعام  
 بانٹ دیگا۔ جو تجھ کو تیری قسمت سے ملے گا۔ وہ تیرے ہی پاس رہے گا۔ اس شعر کا بیان ندرت سے  
 خالی نہیں ہے۔ مگر یہ سارا قصیدہ میرزا صاحب نے ایسی زبان میں لکھا ہے۔ کہ جس پر قیمت

نک اُردو زبان فکر کرے گی۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے اور کے لین دین سے کیا کام  
فراتے ہیں کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ مجھ کو بچہ پر رشک آتا ہے۔ اور میں عید کے انعام سے محروم  
ہی رہ جاؤں گا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بچہ کو تیری حیثیت کے موافق انعام ملیگا اور مجھ کو میرے  
رتبہ کے قابل خلعت و جو اہر عطا ہوگا۔

مجھے آرزو ہے بخشش خاص گر تجھے ہے امید رحمت عام  
فراتے ہیں یہ بخشش خاص کا تمنا ہی ہوں۔ اگر تجھ کو امید رحمت عام ہے۔  
جو کہ تجھ کو فوسر فروغ کیا نہ دیگا مجھے مئے کلفام  
فراتے ہیں۔ جو ممدوح تجھ کو ایسی روشنی بخشے گا جو ضیاء بخش عالم ہوگی۔ کیا مجھ کو شیشہ کی لال  
پری جو چاندنی رات کو اندر زیادہ روشن کر دے گی نہ دیگا۔

جبکہ چودہ مست ازل فلکی کہی قطع تیری تیزی کام  
فراتے ہیں جب تو تیز رفتاری کے ساتھ آسمان کی چودہ منزلیں طے کر لیگا اور چودھویں  
رات کا بدر کامل بن جائیگا

تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر کوئے مشکوئے سخن و منتظر باہ  
اور تیرے پر تو سے کوچے اور محل سرا اور من اور درو باہر چاندنی پھیل جائے گی تو  
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا ایک بلوریں جام  
اس میرے ہاتھ میں بھی ایک جام بلوریں مے انگور سے چھلکتا ہوا تیری شکل کا روشن اور منور ہوگا۔  
پھر غزل کی روش پر چل نکلا تو سن طبع چاہتا تھا لکام  
فراتے ہیں۔ جام شراب اور شب ماہ کا ذکر آتے ہی پھر غزل سرائی میں لے شروع کر دی  
گویا تو سن طبع باگ کا اشارہ چاہتا تھا۔ اشارہ پاتے ہی چل نکلا۔

زہر غم کر چکا تھا میرا کام تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام غزل



فرماتے ہیں۔ میرے حق میں تو غم ستم قاتل ثابت ہو ہی چکا تھا۔ کچھ کو کس بیوقوف نے میرے قتل کرنے کی صلاح دی۔ ناحق ایک تیر لگا کر بدنام ہوا۔

میں ہی پھر کیوں نہ مے پئے جاؤں غم سے جب ہو گئی ہے زلیست حرام  
فرماتے ہیں۔ حرام تو شراب بھی ہے اور غم سے زلیست بھی حرام ہے پھر میں کیوں شراب پیوں  
اس کی قدر غم غلط تو ہو جاتا ہے۔ اگر شراب کو حرام جان کر شراب پینے سے پرہیز کرتا ہوں۔ تو  
غم زلیست حرام کئے دیتا ہے۔ لاجواب شعر لکھا ہے نئی قسم کی شوٹی ہے۔

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام  
فرماتے ہیں۔ بوسہ تو کب وہ دیتا ہے۔ ہم تو اسی بات کو غنیمت سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ اس  
کو یہ معلوم نہیں کہ گالیاں کھانے میں بھی ہم کو لطف حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے  
تو وہ اپنے منہ سے گالیاں بھی نہ دے۔

کعبہ میں جایا کھینکے ناؤں اب تو باندھا ہے دیر میں احرام  
فرماتے ہیں جس طرح یائے کعبہ کے دیر میں احرام باندھ لیا ہے۔ اسی طرح ایکٹ ایک  
دن دیر کے بدلے کعبہ میں جا کر ناؤں پھونکیں گے۔

اس قبح کا ہے دورِ مجھ کو نقد چرخ نے لی ہے جس کے گزروں  
فرماتے ہیں مجھ کو وہ جامِ عرفان نصیب ہے جس شراب معرفت سے بخود دھو کر آسمان  
رقص کر رہا ہے۔

بوسہ دینے میں انکو ہے انکار دل کے لینے میں خبکو تھا ابرم  
فرماتے ہیں تعجب کی بات ہے کہ بوسہ کے دینے میں ان کو انکار ہے۔ جن کو دل  
لینے میں صد کرنے کی عادت تھی۔

چھوڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے کیوں رکھوں ورنہ غائب نام  
بالکل نئی شوخی میرزا صاحب نے اس مقطع میں برتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے تو صرف

چھترنے کی غرض سے کہ ان کو غفہ آئے اور وہ مجھ کو پڑا بھلا کہنا شروع کر دیں میں نے اپنا نام غائب  
رکھ دیا ہے ورنہ میں تو ان کے حسن دلکش سے مغلوب چکا ہوں۔ غالب کیونکر بن سکتا ہوں۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ ایتو کہہ اسے پری چہرہ پیک تیز خرام  
یہاں سے پھر ماہ نو کی جانب منی طلب ہو کر فرماتے ہیں۔ میں تو سب کچھ کہہ چکا۔ اب اسے  
پری چہرہ پیک تیز خرام تو بتا کہ تو کیا کہتا ہے۔

کون ہے جسکے درپہ ناصیہ سا ہیں مہر و زہرہ و بہرام  
بہرام فلک مرتع کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں وہ کون ہے جس کے درپہ ناصیہ سا  
مہر و زہرہ و بہرام ہیں۔

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن نام شاہنشہ بلند مقام  
فرماتے ہیں۔ تو اگر نہیں جانتا تو مجھ سے سن میرے شاہنشہ بلند مقام کا نام  
قبیلہ چشم و دل بہادر شاہ منظر ذوالجلال والا کرام  
فرماتے ہیں۔ وہ دل چشم کے قبیلہ ہیں۔ یہی چشم امیہ انہی کو دیکھتی ہے۔ اور دل منی  
انہیں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ان کا اسم گرامی بہادر شاہ ہے اور وہ منظر ذوالجلال والا کرام ہیں۔  
شہسوار طریقہ انصاف تو بہادر حدیقہ اسلام  
اور یہ دونوں صفیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

جس کا ہر فعل صورت اعجاز جس کا ہر قول معنی الہام  
فرماتے ہیں۔ اور وہ بادشاہ ایسا ہے۔ کہ جس کا ہر فعل اعجاز مند ہے اور جس کا ہر قول الہام  
ثابت ہوتا ہے۔

بزم میں میزبان قیصر و جم رزم میں استاد رستم و سام  
فرماتے ہیں۔ بزم میں وہ قیصر و جم کا میزبان ہے اور رزم میں وہ رستم و سام کا استاد ہے گویا  
قیصر و جم اس سے فیض پاتے ہیں اور رستم و سام اس سے جنگ کے طریقہ سیکھتے ہیں۔

اے ترالطف زندگی افزا      اے ترا عہد فرخی مزجام  
 یہاں سے صبح حاضر شروع ہو گئی ہے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔  
 چشم بد و خوش سروانہ شکوہ      خوش اللہ عارفانہ کلام  
 فرماتے ہیں۔ خدا تجھ کو نظر بد سے بچائے۔ تیری خسروانہ شان آنکھوں میں کبھی باقی  
 ہے اور اشار اللہ تیرا عارفانہ کلام دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔  
 جاں نثاروں میں تیرے قیصرؑم      جرعہ خواروں میں تیرے مرشدؑ جاگ  
 فرماتے ہیں۔ تیرے جان نثاروں میں قیصرِ روم بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اور تیرے جرنیل  
 میں تمشید بھی داخل ہے۔

وارث ملک جلتے ہیں تجھے      ایمن و تور و خسرو و بہرام  
 فرماتے ہیں۔ یہ سب بادشاہ تیرے مندرجہ ثانی میں نام لیا گیا ہے تجھ کو وارث ملک جلتے ہیں  
 زور بازو میں مانتے ہیں تجھے      کیو و گو و زر و بیزن و زمام  
 مندرجہ ثانی میں زور آور اور مشہور پہلوانوں کا نام لیا گیا ہے۔

قطعہ

مرحبا ہو شکافی ناوک      آفریں آبداری صمصام  
 تیر کو تیرے تیر غیر چوٹ      تیغ کو تیری تیغ خضم نیام  
 دونوں شعر درست و گریبان ہیں۔ اور لفظ نشر مرتب ہے۔ فرماتے ہیں تیرا تیرا بال کی کھال  
 کھینچنے والا ہے۔ کہ دشمن کا تیر گویا اس کا نشانہ ہے اور تیری شمشیر اس قدر آبدار ہے۔ گویا دشمن کی تلوار  
 اس کا نیام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا تیر دشمن کے تیر کو نشانہ کی طرح اڑا دیتا ہے اور تیری تلوار  
 دشمن کی تلوار میں نیام کی طرح اتر جاتی ہے۔

قطعہ

رعد کا کہہ ہی ہے کیا دم نہ      برق کو دے۔ باجے کیا الزام

تیرے نیل گراں جد کی صدا تیرے خوش بکھٹاں کا خدام  
 فرماتے ہیں۔ رعد کا دم بند کر رہی ہے۔ تیرے نیل ملک شکوہ کی چٹکھاڑاویجلی کو الزام دے  
 رہا ہے۔ تیرے خوش بکھٹاں کا خدام یعنی بجلی سے کہتا ہے کہ تو ایسی سست رخا رہے کہ  
 میرے ساتھ دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔

قطعہ

من صورت گری میں تیرا گزر گرنہ رکھتا ہو دستگاہ تمام  
 اسکے معذوب کے سرو تن سے کیوں نمایاں ہو صورت خدام  
 فرماتے ہیں۔ تیرے گزر کے مصوری و صورت گری آتی ہے اور اس من میں اسکو کمال  
 حاصل ہے۔ وہ ایک ضرب میں دشمن کے سرو تن کو اس طرح ملا دیتا ہے کہ او غام کی تصویر  
 آنکھوں کے رو بہ رو کھینچ جاتی ہے۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیالی و ایام  
 فرماتے ہیں۔ ازل کے دن جو احکام رات اور دن کے اوراق پر رقم ہوئے تھے۔  
 اور ان اوراق میں بکھلک قضا مجملہ مندرج ہوئے احکام  
 وہ محل طور پر رقم ہوئے تھے۔ ان احکام کی تفصیل ایہ آلا باد ملک ہوتی رہے گی۔  
 ان ہی احکام کی تفصیل میں یہ حکم بھی مندرج ہوئے تھے کہ

لکھد یا شاہدوں کو عاشق کش لکھد یا عاشقوں کو دشمن کام  
 عاشقوں کو عاشق کش لکھد یا اور عاشقوں کو دشمن کام لکھد یا۔ دشمن کام وہ شخص

دشمنوں کے حسب مراد خستہ و دل شکستہ نامراد ہو۔

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں گنبد تیز گرد نیلی نام  
 آسمان کی نسبت یہ حکم نافذ ہوا کہ لوگ اسکو گنبد تیز گرد نیلی نام سے مشہور کریں۔  
 حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں خال کو دانہ اور زلفت کو دام



اسی کے ساتھ یہ حکم بھی لکھا گیا کہ مشوق کے خال عارض کو دانہ اور زلف کو دام لکھیں  
 آتش و آب باد و خاک کے لیے وضع سوز و غم و رم و آرام  
 فرماتے ہیں۔ آگ پانی۔ ہوا، خاک کے حصہ میں۔ باتیں آئیں۔ کہ ان کی وضع سے سوز و غم  
 و رم و آرام ظاہر ہو رہا ہے۔ یعنی آگ کو سوز دیا گیا۔ پانی کو نمی عطا ہوئی۔ ہوا کو بھاگنا پھرنا ملا۔  
 خاک کو آرام بخشا گیا۔

مہر رخشاں کا نام خسرو روز ماہ تاباں کا اسم شمعہ شام  
 فرماتے ہیں۔ مہر رخشاں کو خسرو روز کا خطاب عطا ہوا اور ماہ تاباں کا نام کو توال شام قرار پایا  
 تیری توفیق سلطنت کو بھی دی بدستور صورت ارقام  
 فرماتے ہیں۔ تیرے فرمان سلطنت کو حسب ضابطہ صورت ارقام عطا ہوئی۔ دستور فارسی  
 میں مذکور کو بھی کہتے ہیں۔

کاتب حکم نے بموجب حکم اس رقم کو دیا طراز دوام  
 فرماتے ہیں۔ خاتمہ قدرت کے تیرے واسطے فرمان سلطنت لکھ کر اس پر دوام دولت کا طفرہ بنادیا  
 ہے اول سے روائی آغاز ہوا بدتک رسائی انجام  
 یہ شعر دعائیہ ہے۔ روائی امکان و جواز کے معنی پر استعمال ہوتا ہے۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں  
 میرزا صاحب کا یہ قصیدہ ان کے کمال شاعری کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ سو برس پہلے اردو زبان  
 میں ایسی تشبیہ ایسی ہیج کھنٹی جس کا جواب آج تک بھی کوئی نہیں لکھ سکا۔ کاردار کا مصداق ہے۔

## قصیدہ

صبح دم دروازہ خاور کھلا مہر عالم تاب کا منظر کھلا  
 فرماتے ہیں۔ صبح ہو گئی اور مشرق کا دروازہ کھل گیا۔ یعنی جس دریچہ سے مہر عالم تاب کا  
 جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ منظر ظاہر ہو گیا۔

خسرو انجم کے آیا صرف ہیں شب کو تھا گنجینہ گو ہر کھلا  
 فرماتے ہیں خسرو انجم یعنی آفتاب کی ضیاء میں ستارے چھپ گئے۔ گویا خوشیہ  
 تاباں نے گنج گوہ کو صرف کر دیا۔

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو راز مرہ و اختر کھلا  
 سیمیا وہ فن ہے جس کے ذریعہ سے اشکال وہی وغیرہ بھی نظر آتے ہیں فرماتے ہیں بڑے  
 اختر جو رات کو نظر آ رہے تھے صبح ہو جانے پر سیمیا کی اشکال کی طرح نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔  
 ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہر گز  
 دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا  
 فرماتے ہیں ستاروں کی اصل و حقیقت کچھ اور ہے اور نظر کچھ اور طریقہ پر آتے ہیں۔ گویا  
 ایسی قسم کے بازیگر ہیں جو کھلا ہوا دھوکا دیتے ہیں۔

سطح گردوں پر پڑا مختارات کھ  
 موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا  
 فرماتے ہیں سطح گردوں پر پڑا مختارات کھ  
 سے بنایا گیا تھا اور وہ قدر و قیمت میں ستاروں سے بہتر تھا۔ یہاں تشبیہ نے ستاروں کو آفتاب  
 روز سے زیادہ چمکا دیا ہے۔

صبح آیا جانب مشرق نظر اک نگار آتشیں رخ سر کھلا  
 فرماتے ہیں۔ شب کو تو آسمان پر یہ کیفیتیں نظر آ رہی تھیں اور صبح کو یہ دیکھا کہ آ  
 مشوق آتشیں رخسار برہنہ سانسے ہو جود ہے۔

تھی نظر بندی کیا جب رو سحر بادہ گارنگ کا سا غر کھلا  
 فرماتے ہیں۔ وہ نگار آتشیں رخسار گویا ایک جادو کا پتلا تھا۔ جب ہم نے رقص سحر کا عمل  
 پڑھا تو یہ ثابت ہوا کہ بادہ گارنگ کا سا غر ہے۔

لاکے ساتی نے صبوحی کیلئے رکھ دیا ہے ایک جام ز کھلا  
 ادبیں ساغر کو ساتی نے صبوحی کے واسطے لاکر رکھ دیا ہے جو ایک سونے کے جام کی

شکل میں بغیر سر پوش کے نظر آ رہا ہے۔

یزم سلطانی ہوئی آراستہ کعبہ امن و امان کا در کھلا

تشبیہ ختم ہوئی۔ گریز میں فراتے ہیں۔ کہ اس مقید میں صبح کا بیان صرت اس غرض سے کیا گیا تھا کہ جب صبح ہو گئی تو یزم سلطانی آراستہ ہو گئی۔ گویا امن و امان کے کعبہ کا دروازہ کھل گیا

تاج زریں مہرتاباں سے سوا خسرو آفاق کے منہ پر کھلا

منہ پر کھلنا۔ محاورہ ہے اس کے معنی زیب دینے کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ مہرتاباں کا تاج زریں اتنا زینبدہ نہ تھا جتنا بادشاہ عالم کا تاج زریں بادشاہ کے منہ پر زیب دیتا ہے

شاہ روشن دل بہادر شکستہ راز ہستی اس پہ ستراسر کھلا

فرماتے ہیں۔ میرا بادشاہ بہادر شاہ روشن دل ہے اور روشن دلی کی دلیل یہ ہے کہ ہستی کا راز اس پر تمام دگمال کھل گیا ہے۔

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

فرماتے ہیں۔ وہ ذات متوہ صفات ایسی ہے کہ جس کی تکوین میں نو آسمانوں اور ستاروں کا مقصد تخلیق ظاہر ہوتا ہے قدیم اساتذ کے ہاں اعلان نون بعد اضافة زیادہ صیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے عقدہ احکام پیغمبر کھلا

فرماتے ہیں۔ وہ ایسا بادشاہ ہے کہ اس کی تاویل کے ناخن سے عقدہ احکام پیغمبر کھل گیا ہے۔ ناخن تاویل اور عقدہ احکام دونوں استعارے ہیں۔

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام اسکے سرنگوں کا جب فتر کھلا

فرماتے ہیں۔ پہلے دارا کا نام نکلا ہے۔ جیسا کہ فوج کے سرنگوں کا دفتر کھولا گیا ہے مشہور ہے کہ دارا کے پاس بے انتہا فوج تھی اور سرنگ کے معنی ہر آول فوج یا مقدمۃ الجیش شکر کے ہیں۔

وٹنا سوں کی جہاں فہرست کے داں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا

فرماتے ہیں۔ اسکے رشتہ سوں کی یعنی جاننے والوں کی جہاں نہرست رقم ہے وہاں چہرہ  
قیصر یعنی حلیہ تیسرے وضع طور پر رکھا ہوا ہے۔ یہ ہیں یہ دونوں شعر بے مثل ہیں اور دونوں بادشاہ  
کی خصوصیت ان کے صفات کی وجہ سے لازمی اور ضروری تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور نام مثل  
سکنہ یا قیصر رقم کر دئے جاتے تو یہ دونوں شعر اپنے بلند درجوں سے گر جاتے۔

قطعہ

تو سن شہ میں ہے وہ خوبی کوہ      تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا  
نقش پاکی صیرتیں وہ دلفریب      تو کہے بت خانہ آذر کھلا

فرماتے ہیں۔ تو سن شہ میں وہ خوبیاں ہیں۔ کہ جب تھان سے وہ غیرت صرصر یعنی ہوا سے زیادہ  
چالاک گھوڑا کھلتا ہے۔ تو اس نقش پاکی میں ایسی دلفریب شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے دیکھے سے  
ثابت ہوتا ہے کہ آذرت تراش کا بت خانہ سانسے نمودار ہو گیا ہے۔

مجھ پہ فیض تربیت کے شاہ کے      منصب مہر و مہر و محور کھلا  
فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی تربیت سے مجھ کو یہ علم حاصل ہو گیا ہے کہ آفتاب کا منصب اہم ماہ کا  
عہدہ اند محور کی حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے۔ محور اس لکیر کو کہتے ہیں جو کرۂ مقرر کے درمیان  
میں یعنی کرۂ قطبین کے بیچ میں سوہوم سی ہوتی ہے۔

لاکھ عقدے لیس لیکر ایک      میری حد سے باہر کھلا  
فرماتے ہیں۔ میری لاکھوں شکلیں جن کا حل ہوتا میری استطاعت اور قدرت سے باہر  
تھادہ آسانی سے حل ہو گئیں۔

مقادیر وابستہ قفل بے کلید      کس نے کھولا۔ کب کھلا۔ کیونکر کھلا  
فرماتے ہیں۔ میرا دل وابستہ تو ایک ایسا قفل تھا کہ جس میں کوئی کنجی ہی نہیں لگتی تھی۔ مجھ کو  
حیرت ہے کہ اس قفل کو کس نے کھولا اور یہ کب کھلا اور یہ کس طرح کھل گیا۔  
باغ معنی کی دکھائوں گا بہار      مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھلا



کھلنے کے معنی بے تکلف ہو کر باتیں کرنے کے ہیں۔ گریباں اسکے دوسرے معنی لئے گئے ہیں۔  
 فرماتے ہیں۔ باغ معنی کی بہار دکھاؤں گا۔ اگر بادشاہ نے میرے حال پر نگاہ توجہ فرمائی۔

ہو جیاں گرم غزلخواہی نفس      لوگ جانیں طبلہ عنبر کھلا

فرماتے ہیں میراجی چاہتا ہے کہ اس موقع پر میں ایک غزل بھی سنائی شروع کر دوں اور  
 میرے مضامین کی خوشبو سے لوگوں کو یہ گمان گندے کہ عنبر کا ڈپہ کھول دیا گیا ہے۔

غزل

کنج میں میٹھا رہوں یوں کھلا      کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا

فرماتے ہیں۔ انوس بے کنج قفس میں اس طرح سے میں پر کھلا ہوا بیٹھا رہوں۔ کاش قفس  
 کی کھڑکی کھلی ہوئی ہوتی اور میں اڑ جاتا۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جا      یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

فرماتے ہیں۔ ہمارا اعزاد یہ چاہتا ہے کہ ہم یار کے دروازے پر جا کر آواز دیں اور ہمارے  
 واسطے دروازہ کھولا جائے۔ ایسی حالت میں ہمارے چلنے کا لطف ہے۔ یوں ہماری بلا جاتی

ہے کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر ہم جا کر شریک صحبت ہو جائیں۔ اس طرح عام لوگ جاتے ہیں  
 ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ      دوست کلبے راز دشمن پر کھلا

فرماتے ہیں۔ انوس بے ہم کو ایسی رازداری پر گھمنڈ ہے اور ہم ہی سمجھتے ہیں۔ کہ سو ہمارے  
 کوئی شخص راز دوست سے آگاہ نہیں ہے۔ حالانکہ دوست کا راز دشمن پر کھل گیا ہے  
 تفس ہے ہماری رازداری پر۔

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ      زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

فرماتے ہیں۔ کہ سچی بات تو یہ ہے۔ کہ دل پر داغ بہت ہی زیب دیتا تھا۔ لیکن زخم  
 داغ سے بھی ٹھیکہ کر نرمیدہ ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں زخم کا کھلتا۔ ایک دوسرے معنی بھی دیتا ہے  
 جس کا لطف اس لطف معنی سے بالاتر ہے۔

ہاتھ سے رکھ دی کہ اپنے زکمان      کب کمر سے عمرہ کا ٹنجر کھلا

ابو جو خود کمان سے مشابہ ہے اسکو کماندار کہتا اور غمزہ جو خنجر سے تشبیہ دیجاتی ہے اسکو  
خنجر گزاری کہنا میرزا صاحب کی جدت طبع کی دلیل ہے۔ مطلب شعر کا سناٹ ہے یعنی ابرو نے۔  
اور غمزہ دوست ہر وقت ہمارے قتل کے لیے رہتے ہیں۔

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ رہروی میں پر وہ رہبر کھلا  
بدرقہ کے معنی رہبر اور نگہبان قافلہ کے ہیں۔ فرماتے ہیں مفت کا رہبر کس کو برا معلوم ہوتا ہے  
باوجودیکہ رہروی میں رہبر کا بھرم کھل گیا یعنی ہم نے یہ جان لیا کہ وہ آٹھائے منزل مراد ہے  
لیکن بھر بھی ایک آدمی تو ساتھ چلنے کے لئے بغیر داموں کامل گیا۔ کیا برا ہے۔

سوز دل کا کیا کرے باران اشک آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا  
فرماتے ہیں۔ باران اشک سوز دل کو گیونکر بھیاسکتا ہے۔ جب یہ حالت ہو کہ اگر  
مینہ برسنا دم بھر کے واسطے بند ہو جاتا ہے۔ تو آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رونے  
سے دل کی تشنگی رہتی ہے۔ اور آتش بند ہوئے اور آدھروں میں شعلہ بھڑکا۔

نامہ کیساتھ آگیا پیغام مرگ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا  
شادی مرگ ہو جانے کو کس سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی  
میرزا صاحب کے نشتروں میں کاشتر ہے۔

دیکھو غالب سے گرا کھجا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا  
فرماتے ہیں۔ خبردار اگر کوئی غالب سے الجھے گا تو وہ اس کے دھڑے بھیر دینگا۔  
پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال پھر وہ پوشیدہ کا دھڑکھٹلا  
فرماتے ہیں۔ پھر مدح سلطان کی طرف طبیعت رجوع ہوئی اس مدح کے شعر لکھنے  
شروع کئے اور ایک ایک شعر چاند سورج کا مقابلہ کر رہا ہے۔

خامہ نے پانی طبیعت سے مدد دوایاں بھی اٹھتے ہی نگر کھلا  
فرماتے ہیں قلم اٹھاتے ہی طبیعت شعر گوئی کی طرف رجوع ہو گئی۔ گویا اوپر جہاز کا لنگر

اٹھایا اور ادھر بادشاہ کھل گیا۔ بھرسنی میں کشتی سخن رواں ہو گئی۔

مدح سے مدح کی دیکھی شکوہ عرض سے یاں رتبہ جو ہر کھلا  
فرتے ہیں۔ یہاں مدح سے مدح کی شان و شکوہ ظاہر ہو گئی۔ گویا عرض سے جو ہر کا  
رتبہ کھل گیا۔ جو ہر کا لفظ یہاں درجے بہا سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

مہر کا نیا چرخ چکر کھا گیا بادشاہ کا رایت لشکر کھلا  
فرتے ہیں۔ آفتاب نشان شکر کے رعب دابے لڑاں ہو گیا اور آسمان کو چکر آنے لگے۔  
بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علو پایہ منبر کھلا

فرتے ہیں۔ منبر کا رتبہ اس سبب بلند ہے کہ اس پر خطیب بادشاہ کا نام خطبہ میں پڑھتا ہے۔  
سکہ شہ کا ہوا ہے دشناس اب عیار آبرو کے زر کھلا

فرتے ہیں زر و سیم کی آبرو اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ اس پر بادشاہ کا سکہ ہے۔  
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب مال سی اس کند کھلا  
فرتے ہیں۔ شاہ کے رو برو آئینہ رکھا ہوا ہے۔ اتنے برسوں کے بعد جا کر سکندر کی کوش

کا نتیجہ ظاہر ہوا ہے۔ یعنی اس نے اسی آئینہ داری کی تمنا میں آئینہ بنایا تھا۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق اب فریب طفل و خسر کھلا

فرتے ہیں۔ ملک کا وارث خاص میر احمد روح ہونا چاہئے تھا۔ اب کہیں جا کر حق بختدار رسید

کا موقع ہاتھ آچکا ہے طفل اور خمر جو بادشاہ بن بیٹھے تھے وہ ان کا فریب تھا۔ جواب کھل گیا۔

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے دفتر مدح جہاں داور کھلا

فرتے ہیں۔ خوش نصیبی سے میرا نام اس کے ممدوں میں مشہور ہو گیا ہے۔ اور لوگ جانتے

ہیں۔ کہ اس نے دفتر کے دفتر بادشاہ کی مدح میں رقم کر دی ہے۔ لیکن جیسی مدح رقم ہونی چاہئے  
تھی۔ وہ مجھ سے رقم نہ ہو سکی۔

فکر اچھی پرستائش نام تمام عجز اعجاز ستائش گر کھلا

فرماتے ہیں۔ فکر تو چھٹی ہے لیکن مدح نامہ تمام ہے۔ وہ پوری پوری ادا نہیں ہو سکی۔ اعجاز مدح کا عجز ظاہر ہو گیا۔ فکر کے کامل تر ہونے سے اعجاز سیانی کا دعویٰ کرنا اور مدح کے نامہ تمام رہ جانیسے عجز کا اظہار کرنا یہ دونوں باتیں اس شعر میں ایسی بدیع و نادر اور اس خوبی کے ساتھ ادا ہوئی ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

جانتا بول خط لوح ازل تم پہ اسے خاقان نام آور کھلا  
 فرماتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ تم یہ لوح ازل کا حال واضح اور منکشف ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ میرا حال بھی تم سے پوشیدہ نہ ہو گا۔ اس صورت میں مجھ کو کیا ضرورت ہے کہ میں عرض حال کروں  
 تم کرو صاحبقرانی جب ملک ہے طلسم روز و شب کا در کھلا  
 فرماتے ہیں۔ خدا کرے تم اس وقت تک صاحبقرانی کرتے رہو جب تک طلسم روز و شب کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ صاحبقران فاتح اوطیل القدر یا دشاہ کو کہتے ہیں۔ عقلی معنی صاحبقران کے یہ ہیں کہ وہ بادشاہ جو قرآن عظمیٰ کے وقت پیدا ہو۔

مثنوی

ہاں دل دردمند ہر مزہ ساز کیوں نہ کھولے درخزینہ راز  
 فرماتے ہیں۔ اے دل دردمند اور ہاں اے دل زرمزہ ساز تو کیوں نہ کھولے درخزینہ راز  
 خلمے کا صفحہ پر رواں ہوتا شاخ گل کا ہے گلشنال ہوتا  
 فرماتے ہیں۔ فکر سخن کے وقت خامرہ کا صفحہ کا قذیر چلنا بیضا ایسا ہے جیسے شاخ گل سے بہار کے موسم میں پھولوں کا جھرنما۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے لکھتے رہائے خرد و فرا لکھئے  
 اپنے دل سے کہتے ہیں کہ تو مجھ سے یہ کیا دریافت کرتا ہے کہ کیا لکھتا چلے بنے عقل پڑھا  
 والے نکات لکھنے چاہئیں۔

بارے آموں کا کچھ بیان ہو جائے خامرہ تھل رطب نشان معبائے



پھر سوچ کر جواب دیتے ہیں۔ کہ اچھا آموں کی کچھ تعریف لکھنی چاہئے اور ایسی خوبی کے ساتھ  
لکھنی چاہئے کہ خامہ نخل دھب نشان کا دم مقابل بخائے یعنی بہت ہی شہس مفاہین رقم ہو۔  
آم کا کون مرد میدان ہے      مٹرو شاخ گوئے چوگاں ہے  
فرماتے ہیں۔ آم کا کون مرد میدان یعنی دم مقابل کون ہے۔ مٹرو شاخ گوئے و چوگان  
کا حکم رکھتے ہیں۔

تاک کے جی میں کیوں سجار مان      آئے یہ گوئے اہر یہ میدان  
فرماتے ہیں۔ انگور کی پیل کے جی میں کیوں در مان باقی رہے میدان کارزار میں تاک  
آم سے چوگان بازی کر لے۔

آم کے آگے پیش جائے طاک      پھوڑتا ہے جلے پھولے تاک  
فرماتے ہیں۔ آم کے آگے پیش تو خاک بھی نہیں جاتی۔ لینے جلے ہوئے دل کے پھولے  
تاک انگور پھوڑتا ہے۔

نہ چلا جب کسی طرح مقدور      بادۂ ناب بن گیا انگور  
فرماتے ہیں۔ جب کسی طرح آم کا مقابلہ نہ کر سکا تو انگور ہار کر شراب ناب بن گیا۔  
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے      شرم سے پانی پانی ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ انگور کا بادۂ ناب بن جانا گو یا شرم منگی سے پانی پانی ہو جانا ہے اور میوہ  
سے انگور اپنی جان کھوتا ہے۔

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے      آم کے آگے نیشکر کیا ہے  
فرماتے ہیں مجھ سے پوچھو تم ابھی اس کی حقیقت سے خبردار نہیں ہو۔ آم کے سامنے  
نیشکر ایک بے قدر چیز ہے۔

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار      جب خزاں آئے تب اسکی بیاباں  
فرماتے ہیں۔ گلے میں نہ پھول آتا ہے نہ اس میں شاخیں ہیں نہ پتے ہیں نہ پھل ہیں۔

ان سبک زیادہ برائی کی بات یہ ہے۔ کہ خزاں کا موسم اس کی بہار کا زمانہ ہے۔

اور دوڑائے قیاس کہاں جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

فرماتے ہیں۔ اور کہاں قیاس دوڑا کر آم کی شیرینی کا جواب پیا گیا جائے۔ جان کو سیر  
بیان کیا جاتا ہے۔ مگر اس میں ایسی مٹھاس کہاں ہوتی ہے۔

جان میں ہوتی گریہ شیرینی کو کہن باوجود غم گینی

فرماتے ہیں۔ اگر جان میں ایسی شیرینی ہوتی تو کو کہن یعنی فراد باوجود غم گینی ہونے کے

جان دینے میں اسکو کیٹا جان پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

جان دینے میں اسکو کیٹا رورنگار اور بے مثل زمانہ فرض کر لیا جائے تو بھی وہ اس

آسانی سے جان نہ دے سکتا یعنی اگر جان میں شیرینی ہوتی تو وہ اس آسانی سے جان نہ دیتا

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ٹمر کہ دواخانہ ازل میں مگر

تجہ کو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ٹمر یعنی آم دواخانہ ازل کا بتایا ہوا ہے اور یہ سطح پتیا گیا ہے کہ

آتش گل پہ قند کا ہے قوام شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

آتش گل پر قند کا قوام لپکا یا گیا ہے۔ اور شیرے کے تار کا نام ریشہ رکھ دیا ہے۔

یا یہ ہو گا کہ فرط راقۃ سے باغبانوں نے باغ جنت کے

یا یہ بات ہو گی۔ کہ جوش محبت سے باغبانوں نے باغ جنت سے

انگیں کے حکم رب الناس بھر کے بھیجے ہیں سر مہر گلاس

شہد کو خدا تعالیٰ کے حکم سے گلاسوں میں بھر کر اور ان پر مہر لگا کر دنیا میں بھیج دیا ہے۔

یا لگا کر حضرت نے شاخ نبات مدتوں تک دیا ہے آب حیات

یا یہ بات ہے۔ کہ حضرت نے شاخ نبات لگائی ہے اور مدت تک اس میں آب حیات دیا ہے

تب ہر اسے ٹمر شاخ یہ نخل ہم کہاں ورنہ اور کہاں نخل

جب جا کر کہیں یہ درخت پھل لایا ہے۔ ورنہ ہم کہاں اور یہ نخل کہاں۔

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس رنگ نازد پر کہاں بوباس  
آم کو دیکھتا اگر ایک بار پھینک دیتا پلائے دست افشا

بیان کیا جاتا ہے کہ خسرو پر دینے کے پاس اس قسم کا کندن تھا کہ ہاتھت دبا کر پوچھنے  
اسکی چاہت تھے بتا لیتے تھے۔ پر دینے اسی کا ترنج بنوایا تھا۔ کھانے کے وقت وہ ترنج و ستر خوان  
پر رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد کسرانے اسی سولے کا ساگ بنوایا۔ اور ستر خوان کی زینت اور  
آرائش کا اس سے کام لیا۔ دست افشا اسی واسطے میرزا صاحب لکھتے ہیں کہ وہ سونا موم کی  
طرح دبائے سے دب جایا کرتا تھا باقی دونوں شعروں کے معنی صاف ہیں۔

رونق کارگاہ برگ و نوا نازش دو دمان آب و ہوا  
برگ نوا سامان کے معنی پر بھی استعمال ہوتا ہے اور برگ کا لفظ درخت کے ساتھ میں بھی  
مناسبت رکھتا ہے۔ اور نوا سے طائران خوش الحان کی آواز بھی مراد ہے۔

رہبر و راہ فلد کا گوشہ طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ  
فرماتے ہیں۔ آم رہبر و راہ فلد کا گوشہ بھی ہے۔ اور طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ بھی ہے  
مراد یہ ہے کہ آم کھانے کھاتے اگر انسان مر بھی جائے تو سیدھا جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ اور  
طوبی اور سدرہ بھی دانہ کنبہ کو عزیز رکھتے ہیں۔

صاحبشاخ و برگ بار ہے آم ناز پروردہ بہار ہے آم  
فرماتے ہیں۔ آم بڑا سا زہ سامان رکھنے والا پھل ہے اور بہار نے بڑے نازوں کے  
اسکو پالا ہے۔ مصرعہ ثانی کی داد کچھ اہل زبان ہی دے سکتے ہیں۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو نوبر تخیل باغ سلطان ہو  
یہ وہ باغ باغ سلطان مشہور تھے جن میں ایک باغ کا نام بلخ حیات بخش تھا۔ اور دوسرے  
باغ کا نام بہتاب باغ تھا۔ باغ حیات بخش قلعہ معلی کے اندر تھا۔ اور بہتاب بلخ زیر فیض کھائی  
کے اوپر واقع تھا۔ ان باغوں کا آم سلاطین اور بیگمات کے علاوہ کسی کو کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا

ان باغوں میں بہت درخت ابو ظفر بہادر شاہ آخرا بادشاہ دہلی کے ہاتھ کے لگائے ہوئے تھے میرزا صاحب اس شعر میں انہیں باغوں کے آموں کی نسبت نو بہر نخل باغ سلطان خطاب کر کے لکھتے ہیں وہ کہ ہے والی ولایت عہد عدل سے اسکے ہے حمایت عہد فرماتے ہیں۔ وہ بادشاہ کہ ولایت عہد و پیمان کا وارث ہے اور اسی کے عدل انصاف سے زمانہ و وقت کی حمایت ہے۔

مخبر میں عز و شان جاو جلال زینت طینت و جمال و کمال فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کی ذات و الما صفات دین کے واسطے باعث مخر و عزت اور جہا و جلال کی شان اس سے بڑھ گئی ہے اور نیک طینتی کی وہ زینت ہے اور کمال کے واسطے وہ جمال کا حکم رکھتا ہے۔

کار فرمائے دین دولت و بخت چہرہ آرائے تاج و مسند تخت فرماتے ہیں۔ دین و دولت و بخت کا وہ بادشاہ ہے اور تاج و مسند و تخت کی عزت میں اس نے اضافہ کر دیا ہے۔

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے فرماتے ہیں۔ اس کے سایہ میں جو شخص آجائے وہ بادشاہ بن جائے اور مخلوق کے سر پہ وہ ظل اللہ کا حکم رکھتا ہے۔

اے مفیض وجود سایہ و نور جب تملک ہے نمود سایہ و نور  
ابن خداوند بندہ پرور کو وارث گنج و تخت و افسر کو  
شاہ و دولت شاہ دماں رکھو اور غالب پہ مہرباں رکھو  
یہ تینوں شعر دعائیہ ہیں۔ اور مطلب ان کا صاف ہے۔





# قطعات

اے شہنشاہ فلکِ مطر وِیشل وِ نظیر اے جہاندارِ کرم شیوے شہِ عدیل  
 فرماتے ہیں۔ اے شہنشاہِ فلک کہ تیرے توبے مثل اور بنظیر ہے۔ دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں۔ ۳  
 بادشاہِ تیری عادتِ کرم کرنے کی ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تو عادل زمانہ ہے۔  
 پانوں کے تیرے ملے فرقِ ارادت اور رنگِ فرقِ تیرے کسبِ سعادتِ اعلیل  
 فرماتے ہیں۔ تحتِ شاہی تیرے قدموں سے اپنا سرِ ارادت ملتا رہتا ہے۔ اور تیرے سرِ قدس  
 سے تاجِ شہی سعادت حاصل کرتا رہتا ہے۔

تیرا اندازِ سخن شانہ زلفِ الہام تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ حیرِ ایل  
 فرماتے ہیں تیری گفتار میں یہ اعجاز ہے کہ الہامی حقیق باتوں کو ابھی ہوئی باتوں کی  
 طرح سلجھا دیتی ہے اور تیرے قلم کی رفتار بازوئے حیرِ ایل کی جنبش بھی جاتی ہے۔  
 تجھ سے عالم پہ کھلا رالِ بطہِ قربِ کلیم تجھ سے دنیا میں بچھا ماندہ بدلِ خلیل  
 فرماتے ہیں۔ جن لوگوں نے قربِ کلیم اور بدلِ خلیل کی کیفیت صرف کانوں سے سنی تھی  
 آنکھوں سے نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے تیری وجہ سے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ کہ تیری ذات  
 میں یہ دونوں صفتیں نظر آتی ہیں۔

بسُخنِ اوجِ دو مرتبہ معنی و لفظ بحکمِ دلِ سخ نہ ناصیہ قلم و نیل  
 فرماتے ہیں۔ تیرے کلام سے سنی و لفظ کا توبہ بلند ہو جاتا ہے اور تیرے کرم سے یعنی تیرے  
 جو خوشش سے دیا نئے قلم و دریا نئے نیل شراب جلتے ہیں

تاترے وقت میں ہوش و طرب کی توفیر تاترے عہد میں ہورج و علم کی تقیل  
 ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر زہرہ نے ترک کیا حوت سے کزنا تول  
 فرماتے ہیں اس لئے کہ تیرے وقت میں عیش و طرب کی ترقی ہو۔ ماہ نے برجِ ثور سے باہر

نکشنا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس واسطے کہ تیرے زمانہ میں رنج و الم کم ہو جائے۔ نہرہ نے  
برج حوت میں داخل ہونا ترک کر دیا ہے

تیری دانش میری اصلاح مفاسد کی ہیں  
تیرا اقبال ترحم میرے جینے کی نوید

یہاں اقبال کے معنی التفات کرنے کے ہیں۔ باقی دونوں شعروں کا مطلب صاف ہے۔

بخت ناساز نے چاہا کہ شے مجھ کو امان  
جس خ کیا ز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

فرماتے ہیں۔ میری بد نصیبی یہ چاہتی ہے کہ مجھ کو کہیں امن و امان میر نہ آئے۔ اور آسما

کی گرجشیں یہ چاہتی ہیں کہ مجھ کو ذلیل کریں۔

پچھے ڈالی ہے سررشتہ اوقات میں گانٹھ  
پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تیر میں کیل

مطلب یہ ہے۔ کہ پہلے ناخن تیر کو ناقابل عقدہ کشائی کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد

سررشتہ اوقات میں گرہ لگائی ہے۔

تپش دل نہیں بے رابطہ خوفِ عظیم  
کشش دم نہیں بے ضابطہ جبرِ ثقیل

فرماتے ہیں تپش دل خوفِ عظیم سے خالی نہیں ہے میرے واسطے سانس لینا بھی جبرِ ثقیل

سے کم نہیں ہے۔

ہر معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی  
غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زمیں

فرماتے ہیں۔ معنی کے موتیوں سے میرا عقدہ تحریر لقا کی ڈاڑھی بن گیا ہے (بیان کیا جاتا ہے

کہ لقا ڈاڑھی کے بالوں میں موتی پرویا کرتا تھا) اور دنیا کے غموں سے میرا سینہ عمر عیار کی

زمین بن گیا ہے۔ عمر عیار کی زمین کی نسبت و اٹان گویا کرتے ہیں۔ کہ ساری دنیا کی چیزیں

اس میں رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ زمین عمر بجائے خود ایک دوسری دنیا بنی۔ گویا میرے سینہ میں

غم گیتی کی اسی طرح سمائی ہے جس طرح عمر عیار کی زمین میں اشیاء عالم کی۔

فکر میری گہرا اندوز اشارات کثیر  
کلمہ میری رقم آموز عبارات قلیل

فرماتے ہیں۔ میں نے اپنی عبارت قلیل میں اشارات کثیرا ذکر دئے ہیں۔ مطلب یہ ہے  
گو میں نے اپنا مختصر حال عرض کیا ہے۔ اور وہ بھی صاف صاف بیان نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی اشارات  
کثیر اس میں ایسے موجود ہیں جس سے میری مصیبتوں کا حال تمام و کمال مفصل و مشروح آپ  
سمجھ سکتے ہیں۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدیق توفیق میرے اجمال سے کرتی ہے تراش و تفصیل  
فرماتے ہیں میں ایسا جادو بیان شاعر ہوں۔ کہ میرا مہم حال بیان کیا ہوا۔ توفیق سے بڑھ کر  
ظاہر ہوتا ہے۔ اور میرے محل بیان سے تفصیل پڑی ٹپک رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری  
عبارت کے الفاظ قلیل ہیں اور معنی کثیر۔

نیکوئی مری عادت تو نہ دیتا تکلیف جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تبھیل،  
فرماتے ہیں۔ اگر مجھ کو مصائب کا سامنا نہ ہوا ہوتا تو میں حضور کو تکلیف نہ دیتا۔ اور مصائب  
سے میرا دل اگر پریشان نہ ہو جاتا تو میں زور و طلبی کو کام میں نہ لاتا۔

قبلہ کون و مکان خستہ نوازی میت دیر کعبہ امن اماں عقدہ کشائی میں یہ دھیل  
سارے قطعہ کا لب لباب یہ شعر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ معنی صاف۔

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے  
یہاں تقریر کہنا بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو فارسی محادثہ تقریر کردوں  
کا ترجمہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ وہ دن تو گزر گئے کہ تم ناجائز بہ کاری سے غیروں کی وفاداری کی تعریف  
بیان کیا کرتے تھے اور ہم خاموش بیٹھے ہوئے سا کرتے تھے اور اپنے دل میں جلا کرتے تھے۔  
بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی جانید لجاؤ قسم لوہم سے گم یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے  
فرماتے ہیں۔ بس اب ان سے بگڑ گئی ہے۔ تو ہم سے تم کیوں شرمندگی کی وجہ سے نہیں  
ملتے۔ اوّل جاؤ۔ ہم قسم کھاتے ہیں۔ کہ تم سے یہ بات بھی نہ کہیں گے۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ یہ لوگ  
بے وفائیں ہم سے بے وفائی کر چکے۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں  
وہ سبز فراہ ہے مظر کہ ہے غضب  
اک تیر میرے سینہ میں، اراکے پائے  
وہ ناز میں تہاں خود آراکے پائے  
طقت رُہا وہ ان کا اشارہ کہ پائے  
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ دودا

حفت نظر کے معنی چشم بدور کے ہیں۔ باقی شعر صاف ہیں۔

ہے جو صاحب کے کف دست پر یہ چکنی ڈلی

زیب دیتا ہے اسے جیتہ اچھا کہئے

اس قطعہ کی نسبت حضرت استاد می مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب طائی یادگار غالب میں  
تقریر فرماتے ہیں: شاعرین جیکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ مولوی محمد عالم  
مرحوم نے جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے۔ نواب صاحب بیان کیا کہ جس زمانہ میں میرزا  
صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک مجلس میں جہاں میرزا بھی موجود تھے۔ اد میں بھی حاضر تھا شعر  
کا ذکر ہوا۔ ہاتھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ میرزا نے کہا فیضی کو ویسا  
لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے اس پر بات بڑھی اس شخص نے کہا فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے رو بہ رو گیا  
تھا اس نے ڈھائی سو شعروں کا قصیدہ اسی وقت ارتحال اکبر کر پڑھا تھا۔ میرزا بولے اب بھی اٹھ  
کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بدلتے کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے  
جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال بتلی پر رکھی اور میرزا سے درخواست کی۔ کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد  
میرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا اور وہ یہی قطعہ ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

فرماتے ہیں۔ خامہ انگشت بدنداں معنی حیرت میں مبتلا ہے کہ اس چکنی ڈلی کو میں کیا لکھوں

اور ناطقہ سر بگریبان معنی فکر و تشویش میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کو کیا کہنا چاہئے۔

مہر مکتوب عزیزان گرامی لکھئے

حرز بازوئے شگرفان خود آرا کہئے

فرماتے ہیں اس کو کسی کے نامہ شوق کی جہر سے مشابہ لکھنا چاہئے۔ یا کسی معشوق شوخ و



شنگ کے بازو کا تعویذ سمجھنا چاہئے۔  
 مسی آلودہ سر انگشت حسناں لکھئے      داغِ طرفِ جگر عاشق شیدا کہئے  
 چھٹکلیا کے پاس کی انگلی سے جو رتیں سی ملا کرتی ہیں۔ اور سی کے رنگ سے انگلی کی پوربونی  
 رنگ کی ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں حبیبوں کی سی آلودہ پورا سکو لکھنا چاہئے یا داغِ جگر عاشق  
 شیدا قرار دینا مناسب ہے۔

خاتمِ دستِ سلیمان کے مشابہ لکھئے      سرِ پتان پر یزاد سے مانا کہئے  
 فرماتے ہیں۔ ایک تشبیہ تو اس کی یہ ہے کہ خاتمِ دستِ سلیمان اسکو لکھا جائے اور  
 دوسری تشبیہ یہ ہے کہ پتان پر یزاد کی بھٹی کیا جائے۔

آخر سوختہ قیس سے نسبت دیجئے      خالِ مشکین رخِ دکشیلے کہئے  
 یا اس کو قیس کے آخر سوختہ سے نسبت دینی چاہئے۔ یا خالِ مشکین جو رخِ یلی پر تھا  
 وہ اس کو سمجھنا چاہئے۔

حجرِ الاسود دیوارِ حرم کیجئے فرض      نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہئے  
 یا اس کو حجرِ الاسود فرض کرنا چاہئے۔ یا آہوئے ختن کا نافہ کہنا چاہئے۔  
 وضع میں اسکو اگر سمجھئے قافِ تریاق      رنگ میں سبزہ نوخیز سیجا کہئے  
 یہ شعر صاف ہے۔

صومعہ میں اسے کٹھہر لائے گر مہرِ نماز      میکدے میں اسے خشتِ غم مہیا کہئے  
 فرماتے ہیں۔ عبادت خانہ میں اسکو سجدہ گاہ کا رتبہ حاصل ہے۔ تو بخانہ میں خشت  
 پائے سر غم کا رتبہ رکھتی ہے۔

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھئے      کیوں اسے نقطہ پر کارِ تمنا کہئے  
 کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجئے      کیوں اسے مردکِ دیدہ عطا کہئے  
 کیوں اسے تکرہ پیرا بن لیلے کہئے      کیوں اسے نقشِ پے ناقہ سلما کہئے

فارتی میں تم گھنڈی کے معنی استعمال ہوتا ہے اور میرزا صاحب نے اسی معنی پر تم کو لفظ بڑ  
بندہ پرور کے کفر بست کوئل کیجئے نذر اور اس حکمتی سیاری کو سویدا کہئے۔

—————

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضور والا نے مجھے جو بھی ہے میں کی روغنی روٹی  
نہ کھاتے گیہوں نکلنے نہ خلد سے بار جو کھاتے حضرت آدم یہی روٹی  
جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر صاحبین اور اہل دیار کے لئے بطور دلوش  
کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکر میں کبھی کبھی مینا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزارتے  
تھے یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے جو وقت چوہا بادشاہی یہ دلوش لے کر آیا۔ ایک یاہر کار بنے  
والا طالع علم چو میرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا۔ چوہا کے چلے جانے کے بعد اس سے  
متعجب ہو کر پوچھا۔ کہ مینی روٹی ایسی کیا؟ اور چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور دلوش کے تقسیم  
ہوتی ہے۔ مینر نے کہا۔ ارے حق چنا وہ چیز ہے۔ کہ اس نے ایک فوج جناب الہی میں خیراد کی تھی کہ دنیا  
میں بھیر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ تجھے دیتے ہیں۔ پیتے ہیں۔ بھونتے ہیں۔ پکاتے ہیں۔ اور مجھ سے سبکدوش  
چیزیں کھانے کی بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے۔ ایسا کسی نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا  
کہ اے چنے تیری خیرا سی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے۔ ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے  
کہ کچھ کو کھا جائیں۔ (از یادگار غالب)

خوش ہواے بخت کہ ہے آج شکر سہرا باندہ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا  
یہی سہرا ہے جس کے جواب میں استاد ذوق نے بھی سہرا لکھا ہے۔ اور مقطع میں جو  
کی ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ چوٹ کا جواب دیا ہے۔ معنی صاف ہیں۔

کیا ہی اس چاند سے گھڑے پہ بھلا لگتا ہے ترے کن دل افروز کا زیور سہرا  
فرماتے ہیں کہ سقراط اس طالع سے چہرہ بڑھا معلوم ہوتا ہے گویا سہرا تیرے حسن و لاوینہ کیلئے زیور کا اور ہے  
سر پہ چڑھنا تجھے چھتا ہے پرلے طرف گلاہ مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لبر سہرا

فراتے ہیں۔ اسے گوشتہ کلاہ تجھ کو یہ سرفرازی مبارک ہو کہ تو نواشاہ کے سر تک پہنچ گیا ہے۔ مگر تجھ کو یہ خوف ہے کہ تیرے درجہ اور مرتبہ کو سہرا چھین نہ لے  
 ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لٹکا کر سہرا  
 میرا صاحب کی نزاکت معنی اس شعر میں اپنی آب و تاب دکھا رہی ہے۔ مطلب صاف  
 ہے اور کوئی بات شرح طلب نہیں۔

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی تب بتا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا  
 گویا سہرے میں اتنے موتی پروئے گئے ہیں کہ جب تک ہفت قلم کے گوہر آباد  
 جمع نہ کئے جائیں اس وقت تک گز بھر کی لڑی بھی سہرے کی نہیں بن سکتی۔  
 رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا سے رگ ابر گہر بار بار اس سہرا  
 فراتے ہیں۔ دولہا کے رخ پر جو گرمی سے پسینے کے قطرے جمع ہو گئے ہیں۔ ان کے  
 دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابر نیلیاں بار موتی برسا رہے ہیں ہر کی لڑی نہیں ہے بلکہ رگ بار  
 یہ بھی پاک بے ادبی تھی کہ قبا سے ٹپھجائے رنگیا آن کے دامن کے برابر سہرا  
 جی میں تراشیں موتی کہ ہیں ہیں اک چیز چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا  
 یہ دونوں شعر صاف ہیں معنی میں کسی قسم کی دقت نہیں ہے۔

جبکہ اپنے میں سمانیں نہ خوشی کے مارے گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کنیڈ کر سہرا  
 کلیوں کا کھلنا گویا قبائے گل کا جوش مسرت سے چاک ہو جانا ہے۔ ایسی صورت  
 میں سہرے کا گوندھا جانا دشوار ہو گیا ہے۔

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ اختر سہرا  
 رخ روشن کو فروغ: یہ سے اور گوہر غلطاں کو ستاروں کی چمکے تعبیر کیا ہے۔ باقی شعر کا مطلب صاف  
 ستارے شمع کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار لائیکا تاب گراںباری گوہر سہرا  
 نکلے ہیں۔ یہ شیم کا تا نہیں ہے۔ رگ ابر بہار ہے۔ شیم کا تا اتنے بڑے بڑے موتیوں کو کب سنجال سکتا ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں، دیکھیں اس سہجے سے کہتے کوئی بہرہرا

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ میرزا جو ان بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر ان کی وسیعہ دی گئی۔ گوشت کر رہے تھے۔ نان کی شادی کا موقعہ آیا بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایسا سے غالب نے یہ سہرا کہہ کر زنگار کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزرا۔ ناچ سہرا کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال ملکہ ملال ہوا۔ استاد مرحوم چوبیس معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا۔ کہ استاد بس تو دیکھو۔ انہوں نے پڑھا اور بوجہ عادت کے عرض کی۔ پرو مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا۔ تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی نکھدو۔ اور کہا مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی حضور دیکھا۔ عرض بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

آج چین وسادات کا تر سر سہرا  
کشتی زریں میں نہ تو کی لگا کر سہرا  
رخ پرنور پہ ہے تیرے منور سہرا  
دیکھے کھڑے پہ جو تیرے منہ اختر سہرا  
گو نہ ہے سورہ اخلاص کو پڑھا کر سہرا  
گائیں مرغان نواسخ نہ کیونکر سہرا  
تا سہا شل سے بنا ایک سرا سہرا  
سرو دستار ہے دستار کے اوپر سہرا  
تیرا بنوایا ہے لے لیکے جو گوہر سہرا  
اللہ اللہ سے پھولوں کا سطر سہرا  
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا  
کھول دے منہ کو جو توست سے اٹھا کر سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر سہرا  
آج وہ دن ہے کہ لائے دراجم سے فلک  
تا بش حسن سے مانند شعاع قورشید  
وہ کہے صلی علی یہ کہے سبحان اللہ  
تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص ہم  
دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہر کی  
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار  
ایک کو ایک پہ تزمین ہے دم آرائش  
ایک گہری نہیں صد کان گہریں جھوٹا  
پھرتی خوشبو سے ہے اترا نی ہوئی باؤ  
سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں صلی  
رؤنائی میں تجھے دے منہ قورشید فلک



کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشا تیوں کے دمِ نظارہ ترے لئے نکو پر سہرا  
 و خوش آبِ مضامین کے بنا کر لایا واسطے ترے تراذوقِ شاگر سہرا  
 جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سادہ وانکو دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنِ سہرا

اربابِ نشاطِ حضور میں ملازمِ حق ہیں اسی وقت انہیں ملا۔ اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں  
 پھیل گیا۔ سیرِ رابطے اور شناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور یہ قطعہ لکھ کر حضور میں  
 گزارا۔ سب طرہ تعریفیں ہوئیں رازِ شمس العلماء مولانا آزاد مولفِ آبِ حیات و دیوانِ ذوقِ غیرہ  
 منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں سمجھے

تقدم

فرماتے ہیں۔ واقعی حال گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو اپنے حسنِ طبیعت کا بیان کرنا مستطو نہیں ہے  
 سولہشت سے ہے پیشہ آبِ سپہ گری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں سمجھے  
 فرماتے ہیں! اہلِ سیف کی عوت و توقیر اہلِ قلم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور میرا  
 موڑ ٹی پیشہ سپہ گری ہے اور یہی میرا باعثِ عزت ہے۔ کچھ شاعری کو میں اپنی عزت کا سبب نہیں سمجھتا  
 آزاد مرد ہوں اور مرا مسئلہ صلح کل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں سمجھے  
 فرماتے ہیں۔ میں آزاد و روش کا انسان ہوں اور میرا طریقہ صلح کل ہے۔ میں کبھی کسی  
 سے عداوت نہیں رکھتا۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں مانا کہ جاہ و منصبِ ثروت نہیں سمجھے  
 فرماتے ہیں۔ یہ شرف میرے لئے کیا کم ہے کہ میں ظفر کا غلام ہوں۔ پھر کیا دیوانہ ہوں  
 کہ شاعری کو عزت کا ذریعہ سمجھوں۔ اس بات کو میں مانتا ہوں کہ اور غلاموں کی طرح مجھ کو  
 ثروت و منصب و جاہ حاصل نہیں ہے۔ نہ ہو۔ مجھ کو کچھ اس کا افسوس بھی نہیں۔  
 استادِ شہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں سمجھے  
 اس شعر کا مطلب صاف ہے۔

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں سمجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے دعا جزا بظاہر حضرت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں مجھ کو ریختہ گوئی سے کیا واسطہ۔ اردو شعر کہاں ہیں کہاں مجھ کو اگر ہے تو  
 ذاتی زبان میں شعر کہنے کا شوق ہے۔ یہ تو صرف حضور کے خوش کرنے کو اردو میں غزل وغیرہ لکھ لیا  
 کرتا ہوں۔ چنانچہ

سہرا لکھا گیا زہرہ امثال امر دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے  
 حضور کے حکم سے سہرا میں لکھا ہے جیت دیکھ لیا کہ سو اطاعت کے معنی علم بیا لانے کے مجھے چارہ ہی نہیں ہے  
 مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں۔ اس سہرے کا مقطع جو میں نے یہ لکھا ہے ہم سخن فہم میں غالب کے طرز انہیں  
 دیکھیں اس سہرے کے بعد سے کوئی بڑھ کر سہرا

یہ ایک شاعرانہ بات ہے اس سے میرا مطلب نہیں ہے کہ میں دوستانہ مراسم قطع کر دوں  
 وئے سخن کسی کی طرف ہو تو رسیا سدا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں میں نے اگر کسی پر چوٹ کی ہو تو کالا سناہ ہو۔ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ مجھ کو جنوں  
 نہیں ہے۔ میں انسان ہوں۔ ذہنی عقل ہوں۔ وحشی جانور نہیں ہوں۔

قسمت بُری سہی طبیعت بُری نہیں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں میں بد قسمت ہوں۔ بد طبیعت نہیں ہوں۔ یہ شکر کی بات ہے کہ مجھ کو  
 کسی بات کی شکایت نہیں ہے۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب اگواہ کہتا ہو سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں۔ اسے غالب میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں صادق القول شخص ہوں۔  
 میں جو کچھ کہتا ہوں یعنی کہہ رہا ہوں وہ سچ کہہ رہا ہوں مجھ کو جھوٹ کی عادت نہیں ہے۔  
 نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے نصرت الملک بہادر مجھ کو جو تجھ سے اس قدر ارادت ہے میں حیران ہوں کہ

کیس مجھ سے ہے یعنی انعام و احسان کی وجہ سے جو ارادت ہوا کرتی ہے اس میں روحانی تعلق ظلم کی جھلکا نہیں ہوا کرتی محبت قلبی دوسری شے ہے اور بغیر احسان مندی کے قدرتی طور سے دل میں پیدا ہو جایا کرتی ہے عجیب طبع شکر لکھا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔  
 گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کمرے رونق بزم مہر تیری ذات کے ہے  
 فرماتے ہیں۔ اگرچہ تو وہ ہے کہ اگر دربار آراستہ کرے تو بزم مہر کو بھی تیری ذات سے رونق حاصل ہو جائے۔

اور میں وہ ہوں گری میں بھی خود کڑوں غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات کے ہے  
 فرماتے ہیں تیری خوبیوں کا سوا ذرا نہ جیب اپنی ذات سے کرتا ہوں تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ مجھ کا شکر آفرینش تیرے لطف و عنایت کا سزاوار نہیں ہے۔ غیر تو غیر مجھ کو خود اپنی اوقات سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

خستگی کا ہو بھلا جسے سبب سے درست نسبت اک گونہ مرے دل کو تیرے ہاتھ کے ہے  
 فرماتے ہیں۔ میری خستہ دلی کا بھلا ہو جس کے سبب سے درست تیری ذرہ نوازی کی بدولت مجھ کو بھی تجھ سے ایک شکر گزاری کا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت زدہ شخص ہوں اور تو مصیبت زدہ آدمیوں کی امداد کا فرما رہے۔

باتھ میں تھرے ہے تو سن دولت کی عنال یہ عا شام و بحر قاضی حاجات کے ہے  
 فرماتے ہیں۔ تیرے دست زبردست میں تو سن دولت کی باگ ہے صبح و شام قاضی الحاجات کی درگاہ میں یہ دعا کیا کرتا ہوں۔

تو سکندر ہے مرا خضر ہے بلنا تیرا گوشہ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات کے ہے  
 تو میرا سکندر ہے۔ مجھ کو تجھ سے مل کر خضر حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ حضرت خضر کی بھی ملاقات سے مجھ کو شرف حاصل ہوتا ہے۔ یہ اشارہ خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف ہے۔

اس پہ گزے نہ گمان یو دریا کا زہنار غالب خاک نشیں اہل خرابا کے ہے

فرماتے ہیں: بیکاری و بیکاری کے واسطے اہل صلاح و تقویٰ مخصوص ہیں۔ غارت گشتیں  
زندہاں خراباں سے ہے جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے فریب کر جانتے ہی نہیں۔

آٹھ ہے چہار شنبہ آخر ماہ صفر چلو رکنہ زینت جن میں بھر کے لئے مشکبو کی مانند  
فرماتے ہیں۔ آج آخری چہار شنبہ ہے۔ سبزہ روندنے کے لئے باہم مل کر احباب آتے ہیں۔  
ہم بھی جن میں نے مشکبو کی مانند بھر کر رکھ دیں۔

جہ آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست سبزے کو رفتا پھر چھو لو کو چائے پھاندر

جو شغل آئے ایک جام بھر کے پی لے اور ست ہو کے سبزے کو روندے اور بچوں پہ سے کود جائے

نالت کیا بیاں سے بجز مدح بادشاہ بھاتی نہیں اب مجھے کوئی نوشتہ خواند

وہ ہے اب سے غالب اس قلم کی تشبیہ میں تو نفیوں باتیں کیا لکھ رہا ہے تبشب کو

چھوڑ کر فدائے کی طہیت متوجہ ہو جا۔ مجھ کو بجز مدح بادشاہ کے اور کوئی بات پسند نہیں آتی۔

بیتے ہیں سونے رولے کے چیلے حضور میں سہجن کے آگے سیم زر مہر و ماہ مانند

فرماتے ہیں۔ آج کے دن بادشاہ کے دربار میں سونے چاندی کے چیلے محل کے دم کئے

ہوئے پانی میں بجا کر تقسیم کئے جاتے ہیں اور وہ چیلے ایسے آجے تاج کے ہوتے ہیں کہ جن کے سامنے

مہر و ماہ کا سیم و زر بھی چمکے کہ نہیں کھل سکتا۔ دھوپ کا سنہری رنگ مانا گیا ہے۔ اور چاندنی کا

سفید۔ جناح کسی شاعر کا مصرعہ ہے ع

چاندنی چاندی کا تیر دھوپ سونے کا ورق

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور شمار چاند

فرماتے ہیں۔ ان سونے چاندی کے چیلوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اگر بیچ سے خالی

نہ ہوتے تو گویا لاکھوں آفتاب اور بے شمار چاند تھے۔

اے شاہ جہانگیر جہان بخش جہاندار ہے غریب کے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

میرزا صاحب نے اس شعر میں بادشاہ کی تین صفتیں بیان کی ہیں۔ پہلی صفت جہانگیری دوسری

دوسری صفت



صفت چہان بخشی تیسری صفت جاندار سی۔ فرماتے ہیں۔ یہ صفیں تجھ کو اسی وجہ سے حاصل ہو گئی ہیں کہ تجھے ہر کام کے کرنے کے لئے 'غیب سے' بشارت ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تیرا ہر ارادہ پورا ہو جاتا ہے اور کسی کام میں کامی کا دخل نہیں ہوتا۔

جو عقدہ دشوار کہ کوشش سے نہ واہر تو وا کرے اس عقدے کو سوہ بھی اشارت فرماتے ہیں۔ تیرے ایک ادنیٰ سے اشارہ سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جو برسوں کی کوشش سے بھی حل نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے کہ بے خضر سکندر سے ترا ذکر گریب کو نہ دے چہنہ حیواں سے طہارت فرماتے ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ حضرت خضر سکندر سے تیرے عز و جاہ کا ذکر فرمائیں اور پہلے آپ حیواں سے نکلیاں نہ کر لیں۔

آصف کو سلیمان کی وزارت شرف تھا ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزارت فرماتے ہیں۔ آصف کو حضرت سلیمان کا وزیر بن کر شرف حاصل ہو گیا تھا۔ اگر حضرت سلیمان تیری وزارت کا کام انجام دیں تو ان کے لئے باعث فخر ہے۔

ہے نقش مریدی ترا فرمان الہی ہے داغ غلامی ترا تو قیام ارت فرماتے ہیں۔ تجھ سے ارادت رکھنی اور تیری فرمانبرداری حکم الہی کے موافق ہے اور جبکہ تیرا داغ غلامی نصیب ہو گیا۔ اسکو گویا میری کی سند حاصل ہو گئی۔

تو آگ سے گدھ کرے طاقت سیلاں تو آگ سے گدھ کرے تاب شرارت  
دھونڈے نہ ملے موجہ دریا میں انی باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حارت

لغت و نشر مرتب ہے یعنی اگر بانی سے اس کے پہنے کی طاقت کو سلب کر لے تو موجہ دریا میں روانی باقی نہ رہے۔ اور اگر تو آگ سے اس کی گرمی کو دفع کر دینا چاہے تو جلتی ہوئی آگ میں گرمی باقی نہ رہے۔

ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں بہارت ہے گرچہ مجھے سحرانی میں تو غل

کیونکہ نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر      تو صرہ کفایت میں تری میری عبارت  
فرماتے ہیں باد جو دیکھ میں بہت مشاق شاعر ہوں اور بہت بڑے مضمون کو تھوڑی  
عبارت اور کم لفظوں میں ادا کر سکے یہ قادر ہوں لیکن تیرے اوصاف بیان کرنے میں بھی  
قاصد ہو جاتا ہوں۔ اس لئے مجبور ہو کر مدح کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

نوروز ہے آج اور وہ دن کہ خوشیوں      نظارگی صنعت حق اہل بصارت  
فرماتے ہیں۔ آج جشن نوروز کا دربار ہے۔ اور تماشا کی چشم بصیرت سے اللہ تعالیٰ کی  
صنعت تخلیق کو دیکھ رہے ہیں مطلب ہے کہ تیرے چہرہ انور کی زیارت سے مشرف ہو گئے ہیں۔  
تجہ کو شرف مہر جہاں تاب مبارک      غالب کو تھے غتبہ عالی کی زیارت  
فرماتے ہیں تجہ کو شرف آفتاب مبارک ہو اور غالب کو تیری زیارت۔

قطعہ

انظار صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو      اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کر  
جس پاس روزہ کھولے کھانسی کو کچھ نہ ہو      روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے  
میرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینہ میں بادشاہ کے حضور میں پڑھا گیا تھا  
جب کوئٹہ کے بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے (ازبیک کا غائب)

قطعہ

یہ وہ قطعہ ہے جو میرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست کے گزرا تھا کہ ان کی  
تنخواہ جو شش ماہی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی۔ وہ ماہ بجاہ ملا کرے چنانچہ اس  
درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بجاہ ملنے لگی تھی (ازبیک کا غائب)

اے شہنشاہ آسماں اور تارک      اے جہاندار آفتاب آسمان  
تھامیں اک جینو اے گوشہ نشین      تھامیں اک درد مند سینہ فگار  
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی      ہوئی میری وہ گرمی بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرہ نا چھیند  
گرچہ از روئے تنگ بے مہری  
کہ اگر آپ کو کہوں خاک کی  
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں  
خانہ زاد اور مرید اور مداح

روشناس ثوابت و ستیاء  
ہوں خود اپنی نظریں اتنا تو اوار  
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار  
بادشاہ کا غلام کار گز ار  
کھتا ہمیشہ سے یہ عرفیہ نگار

بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی میزرا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدتیہ  
تصید سے برابر بادشاہ کے ہاں گذرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر  
نہ کہوں آپ سے تو کس کہوں  
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں  
کچھ تو جاڑے میں جا ہے آخر  
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش  
کچھ خرید نہیں ہے اب کے سال  
رات کو آگ اور دن کو دھوپ  
آگ تاپے کہاں تلک انسان  
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی  
میری تنخواہ جو مقدر ہے  
رسم ہے مردہ کی چھہ ہی ایک  
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقدر حیات  
سبکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض  
میری تنخواہ میں تہائی کا

تسببتیں ہو گئیں شخص چار  
مدعائے ضروری الاطہار  
ذوق آرائش سرود تار  
تانا دے باد زمیر یہ آزار  
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار  
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار  
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل مہنار  
دھوپ کھائے کہاں تلک جاننا  
وقتاً رہنا عذاب التار  
اس کے لئے کا ہے عجب ہنغار  
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار  
اور چھ ماہی سال میں دو بار  
اور رہتی ہے سود کی تکرار  
ہو گیا ہے شریک سا ہو کار

آج مجھ سے نہیں رہنے میں  
رزم کی داستان گرسٹے  
رزم کا التزام گر کیجئے  
ظلم ہے گر نہ دوسمن کی دو  
آپ کا بندہ اور بھروسہ نہ کا  
میری خواہ کیجئے ماہ بہ ماہ  
ختم کرتا ہوں اب دعا یہ کلام  
شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے چونکہ یہ قطع میرزا نے اپنی خاص طرز  
کے خلاف بہت سیدھا سا دکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی  
طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے (از یادگار غالب)

تم سلامت رہو ہزار برس  
یہ کلیم ہوں لازم ہے میرا نام لے  
ہو انہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ کیجئے  
شریک غالب اس شریک کو کہتے ہیں جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو شر

قطعہ

غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے (از یادگار غالب)

سہل تھا سہل دے یہ سخت شکل آفری  
تین دن سہل سے پہلے تین دن سہل کب  
اک شعر میں سہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں  
کس عمدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر پر لکھا ہے (از یادگار غالب)

قطعہ

نہ کیوں جاؤ سال عیسوی مخطوط  
ہوئی ہے ایسے ہی ترخہ سال میں غالب

نقطہ تاریخ



ٹوٹے کے سنی بیاہ کے ہیں۔ شاہزادہ میرزا جعفر کی تاریخ لکھی ہے۔ مادہ محفوظ  
 ہے ۱۸۵۴ء نکلتا ہے۔

ایضاً

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی  
 کہا غالباً تاریخ اسکی کیا ہے  
 ہوا بزم طرب میں قصص نامید  
 تو بونا انشراح جشن جمشید

۱۲۴۰ھ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں  
 کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کہے ہو سلام  
 دربار دار لوگ ہم آشنا نہیں  
 اس کے ہے میراد کہ ہم آشنا نہیں  
 بادشاہ کے دربار کا یہ آداب تھا۔ کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے  
 تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اردو محاورے میں کانوں  
 پہ ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں! اسلئے میرزا نے اسکو اس پر ایسی بیان کیا ہے (ریاض)

## رُاعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال  
 آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم  
 ایام جوانی ہے سائے کش حال  
 اسے عمر گزشتہ یک قدم استقبال  
 اس رباعی میں میرزا صاحب نے عمر گزشتہ کو واپس پلٹ آنے کی ہدایت فرمائی ہے۔  
 مطلب یہ ہے کہ اسے عمر گزشتہ تو جہاں ہے۔ اسی اقلیم کے قرب و جوار میں ہم بھی آپہنچے ہیں  
 ہمارے استقبال کے لئے ایک قدم تو بھی واپس چلی آ۔ شاید تیرے واپس آنے سے دو  
 چار دن کے لئے شباب رفتہ بھی واپس آجائے۔

شبِ لعل رخِ خورشیدِ شاہ کا غم تھا  
 رو یا میں ہزار آنکھ سے صبحِ تلک  
 کیا شرحِ کدوں کہ طرہ تر عالم تھا  
 ہر قطرہ اشک دیدہ پڑ غم تھا

رباعی

فرماتے ہیں۔ رات کے وقت بچھکو اس کی زلفیں اور رخ عرق مکش یا دوا کہ کچھ ایسی پریشانی پیدا ہو گئی تھی کہ بلا اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور چونکہ زلف اور رخ کا تصور تھا اس لئے آنسو آنکھ کی پہاڑی اور سفیدی پیدا کر لی تھی۔ گو یا پہاڑوں پر ایک ٹکڑے بنگیا تھا اس لئے ہزاروں آنکھوں سے روتا رہا۔

آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال      ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال  
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی      لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال  
فرماتے ہیں۔ آتش بازی جس طرح بچوں کا کھیل ہے، اسی طرح معشوقان ستمگاہ سوز جگر عاشق کو دلچسپی کا باعث سمجھتے ہیں۔ موجد عشق بھی کوئی قیامت کا پتلا تھا جو ان معشوقوں کے لئے یہ کھیل ایجاد کر گیا ہے۔

دل تھا کہ جو جان اور دہیدہ ہی      بیتابی رشک و حسرت دیدہ ہی  
ہم اور فسردن اے تجلی آنسو      تکرار و فغانہیں تو تجدید ہی  
فرماتے ہیں۔ کچھ روز پہلے ہمارے پیلوں میں دل تھا۔ ہم دل رکھتے تھے۔ جو زندہ گوئی پر درد کی سختیاں برداشت کر لیتے تھے۔ بیتابی رشک کو جھیلدا اور دیدار کی حسرت سہلی۔ آنسو کی بات یہ ہے کہ اب ہم ہیں اور افسردگی اور بے دلی۔ اے تجلی طور اگر تیری تکرار ناممکن اور محال ہے تو تجدید ہی سہی کہ مجھ سے آنسو دل کو پھر اسی سوز و گداز کی ہوس ہے۔ گو تکرار ہر شے کی محال ہے یعنی معدوم کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔ مگر سوز و گداز کا آنسو تو پیدا ہو جاتا تو ناممکن سے کیا ہے خلق حسد تلاش لڑنے کے لئے      وحشت کدہ تلاش لڑنے کے لئے  
یعنی ہر بار صورت کا قہر باد      ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لئے

فرماتے ہیں۔ یہ مخلوق جس نے اپنا شعار حسد و بغض کر لیا ہے۔ رات دن لڑتے رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور وحشت کدہ تلاش یعنی تلاش معاش لڑنے کے واسطے ہے۔ تنکوں اور گڈیوں کی طرح یہ بد معاش باہم ملتے ہیں۔ ملنے سے ان کی مراد لڑائی ہوتی ہے جس طرح تنکے اور گڈی آپس میں مل کر لڑتی ہے۔

دل سخت نہ ہو گیا ہے گویا      اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا  
 پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں      غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا  
 فراتے ہیں۔ دل نہایت نعلین ہو گیا گویا۔ اور اس سے گلہ مند ہو گیا ہے۔ گویا باد جو د  
 ابن دونوں باتوں کے یار کے سامنے طاقت گویا فی باقی نہیں رہتی۔ گویا غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے  
 ڈکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ      دل رُک کے بند ہو گیا ہے غالبؔ  
 والدہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں      سونا سو گند ہو گیا ہے غالبؔ  
 اکثر دیوانوں میں اس رباعی کا مصرعہ ثانی رُک رُک کر لکھ دیا گیا ہے۔ اور اس صحت  
 میں دو حرف وزن سے بڑھ جاتے ہیں۔ باقی رباعی کے معنی صاف ہیں۔

شکل ہے زبس کلام میرا بیدل      سُن سُن کے اسے مخمورانِ کامل  
 آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش      گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل  
 اس اخیر کے مصرعہ میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ان کی فرمایش پوری  
 کروں اور آساں شعر کہوں تو یہ مشکل ہے۔ کہ اپنی طبیعت کے اقتضار کے خلاف ہے اور  
 آساں نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب  
 میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو مخمورانِ کامل کی نا فہمی و کند ذہنی اظہار کرنی پڑتی  
 ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں پس ہر طرح مشکل ہے (زیادہ کا غالبؔ)  
 بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ حجاز دال      ہے لطف عنایات شہنشاہِ دال  
 یہ شاہ پسند دال بے بحث جدال      ہے دولتِ دین و دانش و داد کی دال  
 بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ باقی  
 اس کے شکر یہ میں لکھی گئی ہے۔

ہیں شہ میں صفاتِ دو الجہالی باہم      آثارِ جہالی و جمالی باہم  
 ہوں شاہ نہ کیوں سا فلُ عالی باہم      ہے اب کے شبِ قدِ دیوالی باہم



فرماتے ہیں۔ دیوانی کی بہت پرستی مرتبہ سافل ہے امد شہود قدر کی عبادت درجہ عالی  
حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے      شاہ شیوع دانش و داد کرے  
یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ      ہے صفر کہ افزائش اعدا کرے

### رباعی

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا      اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا  
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں      ایسی گزریں ہزار ہوں بلکہ سوا  
یہ دونوں رباعیاں بادشاہ کی سالگرہ کی مبارکبادیں لکھی گئی تھیں۔ دونوں ہمیشہ  
طریقہ سے۔ دونوں رباعیوں میں ترقی عمر کی دعائیں دی گئی ہیں۔

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں      عشاق کی پریشانی سے اسے عاز نہیں  
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا      کیونکر مانوں کہ اس میں تلوانہ نہیں  
کسی کام سے ہاتھ اٹھانا۔ گویا اس کام سے دست بردار ہونا اور دوسرے معنی  
ہاتھ اٹھانے کے ہیں کہ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھانا۔

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے      کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے  
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ      وہ آپ میں صبح و شام کرنیوالے  
اس رباعی میں میرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے۔ جو بالکل اچھوتی اندنی طرح  
کی ہے۔ کہتا ہے۔ کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو ٹھیک ٹھیک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر  
وہ ہماری کارروائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ  
خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے  
والے ہیں۔ صبح و شام کرنالیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو  
صبح کرنا خدا کا کام ہے۔ تو خدا کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ مگر  
شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کارروائی خلق میں جیسی لیت و لعل دیاں ہوتی ہے۔ ایسی



کہیں نہیں ہوتی۔ کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے۔ اور مطلب حاصل نہیں ہوتا  
(از یادگار غالب)

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں      آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں  
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن      خن خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں  
یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزہ کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی  
ان سیم کے بچوں کو کوئی کیا جلنے      بھیجے ہیں جوار مغاں شہِ الائنے  
گن کر دیو شنگے ہم دعائیں سو بار      فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے  
بادشاہ نے سیم کے بچوں کو سالن بھیجا ہے اسکے شکر یہ ہیں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا  
فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے (از یادگار غالب)  
رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے      شاقب حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے  
حاجی کلکو کو دیکھے بیوجہ جواب      غالب کا لپکا دیا کلیجہ تم نے

ایضاً

اے روشنی دیدہ شہاب الدیناں      کٹا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضان  
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کیسے بیک      سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن  
میرزا صاحب نے یہ دونوں رباعیاں شہاب الدین احمد خاں المتخلص بہ شاقب خلعت  
نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر المتخلص بہ نیر درخشاں کو لکھ کر بھیجی تھیں حضرت شاقب  
میرزا صاحب کے بہت عزیز شاگرد تھے اور فارسی بھی میرزا صاحب سے پڑھی تھی علاوہ  
شاگردی کے قرابت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے کہ عہد جوانی میں انتقال فرما گئے۔

تمام شد



PDF By :  
Ghulam Mustafa Daa'im Awan